رسائل عماد الملک

یعنی

مجموعۂ مضامین و خطبات

فخر قوم عالیجناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی (مدظلہ العالی)

سی ۔ ایس ۔ آئی

مطبوعہ عماد پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن

۱۹۲۱ع

تعداد اشاعت ۵۰۰

قیمت فی مجلد معہ محصول

فہرست

دیباچہ

نواب عماد الملک بہادر نے اپنی ذاتی کوشش سے جو
اعلیٰ شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ تک میں پیدا
کی ہے اُس سے بچہ بچہ واقف ہے خصوصاً علمی دنیا میں
جہاں ان کا نام سند کا کام دیتا ہے۔

باوجود اس قدرتی شہرت اور نام آوری کے خود نواب
عماد الملک بہادر نے کبھی نام و نمود کی خواہش نہیں کی۔
یہی وجہ ہے کہ اس سراپا صداقت ذات نے شہرت و
نام آوری کے اسباب سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا۔

رسائل عماد الملک کی ترتیب و اشاعت بہ ظاہر اِس کے
خلاف نظر آتی ہے۔ نواب عماد الملک بہادر بطور خود اِس کو

بھی گوارا نہ کرتے اگر ان کے با اثر حلقۂ احباب کی کافی تعداد
ان کو مجبور نہ کر دیتی۔
ہم کو عماد الملک بہادر کی اس "اخوان الصفا" کا مشکور ہونا چاہیے
جو ان علمی جواہر ریزوں کی تدوین و اشاعت کا باعث ہوئی۔
$\frac{3}{4}$ سے زائد حصہ رسائل کا آج سے دو سال قبل اُس زمانہ
میں طبع ہوا تھا جب طباعت پر ہر قسم کی دشواریوں کا ہجوم تھا
آج باقی حصۂ کتاب کی طبع اور اشاعت کا مہتمم اُن سابقہ
خامیوں کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا جن کی اصلاح اُس کے اختیار سے
باہر تھی۔
طبع دوم میں حتی الامکان پوری کوشش کی جائے گی کہ کتاب
ہر طریقہ سے مکمل اور بہتر ہو۔

۲ مئی ۱۹۲۱ء

الیاس برنی وکیل ہائیکورٹ
فضل گنج حیدرآباد دکن

تذکرۂ مصنف

از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایڈیٹر مصنف فلسفۂ اجتماع وغیرہ

"نواب عماد الملک کو ان کی نیکی و راستبازی اور علم و فضل اور مدرسۃ العلوم کی حقیقی خیراندیشی کی وجہ سے وہ (یعنی سرسید) ایسا ہی عزیز رکھتے تھے، جیسے سید محمود کو۔ اور ان کی نسبت کہا کرتے تھے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک نورِ مجسم ہے۔" (حیاتِ جاوید۔ مولانا حالی)

ہندوستان میں اودھ کا خطہ ابتدا سے مردم خیز چلا آتا ہے۔ بلگرام اس عموم میں ایک مرتبۂ خصوص رکھتا ہے۔ علم و ادب، فضل و کمال اِس قصبہ کی گویا میراث رہے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کا نصف آخر ہندوستان کے دورِ جدید کا سرآغاز ہوا ہے، ہندوستان میں اس وقت علمی و معاشری، سیاسی و مذہبی حیثیت سے ایک بالکل نئی روح داخل ہو رہی تھی۔ ناممکن تھا، کہ اودھ کا یہ قرطبہ اِس تحریک کی بار آوری میں کوئی حصّہ نہ لے۔ اِس میں شُبہ نہیں کہ بلگرام اس وقت انحطاط پر تھا، تاہم جو سرزمین صدیوں سے فضل و کمال کے لئے بطنِ مادر کا کام دیتی آئی ہو، وہ دفعتاً عقیم نہیں ہوسکتی تھی۔ مانا، کہ آگ کے شعلے اب سرد ہوچکے تھے لیکن خاکستر کے شرارے تو اتنی جلد فنا نہیں ہوسکتے تھے جو چمن موسمِ گل میں علامہ عبد الجلیل، علامہ آزاد، و علامہ سید مرتضیٰ کی

بہار دکھلاچکا تھا، کیا وہ ایام خزاں میں سید حسین عماد الملک کو وجود میں نہیں لاسکتا تھا؟

ساتویں صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ ہے، دہلی کے تخت پر سلطان التمش جلوس افروز ہے، اسلامی فتوحات کا سیلاب ہندوستان میں بڑھتا چلا جارہا ہے۔ سلطان کے رفقاء میں ایک صاحب باطن بزرگ، صاحب دعوۃ الصغری ہیں جن کا لقب عام زبانوں پر بکثرت استعمال سے صرف سید محمد صغری رہ گیا ہے۔ بلگرام و اطراف بلگرام اس وقت ایک مغرور ہندو راجہ کی حکومت ہے۔ سید محمد صغری سے اس سے جنگ ہوتی ہے، اور فتح سید موصوف کے حصہ میں آتی ہے لفظ "خداداد" سے اس واقعہ کی تاریخ نکلتی ہے، جو ۶۱۴ھ مطابق ۱۲۱۷ء ہے۔ اسی تاریخ سے بلگرام میں سادات حسینی کا خاندان آباد ہوتا ہے[1]۔

اس خاندان کے پہلے شخص جنھیں انگریزی حکومت نے مناصب ملکی پر مامور کیا، مولوی سید کرم حسین تھے۔ اس کے بعد، جس زمانہ میں سرکار نظام نے میر عالم کو اپنا سفیر بناکر کلکتہ بھیجا، یہ بھی سرکار اودھ کی طرف سے سفارت کی خدمت پر مامور ہوکر کلکتہ گورنر جنرل کے دربار میں پہنچے، اور یہیں اُن کی عمر کا بیشتر حصہ صرف ہوا۔

[1] مآثر الکرام ص ۱۳۵

اِن کی اولاد بھی یہیں ہوئی، اور یہیں سب لڑکوں نے وارن ہسٹینگز کے قائم کردہ مدرسہ عالیہ میں علوم مشرقی کی تحصیل کی، بعد فراغت یہ لوگ انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے۔ انگریزی کی تعلیم و تحصیل اس وقت حرام سمجھی جاتی تھی۔ اس بُت کو توڑنے والے یہی لوگ تھے۔

مولوی سید کرم حسین کے ایک فرزند کا نام سید زین الدین حسین تھا یہ وہی خوش نصیب بزرگ ہیں، جو آگے چلکر عماد الملک سید حسین کے والدِ ماجد ہوئے۔ تقریباً ۱۸۴۰ء میں یہ ڈپٹی کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے، اور ۳۵ سال تک بنگال و بہار کے مختلف اضلاع میں یہ خدمت بہ حُسنِ اسلوب انجام دیکر ۱۸۷۵ء میں پنشن لی۔

عماد الملک بہادر کے والد کے ساتھ اُن کے ایک چچا کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے، آنریبل سید اعظم الدین حسین، سی، اس، آئی کا ابتدائی تقرر بہ حیثیت لارڈ بنٹینک کے اڈیکانگ و ترجمان کے ہوا، بعد ازاں وہ امیر سندھ کے دربار میں بہ حیثیت پولٹیکل ایجنٹ کے گئے، اور ساتھ ہی دریائے اٹک کی جہاز رانی کے افسر اعلیٰ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے آخر میں وہ صوبہ بہار میں ڈپٹی کلکٹر و ناظم بندوبست مقرر ہوئے۔ اور آخر عمر تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ جس زمانہ میں وہ ضلع چوبیس پرگنہ میں حاکم تھے، دو مرتبہ بنگال کی قانونی کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔

غدر ۵۷ء میں جو مشاہیر، آرہ میں محصور ہو گئے تھے، اُن میں ایک یہ بھی تھے، باغیوں نے ان کا مال و متاع مع کتب خانہ کے غارت کر دیا۔ یہ منجملہ اُن معدودے چند ہندوستانیوں کے تھے، جنھیں اول اول، سی، اس، آئی کا خطاب ملا۔ اِسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حکومتِ انگریزی کی نظر میں اِن کا کیا اعزاز و مرتبہ تھا۔

مولوی سید حسین کی پیدائش اکتوبر ۱۸۴۲ء میں، بمقام صاحب گنج، ضلع گیا (صوبۂ بہار) ہوئی۔ مگر چند ہی روز کے بعد اِن کے والدِ مرحوم کا تبادلہ صوبۂ بہار سے بنگال میں ہو گیا، اور یہاں ان کا تقرر مانک گنج میں ہوا جو اس وقت فرید پور کے ضلع میں تھا، اور اب ڈھاکہ سے متعلق ہے۔ یہاں اِن کی عمر ابھی چار پانچ سال سے زائد نہ ہوئی تھی، کہ موت کی دستبرد نے والدہ کے آغوشِ محبت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔

سات سال کی عمر میں تعلیم شروع ہوئی۔ ایک معلم مع اہل و عیال کلکتہ سے اِس خدمت کے لئے بلائے گئے۔ انھوں نے پارۂ عم اور چند باب اخلاق محسنی کے پڑھائے تھے، کہ وفات پا گئے۔ اِس کے بعد ایک دوسرے معلم ڈھاکہ سے بلائے گئے۔ اور اب تعلیم صرف عربی کی ہوئی، نہ فارسی نہ اردو نہ انگریزی نہ بنگالی۔ بلکہ محض عربی مطابق درس نظامیہ صرف و نحو میں میزان و منشعب سے لیکر شرحِ ملّا مع حاشیۂ عبدالرحمن تک،

اور منطق میں صغریٰ وکبریٰ سے لیکر شرح تہذیب وقطبی تک، اِس کے بعد میبذی ومختصر المعانی۔

اِسی عرصہ میں مولوی سید زین الدین حسین مرحوم کا تبادلہ مدھ پورہ ضلع بھاگل پور کو ۱۸۵۵ء میں ہو چکا تھا، اور اُستاد بھی ایک دوسرے مولوی صاحب مقرر ہو چکے تھے، جو یہ آخری کتابیں پڑھا کر اپنے وطن ڈھاکہ کو چلے گئے۔

اب مولوی سید حسین کا سِن قریب ۱۴ سال کے تھا۔ اِس وقت انگریزی شروع کرائی گئی۔ چند روز بھاگل پور کے اسکول میں، جو مدھ پورہ سے قریب تیس کوس کے فاصلہ پر واقع تھا، تعلیم ہوئی اور پھر کچھ روز پٹنہ کے اسکول میں جہاں مولوی سید اعظم الدین حسین، ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ۱۸۵۹ء میں کلکتہ روانہ ہوئے، یہاں چند ماہ ایک یوروپین اسکول میں تعلیم پانے کے بعد کولوٹولہ برانچ اسکول میں داخل ہوئے اور ٹھیک ڈھائی سال میں انٹرنس کے امتحان میں بدرجۂ اول کامیاب ہوئے اور ؏ ماہانہ کا وظیفہ حاصل کیا۔ یہ واقعہ ۱۸۶۲ء کا ہے۔

اگلے سال پریسیڈینسی کالج سے ایف۔ اے میں بھی بدرجۂ اول کامیاب ہو کر ؏ ماہانہ کا وظیفہ حاصل کیا۔ ۶۴ء میں جب تھرڈ ایر کلاس میں تعلیم پا رہے تھے، جناب والد اپنے ہمراہ بلگرام لے گئے، اور وہاں

سید محمد ذکی صاحب کی صاحبزادی کے ساتھ اِن کی شادی کر دی۔
اِس سال تعلیم جاری نہ رہ سکی ۱۸۹۵ء سے پھر پڑھنا شروع کیا، اور آئندہ
سال بی۔ اے کی سند درجۂ اول میں حاصل کی۔

باپ میں شاید یہ خواہش فطری ہوتی ہے، کہ بیٹا اُسی کے نقشِ قدم پر چلے
اِس بنا پر مولوی سید زین الدین حسین مرحوم کی یہ خواہش بالکل حق بجانب
تھی کہ ہونہار فرزند ان کے تتبع میں سرکاری ملازمت میں داخل ہو، اور
اِسی صیغہ میں ناموری حاصل کرے۔ لیکن جن دماغوں کو علم و ادب کا
چسکا پڑ جاتا ہے، وہ دنیوی جاہ و اقتدار کی طرف سے بے نیاز ہو جاتے
ہیں۔ چنانچہ مولوی سید حسین بی۔ اے۔ نے عدالت کی کرسی پر درس
و تدریس کو ترجیح دی، اور ادبیاتِ عربی کے شوق تکمیل میں کیننگ کالج
لکھنؤ میں عربی کی پروفیسری قبول کر لی۔ یہ خدمت انھوں نے چھ برس
تک انجام دی، اور اِس عرصہ میں اُنہیں لکھنؤ کے اکابر علماء، مفتی
میر عباس، و مولانا حامد حسین مرحوم سے شرفِ تلمذ، اور میر انیس کا
فیضِ صحبت حاصل رہا، گو ایک زمانۂ قلیل تک۔

اسی زمانہ میں تعلقداران اودھ نے انگریزی اخبار لکھنؤ ٹائمس
جاری کیا، جو اسی پروفیسر کے حوالہ کیا گیا۔ اور اُس کا مقابلہ پائنیر جیسے
ذی اثر پرچہ سے ہوا۔ لیکن سید موصوف کے زورِ تحریر و فنِ انشاء کا

اعتراف مخالفین تک کو کرنا پڑا۔ اور لطف یہ کہ فرائض ادارت میں کوئی
شخص ان کا شریک و مددگار نہ تھا، سارا کام وہ تنہا خود ہی کرتے تھے
سنہ ۷۲ء میں سر سالار جنگ اعظم لکھنؤ آئے۔ جنرل بیرو نے اس
جوان سال پروفیسر کا تعارف اُن سے کرایا۔ گوہر شناس نے فوراً
گوہر کو پرکھ لیا۔ جو آنکھ جوہر قابل کی ہر سمت ہمیشہ متلاشی رہتی تھی
جو نگاہِ انتخاب آگے چلکر چراغ علی و نذیر احمد، محسن الملک و وقار الملک
پر پڑنے والی تھی، ناممکن تھا، کہ وہ اس جوہر کو ہاتھ سے جانے دے
نتیجہ یہ ہوا، کہ جون سنہ ۷۳ء میں یہ سید بلگرامی سالار جنگ اعظم کے
پرایوٹ سکرٹری (معتمد خاص) کی حیثیت سے حیدرآباد آگیا۔

امتداد زمانہ عموماً تعلقات کی شگفتگی قائم نہیں رہنے دیتا، لیکن
سالار جنگ و سید حسین کے تعلقات، زمانہ کی نیرنگیوں اور حیدرآباد
کے انقلابات سے بالکل غیر متاثر رہے۔ اب وہ وقت ہے کہ مولوی
سید حسین کو حیدرآباد آئے ہوئے ایک عمر گذر چکی ہے، زمین اپنے
عرصہ میں آفتاب کے گرد چالیس بر سات چکر لگا چکی ہے، سالار جنگ اعظم
مدت ہوئی اس دنیا سے رحلت کر چکے ہیں، مولوی سید حسین سرکاری
خدمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں، اس مدتِ دراز کے بعد جب وہ
اپنے قدیم محسن کا ذکر کرتے ہیں، تو زبان سے الفاظ نہیں نکلتے، بلکہ خلوص

ومحبت کے پھول جھڑتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

"آج چالیس سال ہوئے، کہ میرے محبوب آقا سر سالار جنگ نے مجھے طلب کیا تھا۔ اُن کی دلاویز شخصیت، اُن کی مردم شناسی، اُن کی معاملہ فہمی، یہ تمام اوصاف ایسے تھے کہ ناممکن تھا کوئی شخص اُن سے سابقہ رکھے، اور اُن کا گرویدہ نہ ہو جائے۔ ہر قوم و ہر ملت کے اشخاص اُن کے یکساں جاں نثار تھے"

سنہ ۷۶ء میں جب سالار جنگ نے یورپ کا سفر کیا تو یہ جوان معتمد بھی ہمرکاب تھا۔ حیدرآباد واپس آنے پر معتمدی خانگی کے علاوہ انہیں معتمدی اُمور متفرقہ کی خدمت بھی تفویض ہوئی، جس کا ایک شعبہ تعلیمات تھا۔ سنہ ۸۲ء میں جب اعلیحضرت غفراں مکاں کی مسند نشینی ہوئی تو مولوی سید حسین، علی یار خاں بہادر مؤتمن جنگ کے خطاب سے سرفراز ہو کر اُن کے پرائیوٹ سکرٹری مقرر ہوئے۔ یہاں انھوں نے اپنے فرائض کو اِس خوبی کے ساتھ انجام دیا، کہ چند سال کے عرصہ میں پہلے عماد الدولہ، اور پھر عماد الملک کا خطاب عطا ہوا۔ اب مولوی سید حسین خالی سید حسین نہ تھے۔ بلکہ نواب علی یار خاں بہادر مؤتمن جنگ عماد الدولہ، عماد الملک تھے۔

حیدرآباد کی وسعت، ثروت واہمیت پر نظر کرتے ہوئے اسے

ریاست نہیں سلطنت کہنا چاہئے۔ اِس لحاظ سے یہ کس قدر تاسف انگیز واقعہ تھا کہ اِس کی تعلیمی سطح ابتدائے نہایت پست چلی آتی تھی، اور تعلیمی رفتار حد سے زیادہ سُست تھی۔

۱۸۸۷ء سے میں عماد الملک بہادر نے اپنے تمام دنیوی جاہ واقتدار قطع نظر کر کے، مملکتِ آصفیہ کے صیغۂ تعلیمات کو اپنے تعلیمی تجربات و معلومات کے سایہ میں لیا۔ اصلاح ہر صیغہ میں دشوار ہوتی ہے، اور تعلیمی اصلاح تو دشوار تر ہوتی ہے، لیکن عماد الملک بہادر نے باوجود صدہا مشکلات و گوناگوں موانع کے اپنے مساعی میں جس قدر کامیابی حاصل کی اِس کا جواب الفاظ کے بجائے شمار و اعداد کی زبان سے سننا چاہئے۔

سنین	تعداد مدارس	تعداد طلبہ
۸۷-۱۸۸۶	۲۵۴	۲۰۶۶۴
۹۲-۱۸۹۱	۵۸۰	۴۰۹۷۵
۹۷-۱۸۹۶	۸۱۲	۵۵۲۴۲
۷-۱۹۰۱	۸۴۷	۵۷۹۷۲

گویا طلبہ کی تعداد اُن کے عہد میں تگنی ہوگئی اور مدارس کی تعداد میں اس سے بھی زائد اضافہ ہوگیا۔ لیکن خود عماد الملک بہادر کبھی اس نتیجہ پر

فخر نہیں کرتے، بلکہ ازراہِ کسرِ نفسی اعتراف کرتے ہیں کہ

"میرے زمانہ میں تعلیم میں ترقی بہت کم ہوئی، اور جتنی کامیابی ہونی چاہیے تھی، میرے کئے نہ ہوسکی۔ حیدرآباد کا ماحول اس طرح کا ہے کہ دوسرے ممالک کے مقابلہ میں یہاں دماغی ترقی نہیں ہوسکتی۔ یہی سبب ہے، کہ مملکت انگریزی کے مقابلہ میں یہاں کی رفتار سست رہی، اور حیدرآباد زمانہ کی رفتار کا ساتھ نہ دیسکا"۔

ان کے اس اعتراف کا، ٹائمز (لندن) کی اس رائے سے موازنہ کرو:۔
"ان کی بعض رپورٹوں سے یہ حقیقت بالکل منکشف ہو جاتی ہے، کہ جو دقیق مسائل اِن کے سامنے آئے، اُنہیں انھوں نے نہایت دانشمندی سے حل کیا۔ اِن رپورٹوں سے یہی نہیں، کہ اِن کے مصنف کی وسعتِ نظر ظاہر ہوتی ہے، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کا حقیقی دوست ہے، علم کو مقصود بالذات سمجھکر اس سے ایک شیفتگی رکھتا ہے، اور اُس کی عالمانہ شان کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتی"۔

بہ حیثیت ماہرِ فن کے، وہ مسئلہ تعلیم سے متعلق حسبِ ذیل خیالات رکھتے ہیں:۔

(۱) تعلیم ایک ذریعہ ہونا چاہئے تہذیبِ نفس و تزکیہ اخلاق کا۔ تربیت تعلیم کا لازمی تتمہ ہے۔ بغیر تربیت کے تعلیم غیر مفید ہی نہیں

بلکہ مضر ہوتی ہے۔ مغرب میں تعلیم و تربیت دونوں دوش بدوش چلتے ہیں۔ مشرق میں مغربی تعلیم کو تربیت سے الگ کرکے رائج کرنیکے نتائج لازمی طور پر مضر ہوں گے۔

(۲) رٹ رٹا کر امتحان پاس کرنے کا طریقہ ہر حیثیت سے مذموم و مضر ہے اس کے بجائے کنڈر گارٹن کے اصول پر اسکولوں کو رواج دینا چاہیئے۔

(۳) تعلیم کا اصل الاصول شفقت و تربیت ہونا چاہیئے۔

(۴) بچوں کی اتالیقی کے لئے تعلیم یافتہ استانیاں بہت موزوں ہوتی ہیں (چنانچہ آج حیدرآباد میں بچوں کی اتالیقی کے لئے جو بکثرت استانیاں نظر آتی ہیں وہ اسی بزرگ قوم کی سعی کا اثر ہے)۔

نظامت تعلیمات قلمرو آصفیہ کی باگ ۲۰ - ۲۱ سال تک برابر عماد الملک بہادر کے ہاتھ میں رہی، تا آنکہ ۱۹۰۱ء میں آپ وظیفہ یاب ہوگئے۔ رکن سلطنت کی حیثیت سے آپ کے جو مشاغل یہاں تھے، اُن کے لحاظ سے یہ کسی کو توقع نہیں ہوسکتی تھی، کہ آپ ہندوستان کی قومی و ملی تحریکات میں کچھ حصہ لے سکیں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ آپ اِس قسم کی تحریکات میں برابر شریک ہوتے رہے۔ اور نہ صرف شریک ہوتے رہے، بلکہ اہم و نمایاں حِصّہ لیتے رہے۔ سرسید آپ کو

اپنا خاص مؤید خیال کرتے تھے، علی گڈھ کالج کے آپ بہت پرانے ٹرسٹی ہیں، اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کی مرکزی کمیٹی کے آپ بہت قدیم رکن ہیں۔ علی گڈھ کالج، محمڈن ایجوکیشنل کانفرس، دارالمصنفین (اعظم گڈھ) و انجمن ترقی اردو پر آپ کے خاص احسانات ہیں، اور ان کو اس وقت دولت آصفیہ سے جو شاہانہ امدادیں حاصل ہو رہی ہیں، ان سب کی تہ میں آپ ہی کا ہاتھ کام کرتا نظر آئے گا۔

دارالمصنفین (اعظم گڈھ) و انجمن ترقی اردو، دونوں خالص علمی انجمنیں ہیں، جو اردو میں علوم و ادب کے بہترین سرمایہ کا اضافہ کر رہی ہیں۔ عماد الملک بہادر ان دونوں کے سرپرست ہیں۔

نواب صاحب کے بست سالہ عہد نظامت میں گو تعلیمات و متعلقات تعلیم میں بیسیوں اصلاحات ہوئیں، جن سب کا ذکر اس مختصر تذکرہ میں آنا ناممکن ہے، تاہم مندرجہ ذیل چیزیں، جو اپنے وجود کے لئے انہیں کی ممنون احسان ہیں، خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

(۱) مدرسۂ اعزہ۔ جس میں ارکان خاندان شاہی اور دیگر شرفاء کی اولاد کی تعلیم ہوتی ہے ۱۸۸۰ء میں قائم ہوا۔ مولوی شیخ احمد صاحب رفعت یار جنگ مرحوم، اور محی الدولہ رسول یار خاں مرحوم آپ کے شریک رہے۔ مرشد زادوں کو کافی تعداد میں گورنمنٹ نظام سے

وظائف دئے گئے۔ اُن کی سواری کیلئے رتھیں مقرر کی گئیں، یہ رتھیں اب تک دیکھنے میں آتی ہیں۔ مرشدزادے انھیں میں سوار ہو کر مدرسہ اعزہ آتے ہیں۔

(۲) مدرسۂ زنانہ اس میں علاوہ مذہبی تعلیم کے، اُردو، فارسی انگریزی، حساب، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے۔

(۳) مطبع دائرۃ المعارف۔ اس کا مقصد عربی کی قدیم و نادر کتابوں کی طبع و اشاعت، اور اسلامی دولتِ علمیہ کا تحفظ ہے۔ اس کے کارناموں کی علماءِ مصر و قسطنطنیہ نے داد دی ہے۔ سالِ قیام سنہ ۱۳۱۰ فصلی۔

(۴) کتب خانہ آصفیہ۔ مملکتِ آصفیہ کا مرکزی کتب خانہ۔ اِس کا صیغۂ مشرقی خاص طور پر قابلِ قدر ہے۔ انگریزی سکشن میں بھی بعض کتابیں نہایت خوب ہیں۔ سالِ قیام سنہ ۱۳۰۹ ہجری۔

(۵) مدرسۂ تعلیم المعلمین۔ (ٹیچرز ٹریننگ کالج) اس میں مدرسین کو فنِ تعلیم کی تعلیم دیجاتی ہے۔ سنہ ۱۲۸۰ ف میں قائم ہوا۔

(۶) مدرسہ انجنیرنگ۔ سنہ ۱۸۷۰ میں یہ کالج قائم ہوا، اور سنہ ۱۳۰۲ھ میں اِس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

(۷) مدرسۂ صنعت و حرفت، اورنگ آباد۔ ملک کی صنعتی ترقی

کے لئے یہ ایک نہایت مفید مدرسہ تھا۔

(۸) نظام کلب اعلیحضرت غفراں مکاں کی حکمرانی کی یادگار میں ۱۳۰۹ف
میں قائم ہوا۔ اس میں بھی مولوی شیخ احمد صاحب رفعت یار جنگ مرحوم
اور محی الدولہ رسول یار خاں مرحوم آپ کے شریک رہے۔

مدرسۂ اعزہ کے قیام سے قبل مرشدزادے انتہائی بد اخلاقیوں میں
مبتلا تھے، اپنے گھروں میں مدک خانے قائم کر رکھے تھے، ان حالات سے
متاثر ہو کر نواب صاحب نے مختار الملک بہادر سے مدرسۂ اعزہ قائم
کرنے کی تحریک کی۔ چنانچہ محض انہیں کی تحریک پر یہ مدرسہ قائم ہوا،
مرشدزادوں نے سواری نہ ہونے کا عذر کیا تو انھیں مقرر کرادیگئیں،
معقول وظائف سے اُن کو ترغیب دیگئی۔ گویا اس طرح مجبور کر کے انھیں
مدرسہ بھجوایا گیا۔ مدرسہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کالج میں داخل
ہونے پر اُن کے لئے بڑے بڑے وظائف مقرر کئے گئے۔ یہ مدرسہ
اب تک نہایت کامیابی کے ساتھ قائم ہے، تلاوت جنگ بی۔ اے
اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں غرض مرشدزادے جس قدر لکھنا پڑھنا
جانتے ہیں وہ اِسی مدرسہ کی بدولت۔

دائرۃ المعارف اور کتب خانہ کی اصل غرض جس کے لئے یہ
دونوں محکمے قائم کئے گئے۔ صرف اُمہاتِ کتب عربیہ کی حفاظت تھی

چنانچہ ابتداءً یہ محکمے انہیں اغراض کی تکمیل کرتے رہے اور رفتہ رفتہ دوسرے اُمور بھی اُن کے اغراض میں شامل ہو گئے۔ یہ علمی محکمے اور انجمنیں تنہا عماد الملک کی سعی و تحریک پر قائم ہوئیں لیکن آج کوئی نہیں جانتا کہ اِن کا قائم کرنے والا کون تھا، اِس لئے کہ عماد الملک نے کبھی نام و نمود کی خواہش نہیں کی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرس اس زمانہ میں مسلمانِ ہند کے پاس سب سے بڑی تعلیمی مجلس ہے، اور اس کی صدارت قومی نقطۂ خیال سے ایک مسلمان کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ عماد الملک کو یہ افتخار دو مرتبہ حاصل ہوا۔

ایک مرتبہ سر سید کی زندگی میں بمقام میرٹھ اس اجلاس کی افتتاحی تقریر اس مجموعہ میں شامل ہے۔

اِس کے بعد سنہ ۱۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کا سالانہ اجلاس جب بمقامِ رامپور منعقد ہوا تو اُس کی صدارت کا قرعۂ انتخاب پھر اِسی بزرگ قوم کے نام پر پڑا۔ اُس وقت اِس نے جو خطبۂ صدارت انگریزی میں ارشاد کیا، وہ یہی نہیں کہ بہ لحاظ مطالب مفید معلومات اور مشوروں پر مشتمل تھا، بلکہ بہ لحاظِ طرزِ ادا و حسنِ انشاء بھی اِس پایہ کا تھا، کہ انگلستان کے اخبارات و رسائل میں اُس کا غلغلہ پڑ گیا۔

راقمِ ہٰذا نے کوارٹرلی ریویو میں۔ اِس کا نہایت مداحانہ ذکر کیا تھا اور اسیطرح دیگر مقتدر جرائد نے بھی اِس کی داد دی۔ اِس خطبہ کا ترجمہ شاملِ رسائل ہے۔

اِسی کے بعد لارڈ کرزن نے سر ٹامس رالی کی زیرِ صدارت جو یونیورسٹی کمیشن ہندوستانی یونیورسٹیوں کی حالت کی تحقیق و اصلاح کی غرض سے مقرر کرایا، اُس میں منجملہ دو ہندوستانیوں کے ایک عماد الملک بہادر بھی تھے۔ یہ گویا حکومتِ ہند کی جانب سے اِس امر کا عملی اعتراف تھا، کہ آپ بہ حیثیت ماہرِ فنِ تعلیم ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ آپ نے اِس حیثیت سے تمام ملکِ ہند کا دورہ کیا اور کمیشن کی مشاورت میں برابر شریک رہے۔

لارڈ کرزن ہی نے ماہرِ تعلیم ہونے کی حیثیت سے آپ کو اپنی کونسل کا ممبر بھی مقرر کیا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں مباحثۂ بجٹ (موازنہ) کے موقع پر آپ نے جو تقریر کی، اور اِس مطالبہ کے ضمن میں، کہ حکومت کی طرف سے ابتدائی تعلیم کی مد میں اضافہ ہونا چاہیئے، آپ نے ملک کے کروڑوں غیر تعلیم یافتہ خلائق کی طرف سے جو وکالت کی، اُس کی یاد دلوں میں اب تک محفوظ ہے۔

مدارس یونیورسٹی کے آپ بہت قدیم و با اثر فیلو ہیں۔ خصوصًا

السنۂ شرقیہ سے متعلق آپ کی رائے کا ایک خاص وزن ہے۔
نومبر ۱۹۱۶ء میں اس یونیورسٹی کے چینسلر (گورنر مدراس) نے اسی فاضل کو کانووکیشن ایڈریس دینے کے لئے منتخب کیا، اور اس نے اس حیثیت سے جو خطبہ ارشاد کیا، اُس کے ایک ایک لفظ سے یہ ٹپکتا ہے کہ اس محترم فاضل نے مسائلِ تعلیم پر کس قدر غور کیا ہے، اور اِن معاملات میں کتنی بصیرت اور کس قدر تجربہ حاصل کیا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے معلوم ہوا ہوگا، کہ نہ صرف مملکتِ آصفیہ بلکہ ہندوستان کے ارتقاءِ علمی و تعلیمی میں عماد الملک بہادر کس قدر کوشاں رہے۔ لیکن اِس خادمِ قوم کا دائرۂ عمل تحریکاتِ علمی و تعلیمی تک محدود نہیں۔ اول نظر میں قیاس یہ ہوتا ہے کہ مملکتِ آصفیہ کے رکنِ رکین کو برٹش ہندوستان کی سیاسیات میں مداخلت سے کیا واسطہ ہوسکتا ہے؟ اور واقعہ بھی یہ ہے، کہ نواب عماد الملک نے کسی ایک موقع پر بھی اپنے دامن کو مناقشاتِ سیاسی کے خارزار میں اُلجھنے نہیں دیا ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ یہ بھی ایک امرِ واقعہ ہے کہ جب کبھی انہیں مقاصدِ قومی و ملی کے لئے کسی سیاسی تحریک میں شرکت و اعانت ضروری معلوم ہوئی، انھوں نے اُس سے دریغ نہیں کیا۔ آج سے پورے ۳۲ سال قبل جب سر سید نے کانگریس سے

مسلمانوں کے علیحدہ رہنے کی تحریک کی، تو نواب موصوف نے بھی اس تحریک کی تائید میں ایک پر زور تحریر انگریزی میں لکھی، جس کا ترجمہ اس مجموعہ میں کہیں درج ملے گا۔ اسی طرح اکتوبر ۱۹۰۶ء میں جب محسن الملک کی تحریک پر مسلمانانِ ہند کا وفد (ڈیپوٹیشن) ہزہائنس سر آغا خاں کی زیر صدارت لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تو جو اڈریس اس وفد نے پیش کیا، اُس کا مسودہ نواب عماد الملک بہادر ہی کا مرتب کیا ہوا تھا۔ اس اڈریس کے حسنِ ادا، متانتِ تحریر و قوتِ استدلال کی ہند و انگلستان میں بالاتفاق داد دی گئی۔ اور اِس وفد نے اسلامی ہند کی سیاسی تاریخ میں ایک بالکل جدید باب کا اضافہ کر دیا۔

یہ ایک علیحدہ بحث ہے، کہ نواب موصوف کے سیاسی خیالات اِس وقت اُن کی قوم میں کس حد تک مقبول ہیں۔ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ مسائلِ سیاسی کی شکلیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اور ہندوستان کی تو اِس تیس چالیس برس کے عرصہ میں قلب ماہیت ہو گئی ہے۔ اِن واقعات کے ذکر سے اِن کی تائید مقصود نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے، کہ جس طرز و روش کو وہ اپنی بصیرت اور اپنی رائے کے لحاظ سے قوم و ملت کے لئے مفید سمجھے، اُسے انھوں نے

پوری دلیری، آزادی، و خلوص کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کردیا اور انسان کی عظمت کے لئے اسی قدر کافی ہے۔

۱۹۰۷ء میں جب لارڈ مارلے نے وزیر ہند کی کونسل میں ہندوستانی ممبروں کی شرکت کا اختیار حاصل کیا، تو ان کی نظر انتخاب سب سے اول جن دو شخصوں پر پڑی، اُن میں سے ایک نواب عماد الملک بہادر تھے۔ چنانچہ اس سب سے پہلے ہندوستانی نے ۱۱ نومبر ۱۹۰۷ء کو اجلاس انڈیا کونسل میں شرکت کی۔ ٹائمز (لندن) نے اس خبر کو ان الفاظ میں شایع کیا:-

"انڈیا کونسل کے قیام کے ۵۰ سال بعد اس میں اس ہفتہ تاریخی حیثیت سے ایک اہم و یادگار واقعہ یہ ہوا ہے، کہ سب سے پہلے ہندوستانی نے آکر اس کے اجلاس میں شرکت کی"

اسی طرح خود لارڈ مارلے نے بھی اس واقعہ کو ہندوستان و برطانیہ کے تعلقات کی تاریخ میں منجملہ "اہم ترین" واقعات کے شمار کیا ہے۔

انڈیا کونسل کا کام تین کمیٹیوں میں منقسم ہے، ایک صیغہ مال کا، دوسرا عدالت و امور عامہ کا، اور تیسرا اسٹورز کا۔ ہر صیغہ کی الگ الگ کمیٹی ہے۔ نواب عماد الملک نے تینوں کمیٹیوں میں کام کیا

اور اِن کے دوسرے رفیق سر کے، جی، گپتا، دونوں کے حسن خدمات کا اعتراف لارڈ مارلے نے ایک سے زائد بار کیا۔ نواب صاحب کی مدتِ رکنیت ۱۰ر نومبر ۱۴ء کو ختم ہوتی تھی، لیکن سوء اتفاق کہ انگلستان کی سردی آپ برداشت نہ کر سکے، اِس لئے نومبر ۹ء ہی میں انڈیا کونسل کو آپ کے افادات سے مجبوراً محروم ہونا پڑا۔ یکم جنوری ۰۸ء کو سی، ایس، آئی کا خطاب آپ کو عطا ہوا۔

۱۲ء میں جب سالار جنگ ثالث مدار المہام حیدرآباد مقرر ہوئے، نواب عماد الملک بہادر کا تقرر اُن کے مشیر کی حیثیت سے، مشیر خاص مدار المہام کے لقب سے ہوا۔ اور ۱۴ء تک اِس خدمت کے فرائض بہ حسن اسلوب بجا لاتے رہے۔

اب اُن کا مشغلہ کتب بینی ہے، اور معتد بہ وقت کتب خانہ میں صرف ہوتا ہے۔ وہ صرف بہت بڑے عالم ہی نہیں، بلکہ اہل علم کے بہت بڑے قدر شناس بھی ہیں، اور اُن کا مکان خادمانِ علم کا مرجع ہے۔ نو آموز اہل قلم اُن کے مشوروں سے مستفید ہوتے ہیں، اُن کی تحریک و ایماء سے اردو میں بعض بہت بڑے کام انجام پا چکے ہیں، حال ہیں، علی گڈھ میں ترتیب کلامِ خسرو کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی گئی ہے، یہ انہیں کی علم دوستی کا ثمرہ ہے۔

نواب موصوف کی پبلک زندگی جس طرح ہمیشہ نہایت صاف و بے لوث رہی ہے، اُسی طرح اُن کی خانگی زندگی بھی سادگی و بے تکلفی کی تصویر ہے۔ تصنع، و ظاہرداری کا اُن کے اخلاق کے آس پاس بھی کہیں گذر نہیں۔

ان کی تحریروں میں حسب ذیل مستقل تصانیف ہیں:۔

(۱) حیات سالار جنگ اول۔ (انگریزی)

(۲) تذکرۂ مملکت آصفیہ۔ (ایضاً)

(۳) ترجمۂ قرآن مجید۔ (ایضاً) جو زیر تحریر ہے اور اسوقت تک سولہ پاروں تک پہنچ چکا ہے

(۴) رسائل عماد الملک (مجموعۂ مضامین و خطبات) (اردو) جو زیر طبع ہے۔ اور جس کے ساتھ یہ تذکرہ شائع ہوگا

اِن کے علاوہ متعدد قومی و تعلیمی عنوانات پر مقالات و رسائل ہیں جن میں سے اکثر ایک پوری تصنیفی اہمیت رکھتے ہیں۔

عماد الملک کا اہم ترین کارنامہ، جو تنہا ان کے بقاءِ نام کے لئے کافی ہے، وہ اِن کا انگریزی ترجمۂ قرآن مجید ہے۔ جن لوگوں نے انگریزی تراجم کو قرآن سے مقابلہ کر کے پڑھا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ سیل، راڈویل، پامر، وغیرہ کے ترجمے کسقدر ناقص ہیں، مذہبی تعصبات و مخالفانہ دراندازیوں سے قطع نظر کر کے ان حضرات نے معمولی عبارتوں کے سمجھنے میں بھی ایسی شدید و فاحش غلطیاں کی ہیں کہ سارے

مطالب قرآنی مسخ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس "بزرگِ قوم" کے اس احسان سے قوم قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے اس مقدس فرض کو بہترین صورت سے انجام دیا۔ ان کے ترجمہ کا اعجاز یہ ہے کہ باوجود انتہائی احتیاط اور لفظی پابندیوں کے التزام کے سلاست و روانی میں بھی کسی اہل زبان کے ترجمہ سے کم نہیں۔ اور اگرچہ اس کا سخت تاسف ہے کہ فاضل موصوف کی کبر سنی، ضعفِ صحت و اضمحلالِ قویٰ کی بناء پر اس کی توقع نہیں کہ ترجمہ تکمیل تک پہنچ سکے تاہم اس کے جس قدر اجزا تیار ہو چکے ہیں وہ منتہائے تحقیق و کاوش کا نمونہ ہیں، اور اس پایہ کے ہیں کہ انہیں کو نواب عماد الملک کے آیاتِ کمال کا سرنامہ بنایا جائے۔ درحقیقت، اگر نواب صاحب کی ساری زندگی کا صرف یہی ایک کارنامہ ہوتا تو اس آفتاب کے سامنے دوسروں کے خدمات ماہ و انجم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

مولوی سید حسین بلگرامی کی مخصوص دلچسپی کی شئے ادب (لٹریچر) ہے۔ عربی و انگریزی دونوں زبانوں پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور ان دونوں زبانوں میں وہ بے تکلف نظم کہنے پر قادر ہیں۔ ان کی اعلیٰ انگریزی انشاء پردازی کا اعتراف انگلستان کے بڑے بڑے مقتدر علمی جرائد کر چکے ہیں۔ انگریزی اور عربی کے بعد انہیں فرنچ میں

مہارت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محض ادیب ہیں، اور مشرقی و مغربی علوم سے نابلد ہیں۔ کیننگ کالج میں بہ حیثیت پروفیسر انھوں نے سائنس کے مختلف مضامین کی تعلیم دی ہے، اور ان کے مقالات میں جہاں کہیں کوئی علمی مسئلہ آجاتا ہے، اس پر وہ پوری تحقیق سے بحث کرتے ہیں۔ خود اسی "رسائل" میں متعدد مضامین ایسے ملیں گے، جن میں طبعیات کے مسائل پر پوری بحث ہے بہ حیثیت مقرر کے، ان کا شمار زبان آور مقرروں میں نہیں ہو سکتا، تاہم ان کے انداز بیان میں ایک خاص قسم کی متانت و شستگی ہے اور ان کی تقریر اغلاق، ژولیدگی، و تعقید سے پاک ہوتی ہے۔

نواب صاحب کا سن اسوقت ۷۹-۸۰ سال کا ہے۔ پیری ان کے قویٰ و اعضاء جسم کو کافی متاثر کر چکی ہے، باانیہمہ ان کے علمی شغف و انہماک کی یہ کیفیت ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کی مجلس وضع مصطلحات علمیہ میں نمایاں عملی حصہ لیتے ہیں، اور اس سے بڑھکر یہ کہ تہذیب و اشاعت کتب قدیمہ کا جو جدید سررشتہ سرکار دکن نے قائم کیا ہے، اس کی باگ عملاً تمامتر انہیں کے ہاتھ میں ہے، جس کے فرائض وہ پوری مستعدی و تندہی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اس سن و سال میں یہ علم پرستی، مسلمانوں کی موجودہ تاریخ میں

ایک نادر واقعہ ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ علم و امارت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر عماد الملک سید حسین بلگرامی کے سے افراد بکثرت پیدا ہونے لگیں، تو اِس کلیہ کی صحت مشتبہ ہو جائے۔

۲ اگست ۱۹۲۶ء

عبد الماجد
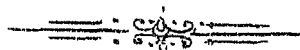
بر یورپ کے جنوب و مغرب میں ایک جزیرہ نما واقع ہے جس کے تین طرف دریا کا حصار ہے اور شمال کی جانب کوہِ پرنیز کی دیوار اُسے فرانس کے ملک سے جُدا کرتی ہے۔ یہ جزیرہ نما اب اسپین اور پورتگل نامی دو سلطنتوں پر منقسم ہے جن کو اگلے زمانہ میں ہسپانیہ اور لُوسِٹانیہ کہتے تھے۔ طارق بن زیاد پہلا مسلمان تھا جس نے اِس سرزمین میں قدم رکھا ۹۲ھ میں مراکش کی طرف سے جہازوں پر سوار ہو کر اپنی فوج کے ساتھ ایک مقام پر اُترا جو آج تک اُس کے نام سے مشہور ہے اور یوروپین زبانوں میں بھی جبرالٹر یعنے جبل الطارق کہلاتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اکثر صوبہ جات اسپین کے مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے اور چونکہ صوبہ اندلس پہلا صوبہ

تھا جس پر مسلمانوں نے قبضہ کیا اور دارالامارہ قرطبہ بھی اسی صوبہ میں واقع تھا
انھوں نے کل مملکت کا نام اندلس رکھا کما بیش آٹھ سو برس تک مسلمانوں نے
اس ملک میں بادشاہت کی مگر آٹھویں صدی میں زوال شروع ہوا اور نویں
صدی تک یہ دولت بالکل اُن کے ہاتھ سے تلف ہوگئی اور سارا ملک قبضہ
سے نکل گیا۔ اس آٹھ سو برس کے عرصہ میں بھی نہ حکومت ہمیشہ ایک حالت
پر رہی اور نہ ایک خاندان نے برابر حکمرانی کی کبھی تو بنی اُمیّہ کا زور تھا کبھی
بنی عامر کا دور دورہ رہا کسی زمانہ میں مرابطین کی سلطنت تھی کبھی موحّدین
بادشاہت کرتے تھے اِن انقلابوں کے ساتھ بھی علوم و اخلاق کو جس قدر
اندلس کے مسلمانوں نے جلوہ دیا اور صفاتِ انسانی اور کمالاتِ روحانی
و جسمانی جس درجہ انھوں نے حاصل کیئے قدیم زمانہ کے سربرآوردہ قوموں
میں سے کم کسی قوم کو نصیب ہوئے ہیں۔

اس آٹھ سو برس کے عرصہ میں کئی دور اس قسم کے گزرے کہ آج تک تاریخ
سلف میں یادگار اور لایق اعتبار ہیں۔ یعنے وہ دورے جن میں علم و حکمت و
وصلاحیت و شایستگی و تہذیب کے درخت نے چند قرن کا نشو و نما چند سال
میں حاصل کیا اور برسوں کی مسافت مہینوں میں طے کی قومی زندگی میں یہ وہ
یادگار زمانے ہیں جنکو بعدِ زوال و نکبت بھی ہم کبھی بھول نہیں سکتے کیونکہ ہمارا
بلکہ ہر قوم کا مایہ فخر اور سرمایۂ نازش جو کچھ ہے وہ یہی ہے کہ اُس قوم نے

اپنے زمانۂ عروج میں اور اپنی سعی و کوشش سے مجموعی ذخیرۂ علم و ہنر میں کس قدر راس المال بڑھایا اور ماہیتِ انسانیت کو حالتِ بہیمیت سے بہ نسبت گزشتہ قوموں کے کس قدر آگے بڑھایا ان دونوں باتوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہے الا تتبع حالاتِ سلف سے خصوصاً اُس وقت کے حالات سے جب کہ علم و ہنر و تمدن نے زیادہ ترقی کی تھی کیونکہ اس جستجو میں بادشاہوں کے کر و فر اور سپہ سالاروں کے فتوحات کی کچھ قدر و منزلت نہیں ہے بلکہ مورخ فلسفی ان حوادثِ تاریخی کو اُسی نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے اُستاد یا پدر مہربان ناچ رنگ تھیٹر وغیرہ کو دیکھتا ہے کہ یہ سب چیزیں لہو ہیں اور تحصیل علم میں ہارج اور تہذیبِ اخلاق کی ترقی کو سست اور بطی کرنے والی ہیں۔

قاضی ابو الولید ابن رشد جس کے حالات آج ناظرین کے رو برو بیان کئے جائیں گے اس قسم کی یادگار قرنوں میں سے ایک قرن کے علم و فضل کا نمونہ اور خلاصہ تھا۔

قاضی ابو الولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد شہر قرطبہ میں ۵۲۰ھ ہجری مطابق ۱۱۲۶ عیسوی میں پیدا ہوا اور قریب اسی برس کے سن کو پہنچ کر ۵۹۵ھ مطابق ۱۱۹۸ء میں وفات پائی۔ ابن رشد کا خاندان قرطبہ میں ہمیشہ سے عالی اور نامور اور علم میں ممتاز تھا اس حکیم کا دادا ابو الولید محمد بھی قرطبہ کا قاضی تھا اور فقہ مالکی میں بہت شہرت رکھتا تھا اس قاضی کے فتاوی سے

ایک بڑی ضخیم کتاب ابن دران خطیب محمد قرطبی نے جمع کی تھی اس کا ایک نسخہ کتاب خانۂ فرانس میں موجود ہے تمام امصار مغرب و اندلس سے قاضی قرطبہ کے پاس سوالات آتے تھے اُمورِ مملکت میں بھی اس شخص کو بہت کچھ رسائی تھی اور بادشاہانِ مغرب اس سے مدد لیا کرتے تھے اور مشاورت کیا کرتے تھے ایک موقع پر جب بعض ولایاتِ اندلس سلطان سے منحرف ہو گئے تھے اس بغاوت کے رفع ہونے کے بعد ابو الولید اس خدمت پر مامور ہوا تھا کہ اُن کی طرف سے اطاعت نامہ بادشاہِ مراکش کے پاس پہنچائے ایک مرتبہ جب الفانسو نے جس کو عربی مورخ اوفنش بن ادمیر لکھتے ہیں ثغور اسلام پر بہت یورش کی تھی اور معاہدین کی مدد سے غرناطہ کے قریب تک چلا آیا تھا اُس وقت اس حملہ کے دفع ہونے کے بعد ابو الولید نے خود مراکش جا کر علی بن یوسف المرابطی سے جو اُس وقت کا خلیفہ تھا یہ کہا کہ جب تک معاہدین کی معقول تلافی نہ ہوگی دیارِ اسلام نصرانیوں کے شر سے محفوظ نہ رہیں گے چنانچہ اس کی صلاح سے بہت سے معاہدین جو غرناطہ کے قرب و جوار میں رہتے تھے اور جنھوں نے الفانسو کو مدد دی تھی جلاوطن کئے گئے اور لیجا کر آفریقہ کے بعض شہروں میں بسائے گئے۔

ابو الولید کا بیٹا ابو القاسم احمد حکیم ابن رشد کا باپ ۱۰۹۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۱۶۸ء میں وفات پائی یہ بھی قرطبہ کی قضاءت پر مقرر تھا نہایت

عبرت اور تعجب کا مقام ہے کہ ابنِ رشد جس کے نام نے صفحاتِ یورپ میں ارسطو کے نام پر مدت تک تفوق پایا اور تمام علماء و حکماء میں زبان زد رہا اور آج تک مشہور ہے وہ شخص خود ہماری کتابوں میں فقط حفید العلامہ ابن رشد یعنی اپنے دادا ابنِ رشد کے نام سے مشہور رہے۔

حکیم ابنِ رشد مثل اپنے بزرگوں کے ابتدائے سن سے تحصیل علم میں مشغول رہا اور اصولِ فقہ طریقۂ اشعری اور فقہ مالکی کو مشاہیر علمائے وقت سے حاصل کیا حدیث کو اپنے والد ابوالقاسم احمد سے اور ابوالقاسم بن بشکوال اور ابومروان ابن مرہ اور ابوبکر بن سمحون و ابوجعفر بن عبدالعزیز سے یاد کیا۔ اور ابوجعفر بن عبدالعزیز اور ابوعبداللہ مازری سے اجازہ پایا علمِ طب ابومروان ابن جریول البلنسی سے اور ابوجعفر بن هرون الرجالی سے سیکھا کہتے ہیں کہ روایت کی نسبت درایت میں اس کو زیادہ ملکہ تھا مگر سب سے زیادہ علوم اولیہ اور فنونِ عقلیہ میں دخل تھا۔ ابن ابار لکھتا ہے کہ اندلس میں ابن رشد کا کوئی نظیر علم و فضل و کمال میں نہیں پیدا ہوا اور باوجود اس کے نہایت متواضع و منکسر تھا ابتدائے سن سے علم کی تحصیل اور اشاعت میں مصروف رہا۔

بروایت ابنِ ابار لوگ کہتے ہیں کہ بدو شعور سے کتاب بینی میں کبھی وقفہ نہیں ہوا الا جس شب کو اس کے والد نے وفات پائی اور جس رات اس کی شادی ہوئی۔ ابن ابار لکھتا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں اپنی مصنفات

دس ہزار ورق سیاہ کئے علوم اولیہ کی طرف اسے زیادہ میلان تھا اور اس
فن میں اپنے وقت کا امام تھا مگر اُس کے ساتھ طب اور فقہ دونوں میں صاحب الرائے
تھا اور اس کے قول سے لوگ استناد کرتے تھے اگرچہ بعض مسایل فلسفی میں ابن رشد
ابن ماجہ کا مقلد ہے اور اپنی تصنیفات میں اُس حکیم بلند مرتبت کا ہمیشہ بڑی
عزت سے نام لیتا ہے مگر بعض اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ماجہ ابن رشد
کی ولادت سے پیشتر وفات پا چکا تھا اگرچہ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ ابن رشد کو
ابن ماجہ سے تلمذ تھا اور بالذات اس کی خدمت سے مستفید ہوا تھا ابن رشد
کے ابتدائی زمانہ میں اندلس فحول علماء و حکماء سے بھرا ہوا تھا ابن طفیل
ابو مردان بن زہر ابوبکر بن زہر وغیرہ وہ لوگ ہیں جن پر ہم مسلمان آج فخر
کر سکتے ہیں اور جن کا نام جب تک دنیا قایم ہے زندہ رہے گا ابن زہر کا خاندان
جامع کمالات تھا اور ہر فرد اس خاندان کا فرد اکمل تھا خصوص فنون طبعیہ میں
اس خاندان کے لوگوں کو بڑی دستگاہ تھی اور نام اُن کا یورپ میں آج تک
مشہور ہے ہر ایک اِن علما و حکما سے اپنے زمانہ کا آفتاب تھا اگرچہ ابن رشد
کے کمالات کی روشنی ان سب پر غالب ہوگئی ایسی جلیل القدر لوگوں کی
صحبت میں ابن رشد نے تربیت پائی - ابن طفیل اس کا بڑا مربی اور دوست
تھا ابو مردان ابن زہر اور ابن رشد میں ایسی دوستی تھی کہ جب ابن رشد نے
کلیات طب کی تصنیف شروع کی ابو مردان ابن زہر نے ابن رشد کی فرمایش

سے جزئیات میں ایک کتاب لکھنی شروع کی تاکہ دونوں دوستوں کی تصنیفیں
یک جا ہو کر فن طب میں ایک کامل کتاب بن جائے اور جس طرح سے خود
مصنف ایک جان دو قالب تھے اُن کی تصنیف بھی ہمیشہ ایک ہی قالب
میں مجتمع رہے - ابن رشد کی کتاب کا نام کتابُ الکلیّات ہے اور
ابن زہر کی کتاب کا نام تیسیر ہے ابنِ رشد کے ذاتی حالات پر ہم کو
کسی طرح کی اطلاع نہیں ہے مسلمانوں میں بہت کم بزرگانِ علم یا مذہب گزرے
ہیں جنکے ذاتی حالات بہ تفصیل ہم کو معلوم ہوں اور اس بے خبری سے ہماری
قوم کو کس قدر نقصان اور ہمارے تاریخی علم میں کس قدر نقص واقع ہوا ہے
وہی لوگ کچھ خوب اندازہ کر سکتے ہیں جو آج کل کے طریقہ تراجم وسیر سے واقف
ہیں جس میں ہر ذی کمال کی ساری خانگی اور مخصوص کیفیتیں اور اس کے خصایل
و عادات اور معیشت و معاشرت کے طریقے لکھے جاتے ہیں الغرض جو کچھ
احوال ابنِ رشد کا معلوم ہے یہاں بیان کیا جاتا ہے -

جن لوگوں نے مولوی مشتاق حسین صاحب کی عمدہ تحریر عبدالمؤمن وزیر
و خلیفہ محمد بن عبداللہ تیومرت کے احوال میں ملاحظہ کی ہے وہ یقیناً واقف
ہوں گے کہ محمد بن عبداللہ اور اُس کے خلیفہ عبدالمومن نے کیونکر علی بن یوسف
المرابطی کو شکست دیکر مرابطین کی حکومت کو برباد کیا اور خود ممالکِ آفریقیہ
و اندلس پر قابض ہوگیا اگرچہ اس انقلاب کا باعث و محرک جوشِ مذہبی تھا

اور ابتدا میں اس جوش نے جہلائے متعصب اور عامیانِ غیر مہذب کے ہاتھ سے بہت کچھ علم کا خرابہ کیا اور کتابیں جلوادیں مگر عبدالمومن کے تخت پر بیٹھتے ہی علم اور عالموں کے دن پھر گئے کتابوں کی تباہی یک قلم موقوف ہوئی اس علم دوست بادشاہ نے اپنے عصر کے سارے فلاسفہ کو اپنے گرد جمع کر کے علما اور فضلا کا نورتن بنالیا بلکہ باغ بسا دیا۔ اس بادشاہ کے دربار میں ابن زہرا بن ماجہ ابنِ طفیل ابنِ رشد مقربین سلطنت میں سے گنے جاتے تھے ۵۴۳ھ یا ۱۱۵۳ء میں ابن رشد کو عبدالمومن نے مراکش میں بلوایا اُس وقت یہ بادشاہ مدارس کی بنا میں مشغول تھا اور ابن رشد کو اسی لئے بلایا تھا کہ اس کام میں مدد ملے مولوی مشتاق حسین صاحب کی تحریر میں عبدالمومن کے مدارس کا حال بشرح وبسط بیان ہوا ہے ابن رشد اس کام کے ساتھ ہیئتہ کی تحقیقات میں بھی مشغول تھا۔ عبدالمومن کے بعد یوسف تخت نشین ہوا یہ بادشاہ اپنے وقت کا بڑا عالم اور فاضل بلکہ اعلم وافضل گنا جاتا تھا۔

اس کے عہد میں ابنِ طفیل کو بہت فروغ ہوا اور بادشاہ کی مزاج میں بڑا دخل پیدا کیا اس نے اپنے اقتدار اور قربت سے یہ کام لیا کہ تمام اطراف واکناف و دیار وامصار سے علماء وفضلا بلا کر جمع کئے اور ابن طفیل ہی کے باعث سے ابن رشد کو امیر یوسف کے دربار میں رسوخ حاصل ہوا عبدالواحد ابنِ رشد کے ایک شاگرد کے زبانی روایت کرتا ہے کہ ابنِ رشد اکثر صحبتوں میں اپنی

پہلے باریابی کی کیفیت یوں بیان کیا کرتا تھا۔

جب میں امیر المؤمنین کے سامنے گیا اُس وقت وہ تنہا بیٹھا تھا اور سوائے ابنِ طفیل کے کوئی دوسرا حاضر نہ تھا مجھے دیکھتے ہی ابنِ طفیل نے میری تعریف و توصیف شروع کی پہلے میرے علو و قدامتِ خاندان کا ذکر کیا پھر اپنے حُسنِ اخلاق سے میرے علم و فضل کی ستایش شروع کی اور اس قدر مُبالغہ کے ساتھ کہ میں ہرگز اس کا سزاوار نہ تھا امیر نے مجھے میرا اور میرے باپ کا نام پُوچھکر بابِ مخاطبہ اس عنوان سے کھولا کہ حکما کے نزدیک افلاک کی کیا حقیقت ہے آیا جواہر قدیمہ ہیں یا حادث مجھ پر رُعب ایسا غالب تھا کہ میری زبان نے مطلق یاوری نہ کی گونگوں اور بہروں کی طرح ساکت و صامت رہ گیا ایک بات بھی مُنہ سے نہ نکلی دل میں کوئی بہانہ ڈھونڈھتا تھا کہ جس سے جواب نہ دینا پڑے بلکہ چاہتا تھا کہ علوم فلسفیہ سے اپنی لاعلمی ظاہر کروں امیر میرے بشرہ سے تاڑ گیا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی اور رُوئے سخن ابنِ طفیل کے طرف پھیر کر اس نے خود اپنے سوال کا جواب دینا شروع کیا پہلے افلاطون اور ارسطو اور دوسرے حکما کے اقوال اس مسئلہ میں نقل کئے پھر متکلمین اہلِ اسلام کے معتقدات بیان کئے میں امیر کے قوت حافظہ سے دنگ رہ گیا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس قدر معلومات

اور تتبع کتب اور وسعتِ نظر جس کا وجود اُن علماء میں بھی شاذ ہے جو تمام وقت اپنا تحصیل علوم فلسفی میں صرف کرتے ہیں اس امیر کو حاصل ہے غرض امیر نے اپنی حُسنِ تقریر سے میرا رُعب ایسا کھو دیا کہ مجھے بھی منہ کھولنیکی جرأت ہوئی اور امیر کو میرے مایہ علمی پر اطلاع پانی کا موقع ملا رخصت کے وقت امیر کے حضور سے مجھے ایک خلعتِ فاخرہ اور بیش بہا اور کچھ زر نقد اور ایک سواری کا گھوڑا عنایت ہوا۔

عبدالواحد لکھتا ہے کہ امیر یوسف کے دربار میں مشرف ہونیکے بعد ابن طفیل ہی کی ترغیب و تحریص سے ابن رُشد نے ارسطو کے کتابوں کی شرح لکھنی شروع کی چنانچہ خود ابن رشد نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ ایک دن ابن طفیل نے مجھے بلا کر یہ کہا کہ آج امیرالمؤمنین شاکی تھے کہ ارسطاطالیس اور اُس کے مترجمین کا بیان بہت مغلق ہے خدا کرے کوئی ایسا شارح پیدا ہو کہ مشکل مقاموں کو بخوبی حل کرے اور اغلاق دور کرے تاکہ عموماً لوگ اس کی کتابوں کے سمجھنے پر قادر ہوں ایسی تصنیف کیواسطے جو کچھ لیاقت درکار ہے آج خدا کے فضل سے تجھ میں موجود ہے پھر کیوں نہیں شروع کرتا تیری فہم و ذکا اور وسعتِ نظر سے مجھے اُمید کامل ہے کہ تو اس کام کو بخوبی انجام دیسکے گا میں خود اقدام کرتا مگر میری پیرانہ سری اور اُس کے ساتھ اشغال کی کثرت مانع ہے اُس روز سے میری ساری

توجہ اُس تصنیف کی طرف متوجہ رہی جس کو میں نے ابنِ طفیل کے اشارہ سے شروع کیا تھا اور یہ شرح کتب ارسطاطالیس اُس کا نتیجہ ہے ۔

غرض کہ ابنِ رشد امیر یوسف کے عہد سلطنت میں ہمیشہ مقرب بارگاہ اور خدماتِ جلیلہ پر مامور رہا معلوم ہوتا ہے کہ ۵۶۵ھ مطابق ۱۱۶۹ء میں اشبیلیہ کی قضاءت کا عہدہ اس سے متعلق تھا چنانچہ کتاب الحیوان ارسطو کی شرح میں جس کو اُس نے اشبیلیہ میں ختم کیا عذر کرتا ہے کہ میں مشاغلِ سرکاری میں مصروف ہوں اور میرا کتب خانہ قرطبہ میں مجھ سے بہت دُور ہے اگر کسی مقام پر مجھ سے خطا ہو گئی ہو تو خواندے میری کتاب کے اس سے چشم پوشی کریں ۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۵۶۷ھ مطابق ۱۱۷۱ء میں ابن رشد کو اپنے وطن مالوف یعنے قرطبہ میں واپس آنا نصیب ہوا اور اپنی بڑی شرح اس نے یہیں تمام کی اس کتاب میں بھی اکثر شکایت کرتا ہے کہ مجھے سرکاری اُمور نے تصنیف کی مہلت نہ دی اور مختصر المجسطی کے باب اول کے آخر میں لکھتا ہے کہ مجھے اس قدر فرصت نہ ملی کہ مسائلِ اہمہ کے سوائے اور کسی امر سے اپنی کتاب میں تعرض کروں اور میری مثل اُس شخص کی ہے کہ جس کے گھر میں آگ لگی ہو اور اُس کو فقط اتنی ہی مہلت ہو کہ کچھ ضروری اور بیش قیمت چیزیں ہاتھ میں اُٹھالے اور اپنی جان بچا کر نکل بھاگے ۔

ابنِ رشد سے ایسے خدمات متعلق تھے کہ اُسے اکثر اوقات ممالک محروسہ موحدین میں دورہ کرنا پڑتا تھا کبھی مراکش میں جانا پڑتا تھا کبھی اشبیلیہ میں کبھی قرطبہ میں۔

سنہ۱۱۷۸ء میں ابنِ رشد نے مراکش کے مقام میں المقالہ فی الجرم السماوی کا ایک حصہ لکھا اور سنہ۱۱۷۹ء میں اشبیلیہ پہنچکر اپنی دینیات کی کتابوں میں سے ایک کتاب تمام کی سنہ۱۱۸۲ء میں پھر مراکش بُلالیا گیا اور ابنِ طفیل کی بجائے امیر کے دربار میں رئیس الاطبا مقرر ہوا بعد ازاں اُس کو قرطبہ کی قضاۃ ملی جو اَباً عن جدٍ اس کے خاندان میں چلی آتی تھی۔

امیر یوسف نے سنہ۵۸۰ھ میں اس دار فانی سے انتقال کیا اور اس کی جگہ پر اس کا بیٹا یعقوب ابو یوسف ملقب بالمنصور باللہ تخت نشین ہوا اس امیر کے زمانہ میں بھی ابنِ رشد کو وہی رسوخ اور تقرب باقی رہا جو یوسف اور عبد المؤمن کے زمانہ میں تھا۔ اکثر امیر کے ساتھ علمی مباحث میں گفتگو کیا کرتا تھا اور امیر اُسکو اپنی مسند سے بہت قریب بٹھاتا تھا اور حجاب اسقدر اُٹھ گیا تھا کہ اثنائے گفتگو میں ابن رشد اکثر اپنے بادشاہ سے اِسْمَعْ یَااَخِیْ یا اِعْلَمْ یَااَخِیْ کہہ کے خطاب کرتا تھا بعض مورخوں کا قول ہے کہ خود خلیفہ نے اپنی فرطِ محبت سے اپنے ملازم اور دوست کو یَااَخِیْ کا خطاب دیا تھا بہرحال خطاب جس کی طرف سے ہو کوئی شک نہیں کہ دونوں حالتوں

میں یہ انداز گفتگو نہ ابنِ رشد کی شان سے برتر نہ امیر منصور کے مرتبہ سے فروتر تھا یعقوب المنصور باللہ کا نام بھی کسی نے نہیں سنا ہے اور ابن رشد کا علم و فلسفہ آج تک مغرب میں زندہ ہے عام الارک ۵۹۱ھ م ۱۱۹۵ عیسوی میں یعنے جس سال المنصور نے الفونسو (انفنشن) پر چڑھائی کی اور الارک (الارکاس) کی لڑائی ماری ابنِ رشد باوجود کبر سن امیر کے ساتھ تھا۔ ابن ابی اُصیبعہ قاضی ابو المروان الباجی سے روایت کرتا ہے کہ جب کہ المنصور قرطبہ میں غزوہ انفنشن کے واسطے سامانِ جنگ مہیا کر رہا تھا اُس وقت اُس نے ابن رشد کو بلایا اور اُس کے ساتھ نہایت درجہ عزت و احترام سے پیش آیا اور اس قدر قریب اپنے بٹھایا کہ ابو محمد عبدالواحد بن الشیخ ابی حفص الہنتاتی کی درجہ سے بھی تجاوز کر گیا یہ ابو محمد عبدالواحد امیر عبدالمؤمن کے بڑے مقرب وزرا میں سے تھا اور ایسا بڑا مرتبہ اُس کا تھا کہ امیر منصور اپنی بیٹی کو اُس کے عقد میں لایا تھا۔ غرض کہ امیر منصور ابن رشد کو اپنے پہلو میں بٹھلا کر بہت دیر تک باتیں کرتا رہا اور کتنے ہی لوگ جو اُس وقت بارگاہِ سلطانی میں حاضر تھے اُس کے تقرب کو دیکھکر آتش حسد میں جلتے رہے جب ابن رشد باہر نکلا اُس کے دوستوں اور شاگردوں نے اُس کے گرد حلقہ باندھ لیا اور مبارکباد دینے لگے ابنِ رشد نے کہا کہ اے صاحبو امیر المؤمنین کا مجھے دفعتًہ اس قدر تقرب دینا کچھ تہنیت اور مبارکباد کا مقام نہیں ہے اور

یہ مرتبہ جو مجھے عنایت ہوا ہے میری اُمید اور توقع سے دور اور میری لیاقت وقابلیت سے زیادہ ہے گویا ابن رشد اپنی فراست و ادراک سے سمجھ گیا تھا کہ میری نکبت اور ادبار کا زمانہ قریب آگیا ہے اور غرض اس تقریر سے یہ تھی کہ بادشاہوں کے تقرب پر پھولنا اور غرہ کرنا عقلمندی سے دور ہے۔ گہے بہ سلامے رنجند گہے بدشنامے خلعت دہند۔ القصہ اس صحبت کے وقت ابنِ رشد کے دشمنوں نے مشہور کر دیا تھا کہ امیر المؤمنین نے اُس کے قتل کا حکم دیا ہے اس واسطے ابنِ رشد نے صحیح و سلامت باہر آتے ہی اپنے خدام میں سے ایک شخص کو اپنے گھر روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ میرے واسطے قطا کا سالن اور کچھ کبوتر بھنے ہوئے جلد تیار رکھو میں ابھی آتا ہوں اس پیام سے غرض ابنِ رشد کی یہ تھی کہ اُس کے اہل خانہ کو اطمینان ہو کہ آقائے خانہ صحیح و سالم ہے۔

القصہ امیر منصور کی عنایتِ بے نہایت نے ابنِ رشد کو محسود اقران بنا دیا اور دربار میں اُس کے دشمنوں کی تعداد زیادہ کر دی اور اُن کی سعایت و نمامی نے آخرِ کار امیر کے مزاج کو برہم کر دیا اور اُس کی نکبت و ادبار کا باعث ہوئے اس واقعہ کو مورخوں نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ انصاری کہتا ہے کہ امیر منصور کے بھائی ابو یحییٰ والی قرطبہ اور ابنِ رشد میں باہم بڑی محبت و دوستی تھی اور اس امر نے منصور کو ابنِ رشد سے

بدظن کر دیا تھا عبدالواحد لکھتا ہے کہ ابن رشد شرح کتاب الحیوان میں ایک
مقام پر لکھ گیا تھا کہ میں نے ایک زرافہ سلطانِ بربر کے سرکار میں دیکھا ہے
ابن رشد کے حاسدوں نے منصور کو یہ عبارت دکھائی کہ امیر کی وقعت
اس شخص کے دل میں بس اس قدر ہے کہ امیر کو سلطانِ بربر کے نام سے
یاد کرتا ہے جب ابنِ رشد سے پوچھا گیا اُس نے جواب دیا کہ یہ سہو کتابت ہے
اصل میں میرا مقصد سلطان البرین تھا نہ سلطان البربر یہ تاویل صحیح ہو یا غلط
علماء و حکماء کا دستور چلا آتا ہے کہ علمی کتابوں میں جب کسی بادشاہ کا نام
آتا ہے تو اُس کو معمولی طور پر لکھ جاتے ہیں مدحیہ الفاظ و خطاب وغیرہ کو
حذف کر جاتے ہیں علما کے شان سے بعید ہے کہ سلاطین و امراء کی
چاپلوسی کریں اور اُن کی مدح وثنا میں مبالغہ کریں ابنِ رشد کی کوئی خطا
نہ تھی بلکہ اصل حقیقت تو یوں ہے کہ امیر منصور کے نام کا ابنِ رشد کی
کتاب میں ذکر کیا جانا ہی امیر کے بقائے نام اور فخر خاندان کا باعث
تھا۔ انصاری نے ایک روایت اس باب میں نقل کی ہے لکھتا ہے
کہ مشرق و اندلس میں ایک خبر نجومیوں نے مشہور کی تھی کہ ۵۸۱ھ
یا ۵۸۲ھ میں ایک ریح عاتیہ فلاں دن فلاں تاریخ چلے گی جس سے
تمام خلقت ہلاک ہو جائیگی اس خبر کو اس قدر شیوع ہوا کہ تمام لوگ
ہراساں اور خوف زدہ ہو گئے اور اپنی جانیں بچانے کے واسطے

زمین میں گڑھے اور خندقیں کھودنے لگے حکومت نے عامۂ خلایق کو اس قدر ترساں و لرزاں دیکھکر قرطبہ میں ایک مجلس منعقد کی اور تمام علمائے وقت کو جمع کرکے اُن سے اس خبرِ وحشت اثر کی حقیقت پوچھی غرض جب مجلس برخواست ہوچکی ابنِ رشد جو اس وقت قرطبہ کا قاضی تھا اور ابنِ بندود آپس میں باتیں کرتے ہوئے مجلس سے باہر نکلے ابنِ بندود ازروئے حکمتِ طبعی و تاثیراتِ کواکب اس طوفان کے بارہ میں کچھ بیان کر رہا تھا کہ اس اثنا میں ابو محمد عبدالکبر نے جو بقول خود اس وقت حاضر تھا یہ کہا کہ اگر طوفان کی خبر سچ ہے تو یہ ثانی ریح عائشہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو ہلاک کیا تھا کیونکہ قوم عاد کی ہلاکت کے بعد کوئی طوفان اس قسم کا سننے میں نہیں آیا جس سے قوم کی قوم ہلاک ہوگئی ہو ابو محمد عبدالکبر کہتا ہے کہ ابنِ رشد نہ رہ سکا یہاں تک کہ بول اُٹھا کہ وجود قومِ عاد کا ہی محقق نہیں ہے چہ جائے کہ ان کی ہلاکت سننے والے سُن کر حیران رہ گئے اور یہ گمراہی کا قول اُن کو سخت ناگوار ہوا جس کا کوئی شخص بغیر صریح بد اعتقادی کے قائل نہیں ہوسکتا۔

ابن زبیر لکھتا ہے کہ علمائے وقت نقلِ احادیث و مسایلِ دینیہ میں ابن رشد پر اعتماد کیا کرتے تھے اور اُس کے اقوال سے سند لیا کرتے تھے مگر جب اُسے علومِ حکمیہ میں زیادہ توغل ہوا اور ارسطو کے کتابوں کی اُس نے

تلخیص کی اور شریعت و فلسفہ کو باہم جمع کرنے کا قصد کیا اُس وقت سے اکثر لوگوں نے اس کی تقلید چھوڑ دی اور اعتبار اس کا ساقط ہو گیا۔

عبدالواحد ناقل ہے کہ ابنِ رشد نے اپنی تصنیف میں بعض قدما کا قول نقل کیا تھا کہ زہرہ آلہہ میں سے ہے اُس کے دشمنوں نے اس عبارت کو اپنے مقام اور سیاقِ کلام سے علیحدہ کر کے امیر منصور کو دکھایا کہ یہ شخص ملحد ہے سیّارہ کو خدا کہتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی کسی شخص نے اپنے فضل و لیاقت سے دنیا میں نام و نشان پیدا کیا اور بادشاہوں کے درباروں میں اس قدر تقرب و اعتبار حاصل ہوا جس قدر ابنِ رشد کو امیر منصور کے دربار میں حاصل ہو گیا تھا تو ایک عالم اس کا دشمن اور اُس کے خون کا پیاسا بن جاتا ہے جس وقت تک حاکم کی نظر مہربانی ہے لوگ اُس کے قدموں کے تلے پلکیں بچھاتے ہیں ادھر شعرا اور ادبا اُس کی مدح و ثنا میں رطب اللسان ہیں ادھر علماء و اُمراء اُس کی خوشامد گوئی میں عذب البیان ہیں اِس سے اگر خطا ہو تو صواب ہے۔ ہزل بکے تو عین حکمت ہے۔ گالیاں دے تو لوگ فخر سمجھکر سنتے ہیں۔ گناہ کرے تو اُسے ثواب جانتے ہیں کفر کا مرتکب ہو تو معرفت پر حمل کرتے ہیں۔ مگر جہاں حاکم کی نظر اس سے پھری اور اپنے پایہ سے گرا پھر تو ایک

آن کی آن میں کایا پلٹ جاتی ہے یہی لوگ جو ہروقت خوشامد میں مصروف رہا کرتے تھے کتوں کی طرح بھونکنے لگتے ہیں پھر تو کوئی ہنر اُس میں نہیں ہے جو عیب نہ ہو کوئی حُسن نہیں جس میں ہزار داغ نہ ہوں

وَعَيْنُ الرِّضَا عَنْ كُلِّ عَيْبٍ كَلِيلَةٌ ⁂ وَلٰكِنَّ عَيْنَ السُّخْطِ تُبْدِي الْمَسَاوِيَا

محبت کی آنکھ کو کوئی عیب نہیں سجھائی دیتا ⁂ ہاں عداوت کی آنکھ برائیوں کو ظاہر کر دیتی ہے

جس کسی کو حاکم تک رسائی ہے اپنے رسوخ کے واسطے کوئی نیا عیب ڈھونڈ کر پیش کرتا ہے جھوٹ کی ندیاں بہہ جاتی ہیں بہتان کے طوفان چل جاتے ہیں ابن رشد کے حاسدوں نے بھی ابن رشد کے حق میں کچھ کمی نہیں کی ہجویں لکھیں تاریخیں کہیں خوشیاں منائیں خوب شماتت کی ایک شخص کہتا ہے کہ۔

أَلْآنَ قَدْ أَيْقَنَ ابْنُ رُشْدٍ ⁂ أَنَّ تَوَالِيفَهُ تَوَالِفُ

اب تو ابن رشد کو یقین آگیا ہوگا کہ ⁂ اُس کے تالیفات تلف ہو جائینگے

يَا ظَالِمًا نَفْسَهُ تَأَمَّلْ ⁂ هَلْ تَجِدُ الْيَوْمَ مِنْ تَوَالِفْ

او اپنے حق میں کانٹے بونیوالے خیال تو کر ⁂ اب بھی کسی کو تو اپنا دوست دیکھتا ہے

چونکہ شماتت کے ساتھ بادشاہ کی خوشامد کے بغیر کچھ مزہ نہ تھا اسواسطے وہی شاعر یہ بھی لکھتا ہے

خَلِيفَةَ اللّٰهِ دُمْ لِلدِّينِ تَحْرُسُهُ ⁂ مِنَ الْعِدَىٰ وَتَقِيهِ شَرَّ شَرِّ فِئَه

اے خلیفۃ اللہ تو ہمیشہ سلامت رہ کہ دشمنوں سے دین کی ⁂ حفاظت کرتا ہے اور بدترین قوم کے شر سے اسے بچاتا ہے

فَاللّٰهُ يَجْعَلُ عَدْلًا مِنْ خَلَائِقِهٖ ۔ مُطَهِّرًا دِيْنَهٗ فِيْ رَأْسِ كُلِّ مِأَةٍ

خداوند عالم ہر قرن کے شروع میں اپنے بندوں میں سے ایک عادل کو ۔ مقرر کرتا ہے کہ اُس کے دین کو پاک و پاکیزہ کرے

خَلِيْفَةُ اللّٰهِ اَنْتَ حَقًّا ۔ فَارْقَ مِنَ السَّعْدِ خَيْرَ مَرْقًى

تو بے شک نائب ہے اللہ کا ۔ ہاں اقبال کے بلند ترین مقام تک چڑھتا ہوا چلا جا

حَمَيْتُمُ الدِّيْنَ مِنْ عِدَاهُ ۔ وَكُلِّ مَنْ رَامَ فِيْهِ فَتْقًا

تمھیں لوگوں نے دشمنوں کے ہاتھ سے ۔ اور اُس شخص سے جو رخنے ڈالنا چاہتا تھا دین کو بچالیا

اَطْلَعَكَ اللّٰهُ سِرَّ قَوْمٍ ۔ شَقُّوا الْعَصَا بِالنِّفَاقِ شَقًّا

وہ لوگ جو بے دین ہو کر دائرۂ اسلام سے ۔ نکل گئے تھے تجھے اُن کا پتہ لگ گیا

تَفَلْسَفُوْا وَادَّعَوْا عُلُوْمًا ۔ صَاحِبُهَا فِي الْمَعَادِ يَشْقٰى

فلسفی بنے تھے اور اُن علوم کے مدعی ہوگئے تھے ۔ جن سے آخرت خراب ہوتی ہے

وَاحْتَقَرُوا الشَّرْعَ وَازْدَرَوْهُ ۔ سَفَاهَةً مِنْهُمْ وَحُمْقًا

اپنی حماقت و نادانی سے شرع کو حقیر ۔ سمجھتے تھے اور نام رکھتے تھے

اَوْسَعْتَهُمْ لَعْنَةً وَخِزْيًا ۔ وَقُلْتَ بُعْدًا لَهُمْ وَسُحْقًا

تو نے جی بھر کے اُن پر لعنت کی اور ذلت دی ۔ اور کہا کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں

فَابْقَ لِدِيْنِ الْاِلٰهِ كَهْفًا ۔ فَاِنَّهٗ مَا بَقِيْتَ يَبْقٰى

دین کی حفاظت کے لئے تو سلامت رہے ۔ کہ تیری ہی سلامتی سے اُسکی سلامتی ہے

اور اسی قبیل سے اور بہت کچھ بکے گئے ہیں جس کا ذکر بیکار ہے

میدان فکر اور احاطۂ مضمون سے باہر ہے۔ غرض ابن رشد کے اخراج کی کتنی ہی تأویلیں کیوں نہ کی جائیں اصل حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ خلیفہ کو بعض اُمور نے اُس کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا حُسّاد نے موقع پاکر عیب چینیاں شروع کیں جس کسی کو کوئی بات جھوٹی یا سچی ہاتھ لگی جا کے امیر کے کانوں تک پہنچا آیا۔ امیر تو بدگمان ہو ہی چکا تھا الحاد کا بہانہ اُسے اچھا مل گیا چند فقہا کو جمع کر کے بہ علت زندقہ اس کے اخراج کا فتوے دلوا دیا اور اُس کے ساتھ ہی تمام مُلک میں منادی پٹوادی کہ کوئی علوم فلسفہ تحصیل نہ کرے اور تمام معقولات کی کتابوں کے جلا دینے کا حکم دیدیا۔ عجب نہیں ہے کہ جس طرح امیر حکم بن عبدالرحمن المستنصر باللہ کے بعد اس کے حاجب منصور نے عوام الناس کو اپنا طرفدار بنانے کے واسطے حکم کا کتاب خانہ جلوا دیا تھا اور علومِ عقلیہ کی تعلیم موقوف کرادی تھی اُسی طرح اس خلیفہ کو بھی جو اتفاقاً اس کا ہم لقب ہے یہی ضرورت پیش آئی ہو یعنے چونکہ خود اُس کو علومِ حکمیہ میں بہت توغل تھا اور حکمائے وقت کو اپنے دربار میں نہایت پیش پیش کر رکھا تھا اور ابنِ رُشد سے ابو یحییٰ اپنے بھائی کی دوستی کی وجہ سے بدگمان ہو ہی چکا تھا اور شاید اُس کے فضل اور کمال کا رشک بھی فی الجملہ

اس کے دل میں سما گیا تھا اس واسطے الحاد کے بہانہ کو اُس نے
غنیمت جانا کہ جس سے اوّل تو ابنِ رشد نکالا گیا اور دوسرے خود
اُس نے عوام الناس سے اپنی برات اور صیانت کا صداقت نامہ
حاصل کر لیا کیونکہ ہمیشہ سے عوام علما اور حکما کے دشمن ہیں۔
قصہ مختصر ابنِ رشد کا نکالا جانا گیا تھا کہ یکبارگی علم اور علما پر
نکبت آگئی اکثر فحول علمائے وقت ابنِ رُشد کے ساتھ شہر بدر کیے گئے
اور ترقی علم کا ستارہ غروب ہو گیا کہتے ہیں کہ عتابِ سلطان میں مبتلا
ہونے کے بعد ابن رشد کو قرطبہ سے نکالکر الیانہ میں رہنے کا حکم ملا تھا
چنانچہ ایک مدت تک وہیں مقیم رہا ابنِ رشد کے حساد اور دشمن کہتے
ہیں کہ یہہ شخص مجہول النسب بقول بعض یہودی الاصل تھا اس واسطے
بادشاہ نے اس کو الیانہ بھیجا کیونکہ الیانہ کے باشندے اکثر یہودی تھے
مگر تاریخ و اخبار سے اس قول کی بنا سوائے بغض اور حسد کے دوسری
نہیں پائی جاتی بلکہ ظاہر ہے کہ اگر یہودی الاصل ہوتا تو ہرگز خود اس کو
اور اس کے اجداد کو دار الخلافہ قرطبہ کی قضاءت کا عہدہ کبھی نہ ملتا۔
ابنِ ابی اصیبعہ لکھتا ہے کہ ابنِ رشد کے ساتھ ابو جعفر الذہبی اور
فقیہہ عبد اللہ محمد بن ابراہیم قاضی بجایہ اور ابو الرابع الکفیف و ابو العباس
الحافظ الشاعر القرائی بھی اس علت میں شہر بدر کیے گئے کہ علوم اولیہ

میں ان کو زیادہ توغل تھا۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ ابنِ رشد چار برس
تک معتوب رہا اور بعد چار برس کے ۵۹۵ھ میں بعض اعیانِ اشبیلیہ نے
بادشاہ کے حضور میں بیان کیا کہ ابنِ رشد درحقیقت ملحد نہیں ہے اور
لوگوں نے غلط اُسے متہم کیا ہے۔ منصور نے اس شہادت کو قبول کیا
اور ابنِ رُشد اور اُس کے ساتھ تمام علمائے مہاجر کو اپنے پاس مراکش
میں بلوالیا اور جو احکام علومِ عقلیہ کے بارہ میں جاری کئے تھے سب کو
منسوخ کردیا اور خود بھی بار دیگر ان علوم کی تحصیل میں مصروف ہوا۔
ابنِ رشد کو پھر اپنا مقرب بنایا اور ابوجعفر ذہبی کو جو ابنِ رُشد کی
ہجرت میں اُس کا رفیق تھا اور اُس کے ساتھ نکالا گیا تھا۔ تصنیفاتِ
طبّی و فلسفی کے واسطے مقرر کیا۔ اِن قرائن سے ظاہر ہے کہ
ابنِ رشد کے اخراج کا باعث وہ نہ تھا جو عوام میں مشہور ہو گیا تھا
بلکہ مصالحِ ملکی نے امیر کو اس تجویز پر مجبور کر دیا تھا و اِلّا قیاس سے
دور ہے کہ منصور جیسا عالم و حکیم چند حساد و متعصبین کے کہنے سننے سے
اپنے دربار کو فحول علمائے وقت سے خالی کر دے اور اُس کی
رونق مٹائے۔ دوبارہ دربار بادشاہی میں باریاب ہونے کے بعد
ابنِ رشد کو قضا نے زیادہ مہلت نہ دی۔ اسی سال پنجشنبہ کے دن
۹ صفر ۵۹۵ھ مطابق دسویں ڈسمبر ۱۱۹۸ع میں اس جہانِ فانی سے

رحلت کر گیا اور مراکش میں باب تاغزوت کے باہر تین مہینہ تک اسکی
لاش مدفون رہی بعد تین مہینے کے لوگ اُسے اُٹھا کر قرطبہ لے گئے
اور اپنے بزرگوں کے ساتھ مقبرۂ ابنِ عباس میں دفن کیا ابنِ رُشد کے
کئی فرزند تھے اور سب رشید۔ ابو عبد اللہ طبیب حاذق اور صاحب
تصانیف تھا جس کا ترجمہ ابن ابی اصیبعہ نے اپنے طبقاتِ اطبا
میں لکھا ہے۔ قاضی ابو القاسم اور ابو الحسین علومِ دینیہ میں فایق
اور صاحب رائے و اعتبار تھے ایک نصرانی مورخ نے روایت
کی ہے کہ ابو محمد عبد اللہ نے بادشاہِ آلیمان کے دربار میں رسوخ
پیدا کیا تھا مگر یہ قول پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اسی زمانہ میں تھوڑی
مدت کے فاصلہ سے تمام مشاہیر علمائے وقت دنیا سے اُٹھ گئے
یہ وہ لوگ تھے جن کا ثانی پھر کسی سرزمینِ اسلام میں نہ پیدا ہوا۔
ابن بیطار اور عبد الملک ابنِ زہر نے اسی سال میں قضا کی۔ ابنِ طفیل
پیش قدمی کر چکا تھا ابو بکر ابنِ زہر بھی تھوڑی ہی مدت اور جیا۔
عبد الواحد مورخ موحدین نے جس نے اسی ۵۹۵ھ میں مغرب و مراکش کا
سفر کیا تھا ابو بکر کو بہت ہی ضعیف اور زار گویا لب گور پایا۔
یادگارِ سلف فقط ایک ابنِ طفیل کا بیٹا مراکش میں باقی رہ گیا تھا
امیر یعقوب المنصور باللہ نے بھی ابن رشد کے مہینہ بھر بعد وفات

یائی شعر

روئے گل سیر ندیدیم وبہار آخر شد	حیف درچشم زدن صحبت یار آخر شد

منصور اپنے وقت کا ماہتابِ علم تھا اور یہ بزرگوار اُس کے دربار کے ستارے تھے تھوڑے ہی زمانہ میں نہ یہ علما رہے نہ منصور سا سرپرست رہا جہل کی تاریک گھٹا چاروں طرف چھاگئی اور عالمِ اسلام کو تیرہ وتار کر دیا اُس وقت سے تحقیق کا باب مسدود ہو گیا۔

علومِ عقلیہ سے لوگوں نے کنارہ کیا فلسفہ وحکمت کو وسوسۂ شیطانی سمجھنے لگے حکمائے سلف کی ہر طرف تکفیر ہونے لگی یہ سامان جہالت ممالکِ مشرقیۂ اسلام میں پہلے ہی پھیل چکا تھا ۵۸۰ھ میں خلیفہ مستنجد باللہ کے وقت میں کسی قاضی کے ہاں علوم معقول کی کتابیں جمع تھیں خلیفہ کے حکم سے بغداد میں جلادی گئیں خصوصًا ابو علی بن سینا کی کتابیں اور اخوان الصفا کے رسالے ۵۹۲ھ میں عبد السلام نام ایک ایک طبیب نامی گرامی تھا لوگوں نے اُس کو زندقہ سے متہم کیا اور بادشاہِ وقت کے حکم سے اُس کی کتابیں بڑے اہتمام سے جلائی گئیں اِس خدمت پر ایک بڑے مولوی صاحب مقرر ہوئے اول انھوں نے منبر پر بیٹھکر فلسفہ وحکمت کی مذمت میں کچھ کلمات فرمائے اُس کے بعد کتابیں طلب کیں ایک ایک جلد ہاتھ میں لیتے

اور کچھ کلمات اُس کی شناعت روایت میں بیان کرکے لوگوں کے سپرد کرتے تھے وہ اُسے فوراً الاوہ میں ڈال دیتے تھے موسیٰ بن میمون کا ایک شاگرد رشید بیان کرتا ہے کہ میں اُس حیرت انگیز موقع پر حاضر تھا جب ابن ھثیم کی کتابِ ہیأت قاضی صاحب کے ہاتھ میں آئی قاضی صاحب نے اُس بے گناہ کتاب کے حق میں بہت سے کلمات سخت وسُست کہہ کے اُسے آگ میں ڈلوا دیا۔ معلوم نہیں کہ اس قسم کے ستمگاروں کے ظلم سے کس قدر دولتِ علمی آگ میں جلی ہے اور خود قومِ عرب اور ملتِ حنیف اسلام کا کتنا بڑا نقصان ہوا۔

اندلس میں اس قسم کا ایک معرکہ بنی اُمیہ کے آخر زمانۂ دولت میں گذرچکا تھا خلیفہ الحکم ثانی المخاطب بالمستنصر باللہ بنی اُمیہ کے خاندان کا نواں خلیفہ ۳۵۰ھ میں اپنے باپ عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد قرطبہ کے تخت پر بیٹھا اس بادشاہ کے تفصیلی حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں سوائے حکمرانی اور جہانبانی کے علم کا اس کو اس قدر شوق تھا کہ تمام وقت اپنا کتاب بینی اور علما کی صحبت میں صرف کرتا تھا۔ ایک عربی مورخ لکھتا ہے کہ کوئی بادشاہ اسلام نہیں گذرا جس نے اس قدر کتابیں جمع کی ہوں اور علم کا استقدر

حریص ہو ہمیشہ علم کے رواج میں ساعی رہتا تھا طلبہ اور علماء کی
ہر طرح تحریص و ترغیب کرتا تھا اور دور دور انعام اور صلہ مصنفانِ
زمانہ کے پاس بھیجتا تھا غیر ملکوں میں علماء اور حکماء اس خلیفہ کی طرف
سے وظیفہ پاتے تھے ابو الفرج اصفہانی کے پاس ہزار دینار ذہب
بھیجے اور اُس سے ایک نسخہ کتاب الاغانی کا منگا لیا چنانچہ کہتے ہیں
کہ یہ بے نظیر کتاب خود عراق میں مشتہر ہونے نہ پائی تھی کہ اندلس میں
شایع ہو گئی اطراف و جوانب میں اس کی طرف سے کاتب مقرر
تھے جو کتاب نئی تصنیف ہوئی یا نادر ہاتھ لگی فوراً نقل ہو کے
قرطبہ بھیجی گئی ۔ اس کے کتاب خانہ کی فہرست چوالیس جلدوں میں
تھی اور باوجود اس کثرت کے اُس کی کتاب بینی کا یہ حال تھا کہ
کوئی کتاب اس کتاب خانہ میں ایسی نہ تھی جس کو اس نے اول سے
آخر تک مطالعہ نہ کیا ہو اور اُس کے سادہ ورق پر یا حاشیہ پر اپنے
خط سے مصنف کا حال اور نسب نامہ نہ لکھا ہو اس خلیفہ کے
زمانہ میں اندلس کتاب خانوں سے بھر گیا تھا ۔ اور شوق علم کا
چاروں طرف پھیل گیا تھا اور جیسا شوق اس کو علم کا تھا اُسی قدر
حلم و مروت و رعیت پروری بھی اس کی طبیعت میں سرشت تھی
اور تدین کا یہ حال تھا کہ باوجودیکہ انگور سے محاصلِ کثیر اس کی سرکار

میں آتا تھا چونکہ شراب بہت کثرت سے بننے لگی تھی الحکم نے حکم دیدیا تھا
کہ دوثلث زراعت انگور کی موقوف کردیجائے اور تاکستان مسمار
کر دئے جائیں اور فقط ایک ثلث کھانے اور رب بنانے کے
واسطے باقی رکھا جائے الحکم نے ۳۶۶ھ میں وفات پائی اور
اُس کا صغیر سن بیٹا ہشام تخت نشین ہوا اور محمد ابن ابی عامر
مدار المہام اور کار پرداز ہوا ابن عامر کے بارہ میں مورخین نے
بہت اختلاف کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ اس نے نمک حرامی
کی راہ سے تمام بڑے بڑے اُمراء کو کسی نہ کسی بہانہ سے مروا ڈالا
اور ساری حکومت خود اپنے اختیار میں کر لی اور ہشام کو برائے
نام تخت پر بٹھلا رکھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تدبیر ابن عامر نے ملک
اور دولت کی مضبوطی کے واسطے کی۔ غرض اس میں شک نہیں کہ
یہ شخص بڑا عاقل اور ذی ہوش اور جواں مرد اور باراے وتدبیر تھا
اس کے وقت میں حدود ملک کے بہت وسیع ہو گئے اور انتظام
بہت درست رہا جس غرض سے ابن عامر کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے
وہ یہ ہے کہ الحکم کے مرنے کے بعد اُس نے اس کے کتاب خانہ
میں سے تمام علوم معقول کی کتابیں نکالکر جلوا دیں اور علوم عقلیہ کا
درس تدریس بالکل موقوف کرا دیا اور سبب اس فعل کا وہی معلوم

ہوتا ہے جو ابنِ رُشد کے زمانہ میں المنصور کے ہاتھ سے کتابوں کی خرابی کا باعث ہوا یعنے ابنِ عامر کو مثل المنصور کے ضرور ہوا کہ عوام الناس کو خوش کرے اور جہلا کے قلوب کو اپنی جانب متوجہ کرے اور اُن کی جہالت سے کام لے تاکہ تدابیر ملکی میں خلقت اُس کی مددگار ہو۔

اس قصہ کے بیان کرنے سے اس قدر دکھانا مقصود ہے کہ جو اسباب ابنِ رشد کے زمانہ میں جمع ہوگئے اور علم وعلما کی کساد بازاری کے باعث ہوئے زمانہ سابق میں بھی ایک مرتبہ ایسا ہی سامان جمع ہوا تھا اور نتائج بھی اُس کے وہی مترتب ہوئے تھے واقع میں خود ملّتِ اسلام نے کبھی علم کے ساتھ دشمنی نہیں کی ہے بلکہ عوام کی جہالت اور سلاطین کی پولٹیکل ضروریات کبھی کبھی علم اور علما کے سر پر آفت لائی ہیں حقیقت میں مصداق الناس اعداء ما جھلوا علم وجہل میں تباین ہے اور عالم وجاہل میں سرشتی اختلاف ہے جاہل ہر قوم کے کالانعام ہوتے ہیں بلکہ اُن سے بھی گمراہ تر مسلمانوں میں اسلام کبھی علم کے مٹانے کا باعث نہیں ہوا بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح نصرانی بادشاہانِ اندلس نے دولتِ اسلام کے زوال کے وقت عربی کتاب خانے جلائے اور لاکھوں نسخے

برباد کردئے اور نصرانی فاتحانِ مصر نے رومیوں کی علمی دولت میں
آگ لگائی ویسا کبھی کسی مسلمان بادشاہ نے نہیں کیا اور نہ یورپ
کی طرح اختلافِ مذہب یا تفلسف کی وجہ سے لوگ زندہ آگ
میں جلائے گئے جو کچھ ظلم مسلمانوں کے ہاتھ سے علم وعلما پر ہوا
جہلا اور عوام الناس کے خاطر ہوا یا زوالِ دولت کے وقت جبکہ
دولت وحکومت خود ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو جاہل اور
عامی تھے اندلس میں ابنِ رشد کے قریب قریب زمانہ میں کئی واقعے
اس قسم کے گزرے ابنِ ماجہ ابن رشد کا اُستاد زندقہ کے اتہام میں
قید ہوا اور ابنِ رشد کے باپ قاضی القضاۃ قرطبہ کی سفارش سے
رہائی پائی ابن طفیل کو لوگ مخترع بدعتِ فلسفی کہتے تھے اور کہتے تھے
کہ ابنِ رشد اور موسیٰ بن میمون کو اسی حکیم کی تعلیم نے گمراہ کیا اس
خوف سے عبدالملک ابن واہب نے جو اشبیلیہ کا رہنے والا ابنِ ماجہ
کا معاصر اور اپنے وقت کا بڑا حکیم تھا علوم عقلیہ کی درس تدریس کو
ترک کردیا تھا چنانچہ اِن فنون میں جن میں وہ بڑا ماہر تھا ایک پرچہ
بھی اُس کے تصنیفات سے اُس کے بعد نہ ملا ابنِ حبیب اشبیلیہ کا
رہنے والا تفلسف کے جرم میں قتل کیا گیا ایک مشرقی مورخ ابن حبیب کا
ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اندلس میں فلسفہ اور حکمت سے بڑھی

نفرت ہے جن لوگوں کو ان فنون کا شوق ہے وہ بہت ہی پوشیدہ طور پر اُن میں توغل کرتے ہیں مطرف اشبیلی آج کل اس شغل میں مشغول ہے اور اپنے ہم شہریوں میں بدنام ہے مگر اپنی تصنیفات کبھی بھی کسی کو نہیں دکھاتا۔

ابن اصیبعہ ابو بکر ابن زہر کے ترجمہ میں لکھتا ہے کہ جب المنصور نے علوم عقلیہ کی تعلیم کو موقوف کرنے کا ارادہ کیا اور یہ قاعدہ جاری کر دیا کہ جو کوئی منطق یا فلسفہ کی کتابیں پڑھے پڑھائے یا اپنے گھر میں رکھے تو اُس سے مواخذہ کیا جائے اور اگر جرم ثابت ہو تو سخت سزا دیجائے اُس وقت اُس نے ابو بکر ابن زہر کو اس قانون کے اجرا کیواسطے مقرر کیا خوب معلوم ہے اور اس وقت کے لوگوں کو اور خود امیر کو خوب معلوم تھا کہ ابن زہر کا خاندان کا خاندان فلسفی تھا اور دو پشت سے یہ فن اِن کے گھر کا فن تھا خود ابو بکر ابن زہر بھی مثل اپنے چچا اور بھائی کے حکیم کامل تھا اگرچہ اس زمانہ میں مصلحةً ان علوم سے اپنا جہل ظاہر کرتا تھا۔ امیر المنصور کا ابن زہر کو اس خدمت کے واسطے تجویز کرنا میرے نزدیک خود دلالت کرتا ہے کہ امیر المنصور کی ساری کارروائی مصلحتِ وقت اور تدبیر مملکت پر مبنی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابن زہر نے فلسفہ اور حکمت کی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھکر جلائیں الا اپنے کتبخانہ کی

موسو رینان لکھتا ہے کہ دستور کے موافق اس رفتار کا نتیجہ یہ ہوا کہ
علما نے ظاہر پرستی اختیار کی اور اپنی مکتوبات کو چھپانے لگے۔
ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے کہ ہم کو ابو عباس احمد بن محمد بن احمد اشبیلی سے
یہ روایت پہنچی ہے کہ ابن زہر کے دو شاگرد طب کی کتابیں اُس سے
پڑھتے تھے ایک دن معمول کے موافق یہ دونوں طب کی کتابیں بغل
میں مارے ہوئے اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابن زہر نے
دیکھا کہ ایک کے ہاتھ میں ایک کتاب منطق کی بھی ہے فوراً لڑکے سے
چھین کر ایک کونہ میں ڈالدی اور لکڑی لیکر ان دونوں کے پیچھے
دوڑا مگر وہ اس دن ہاتھ نہ لگے اور کئی دن تک سبق لینے نہ آئے
بعد چند روز کے جب انھوں نے سمجھ لیا کہ اُستاد صاحب کا غصہ
فرو ہو گیا ہوگا پھر معمول کے موافق حاضر ہوئے اور عذر و معذرت
کرنے لگے کہ اُس روز بھولے سے ایسی بیہودہ کتاب ہم اپنے
ساتھ لائے تھے ہمیں خود نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر کیا لکھا ہے
ابن زہر بھی اغماض و تجاہل کر گیا اور اُن کا عذر قبول کر لیا اور پھر اُن کو
بدستور طب کا درس دینے لگا مگر اس قدر اضافہ کے ساتھ کہ ہر روز
دو ایک رکوع قرآن مجید کے اُن سے زبانی سُن لیا کرتا تھا اور تاکید
کر دیتا تھا کہ گھر پر پہنچکر اُن آیتوں کی تفسیر دیکھو اور سیرت نبوی کا

بھی مطالعہ کیا کرو۔ جب تھوڑے عرصہ میں شاگردان علوم میں مضبوط ہو چکے اُس وقت ابن زھر ایک دن وہی رسالہ منطق کا اپنے کتاب خانہ میں سے نکال لایا اور کہا کہ اب تم کو اس کتاب کا پڑھنا کچھ منع نہیں ہے اور اُن کا پڑھانا شروع کیا نفح الطیب میں لکھا ہے کہ اہل اندلس تمام علوم وفنون میں دوسری قوموں پر سبقت لے گئے تھے سوائے طبعیات اور ہیئت کے۔ اگرچہ اعلیٰ درجہ کے لوگ اِن دونوں فنون میں بھی پوشیدہ توغل رکھتے تھے مگر باعلان انکی تعلیم نہ ہوتی تھی کیونکہ عوام الناس اِن فنون کو بہت بُرا جانتے تھے اور اگر کہیں سُن پاتے تھے کہ فلاں شخص طبعیات یا ہیئت میں ماہر ہے تو فوراً کفر کا حکم اس پر لگا دیتے تھے اور انواع واقسام کی تکلیف پہنچاتے تھے کبھی خود سلطان کو بھی جہلا کی خاطر داشت کیواسطے اُن کی مرضی کے موافق علما کو ستانا اور اُن کی کتابیں جلانا پڑتا تھا جس طرح الحکم ثانی کے بعد المنصور نے بعض علما کو مروا ڈالا اور کتابیں جلوا دیں۔ حالانکہ الحجاری لکھتا ہے کہ خود المنصور اِن فنون کا بڑا شائق تھا رینان لکھتا ہے کہ اس قسم کی دشمنی علم کے ساتھ عوام الناس کو بہت مرغوب تھی اور علم دوست سلاطین بھی اکثر بہ مجبوری و بکراہت عوام کے خوش کرنے کے واسطے ایسے فعل کے مرتکب ہوا کرتے تھے

اور تتبع تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اندلس کے عوام اہلِ اسلام کے ساتھ
یہ صفت علم دشمنی کی مخصوص تھی بہ ظاہر اسبابِ اندلس کے نصاریٰ کی
صحبت سے مسلمانوں کو یہ بات حاصل ہوئی تھی کہ اندلس کے اصل باشندے
اُس وقت سے آج تک متعصب مشہور ہیں اور ہمیشہ علمی کتابوں کے
اور علماء کے ساتھ دشمنی کرتے آئے ہیں چنانچہ انتزاعِ سلطنت کے بعد
جب فرڈننڈ اور اس کی ملکہ ازابیلا ملک پر قابض ہوئے مسلمانوں کا
خزینہ اندوختہ اُن کے ہاتھ سے بہت کچھ تلف ہوا اور اسی ہزار
کتابیں ایک مرتبہ جلائی گئیں۔ ایک انگریزی مورخ کا قول ہے کہ اندلس
کے لوگوں کو متعصب ترین بادشاہان اسلام کے وقت میں جس قدر
آزادی حاصل تھی نصرانی بادشاہوں میں سے زیادہ سے زیادہ آزادمنش
اور علم دوست پادشاہ کے وقت میں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

ذکر مصنفات ابن رُشد بطور اجمال

ابنِ رُشد کے تصنیفات بہ کثرت ہیں اگرچہ آج کوئی ایک بھی اُن میں سے
ہمارے ہاتھ میں موجود نہیں ہے بعض کتابوں کا فقط نام ہی لے لینا
اس کے علم اور وسعتِ نظر کو بتائے گا۔

(۱) کتاب المقدمات فی الفقہ (۲) کتاب نہایۃ المجتہد

فی الفقه (۳) کتاب الکلیات فی الطب (۴) شرح الارجوزۃ السینائیہ (۵) کتاب الحیوان (۶) جوامع کتب ارسطاطالیس فی الطبعیات والالٰہیات (۷) کتاب الضروری فی المنطق (۸) تلخیص کتاب مابعد الطبعیہ لارسطاطالیس (۹) تلخیص کتاب الاخلاق لارسطاطالیس (۱۰) تلخیص کتاب البرہان لارسطاطالیس (۱۱) تلخیص کتاب السماء الطبیعی لارسطاطالیس (۱۲) شرح کتاب السماء والعالم لارسطاطالیس (۱۳) شرح کتاب الاسطقسات لجالینوس (۱۴) تلخیص کتاب المزاج لجالینوس (۱۵) تلخیص کتاب القوی الطبعیہ لجالینوس (۱۶) تلخیص کتاب العلل والاعراض لجالینوس (۱۷) تلخیص کتاب التعرق لجالینوس (۱۸) تلخیص کتاب الحساب لجالینوس (۱۹) کتاب تہافت التہافت فی الرد علی کتاب التہافت للامام الغزالیؒ (۲۰) کتاب منہاج الادلہ فی علم الاصول (۲۱) کتاب فصل المقال فی ما بین الحکمۃ والشریعۃ من الاتصال (۲۲) شرح کتاب القیاس لارسطاطالیس (۲۳) مقال فی العقل (۲۴) مقال فی القیاس (۲۵) مقال فی التعریف اس کتاب میں ارسطو

اور ابونصر فارابی کے منطقی تصنیفات کا مقابلہ کیا ہے (۲۶) اتصال العقل بالانسان - میں دو کتابیں ایک کتاب میں اپنے اور ابنِ طفیل کے مراجعات اور مناظراتِ طبی درج کئے ہیں (۲۷) مسئلہ فی المزاج (۲۸) مسئلہ فی الزمان (۲۹) مسئلہ فی نوائب الحمی (۳۰) مقال فی الحمیات العفنیہ (۳۱) مقال فی حرکت الفلک -

سوائے اِن کے اور بہت سی کتابیں ہیں منطق اور فلسفہ اور عربیت کے فنون میں جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں ارسطو کی کتابوں کی کسی نے اس تفصیل وبسط کے ساتھ شرح نہیں کی جس طرح ابنِ رشد نے کی اور انہیں شروح ہی کے باعث اس کے نام کو زیادہ فروغ ہوا اگرچہ ہر فن میں اس حکیم اسلامی نے متعدد کتابیں لکھی ہیں یورپ کے فلاسفہ کا مدت تک یہ مقولہ تھا کہ طبیعت کا ترجمان ارسطو ہے اور ارسطو کا ترجمان ابن رُشد- ارسطو کے کتابوں پر ابنِ رشد نے تین طرح کی شرحیں لکھی ہیں اول شروح بسیطہ اِن شروح میں متن کے ہر فقرہ کو الگ نقل کر کے اُس کی شرح کرتا ہے اور تمام مالہٗ وما علیہ کو بیان کرتا ہے دوم شروح متوسطہ جن میں اس قدر شرح وبسط نہیں ہے اور تمام متن نقل نہیں کیا ہے - یہ شرحیں ابنِ رشد کی کم سنی کے تصنیفات سے ہیں سوم ملخصات اِن میں متن سے مطلق تعرض نہیں

بلکہ علومِ فلسفہ کی کتابیں ہیں جنھیں ابن رشد خود مطالب بیان کرتا ہی
اور کسی کا حوالہ نہیں دیتا۔ اپنے شروح میں اسکندر افریدوسی تھمٹیس
نیقولاوس اور ابنِ سینا اور ابنِ باجہ کے اقوال اکثر نقل کرتا ہے۔
اور ردّ و قدح وجرح وشرح سے کوئی صفحہ خالی نہیں چھوڑتا۔
کہتے ہیں کہ ابن رشد یونانی زبان سے ناواقف تھا اور ارسطو کی
کتابوں پر اُسے اطلاع نہیں ہوئی الاحنین بن اسحاق واسحاق بن حنین یا
یحییٰ بن عدی وغیرہ کے ترجموں سے اور یہ ترجمہ خود سریانی ترجموں سے
ترجمہ ہوئے تھے۔ چنانچہ اس تعدد وسائط کے سبب جا بجا ابن رشد
سے غلطیاں بھی واقع ہوئی ہیں مثلاً پروٹاگوراس کو فیثاغورس سمجھتا ہے
ہر اقلیتس اور ہر قولین میں فرق نہیں کرتا اور سقراط کو اس فرقہ میں شمار
کرتا ہے اناگورس یونانی کو لاطینی فلسفہ کا امام بتاتا ہے مگر جو دقتیں
اور زحمتیں ابنِ رشد کو ارسطو کی کتابیں پیدا کرنے میں پیش آئی ہیں
اُس سے زیادہ اب ہم کو ابنِ رشد کی کتابیں پیدا کرنے میں درپیش
ہیں ارسطو کی کتابیں تو یونانی زبان میں موجود تھیں مسلمانوں نے
یونانی زبان کے سیکھنے کی طرف کبھی توجہ نہ کی ابنِ رشد کی اصلی
کتابیں ہی مفقود ہیں عربی سے عبری اور عبری سے لاطینی میں
جس قدر ترجمہ ہوئی تھیں یورپ کے کتب خانوں میں دستیاب

ہوئی ہیں اصل عربی نسخے اکثر تصنیفات کے نہیں ملتے۔ ابنِ رشد
کی وفات کے بعد اگرچہ مسلمانوں میں علوم فلسفی کی تعلیم موقوف
ہوگئی اور علم کا چرچا اُٹھ گیا پر یہودیوں نے جو اُس وقت بڑے
علم دوست تھے اس کی کتابوں کو عبری میں ترجمہ کرکے عالم میں منتشر
کیا اور یورپ کے لوگوں کو ابنِ رشد سے اس قوم کی معرفت واقفیت
حاصل ہوئی۔ میکائیل اسکاٹ یورپ کے لوگوں میں اول شخص تھا
جس نے طلیطلہ میں جاکر ابن رشد کی کتابیں بہم پہنچائیں اور جرمنی
کے بادشاہ کے ہاں لے گیا اُس کے بعد بہتیرے فلاسفہ یورپ
ابنِ رشد کے پیرو ہوئے بعضوں نے اُس سے مخالفت بھی کی
ٹامس اکوئیناس ایک بڑا نامی متکلم مذہب عیسائی کا گزرا ہے۔ اس
شخص نے ساری عمر اپنی ابن رشد کی رد میں صرف کی مگر وہ بھی
اپنے خصم کا عزت وحرمت سے نام لیتا ہے اور اُس کے علم کی
داد دیتا ہے ایک بڑا شاعر اٹالی کا اپنے کلام میں اقلیدس اور
بطلیموس اور جالینوس وغیرہ حکما کے زمرہ میں اس کا نام لیتا ہے
اور انگلستان کا پیشوائے شاعران چاسر بھی ابنِ رشد کو بڑے
بڑے لوگوں کے ساتھ شمار کرتا ہے چودھویں صدی عیسوی
کے اوایل میں ریمانڈ للی نے عربی زبان سیکھی اور منطق کا فن

حاصل کیا فقط اس غرض سے کہ ابنِ رشد کی تردید کرے جس کو اُس کے عصر میں اور اس کے بعد دوسو برس تک یورپ کے متکلم مذہب عیسائی کا سب سے بڑا دشمن شمار کرتے تھے للی تو اُس کو گالیاں تک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ سگ ہے کہ ہمیشہ حضرتِ عیسیٰ مسیح پر بھونکا کرتا ہے مگر ایک فرقہ عیسائیوں کا جو بہ لقب فرانسکن مشہور تھا ابنِ رشد کا بڑا معتقد تھا کیونکہ یہ وہ فرقہ ہے جو اُس زمانہ کے عیسائی تعصبات کو ناپسند کرتا تھا۔ باقی کل عیسائی مذہبی فرقے اُس کے دشمن تھے اور اُس کے نام کو شیطان کے نام کے برابر سمجھتے تھے اور دین و مذہب کا اور خدا و عیسیٰ مسیح کا دشمن جانتے تھے بلکہ وہ تو کل مسلمانوں کو ایسا ہی سمجھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ یہ ایک وحشی خونخوار بے دین بت پرست قوم ہے جس سے احتراز ضرور ہے۔ جب صلاح الدین کے زمانہ میں یورپ کے اکثر بادشاہوں نے شام پر حملہ کیا اور مسلمانوں سے مدت تک مقابلہ رہا اور اُن کی جوانمردی اور علم و ہنر و اخلاق پر اہلِ یورپ کو اطلاع ہوئی اُس وقت سے اُن کی آنکھیں کھل گئیں اور یہ عام نفرت کم ہوتی گئی یہاں تک کہ مسلمانوں کے علوم و فنون کی طرف اُن کو میلان پیدا ہوا چنانچہ منجملہ اور اسباب کے صفحاتِ یورپ پر

ترقی کا یہ بھی ایک سبب ہوا یہاں تک کہتے ہیں کہ فریڈرک ثانی نے اپنے دربار میں بہت سے عرب علما جمع کئے تھے اور عربوں کے لباس و عادات کا بھی حتی الوسع تتبع کرتا تھا۔ جس طرح اس زمانہ میں ہم اور ہمارے سلاطین و اُمراء اہل یورپ کے لباس و طریقۂ معاشرت کا تتبع کرتے ہیں مصرع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

سترھویں صدی تک اٹالی کے ایک بڑے دارالعلوم میں ابنِ رشد کو لوگ خود ارسطو سے زیادہ مانتے تھے اور دن رات اُسی کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے کہتے ہیں کہ ایک دن پٹرارک شاعر کے ہاں کوئی طالبِ علم ملاقات کو آیا اثناء گفتگو میں پٹرارک نے پولوس کا کوئی قول نقل کیا یہ طالبِ علم جھنجلا کر بولا کہ اپنے پولوس اور اغسطین کو تہ کر رکھو ہمارا اُستاد ابنِ رشد ہے تم اگر ابنِ رشد کی کتابیں پڑھو تو اور سب کو بھول جاؤ افسوس ہے کہ ایسے بڑے حکیم کا نام تک ہمارے ہاں کسی کو معلوم نہیں ہے نہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں نہ ابنِ خلکان نے وفیات الاعیان میں اس حکیم کا ذکر کیا ہے۔ صفدی کے کتاب میں اس کا نام بھی نہیں ہے جمال الدین قفطی نے بھی اپنی تاریخ فلاسفہ میں اُسے چھوڑ دیا ہے

یافعی نے فقط اس قدر لکھا ہے کہ ۵۹۵ھ میں اُس نے وفات پائی
اور عام طور پر یہ لکھ گیا ہے کہ اُس کی چند تصنیفات ہیں غرض کہ ابنِ رشد
کا اگرچہ ہماری مشرقی کتابوں میں کسی نے نام تک بہ مشکل لکھا ہے۔
یورپ میں اُس کے علم کا اثر آج تک موجود ہے اور گو ہم خود اپنے
قوم کے بڑے بڑے محسنوں کی قدر نہ کریں غیر قومیں محض علم کی تلاش
میں اُن لوگوں تک پہونچی ہیں اور اُن کی تصنیفات سے متمتع
ہوئی ہیں اور اُن کا شکر نعمت آج تک ادا کرتی ہیں۔

اس کنیت کے دو بڑے نامی گرامی حکیم اور طبیب اندلس میں گزرے ہیں یہ دونوں ابن رشد کے معاصر اور دوست تھے۔ ایک عبدالملک ابنِ زہر اور دوسرا اُس کا بیٹا محمد ابو بکر بن زہر۔ اِن دونوں نے خلفائے موحدین کے زمانۂ حکومت میں بڑا نام پیدا کیا اور فن طبابت میں سرآمد اطباء وقت گنے جاتے تھے۔ یورپ کی زبانوں میں یہ دونوں حکیم (اونزور) کے نام سے مشہور تھے۔ چونکہ ابنِ زہر کے گھرانے میں اور بھی بڑے بڑے نامی گرامی لوگ گزرے ہیں بلکہ سات پشت تک ہر فرد اس خانوادہ کا فرد اکمل پیدا ہوا ہے اس واسطے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حکیم کا ترجمہ لکھنے سے پیشتر کچھ سرسری احوال اس کے خاندان کا لکھا جائے جس کے فضل و کمال اور شہرت کی طرف اشارہ کر کے کسی شاعر بذلہ سنج نے بطور مطائبہ کہا ہے۔

قل للوبا انت وابن زهر دبا سے کوئی اتنا کہدے کہ تو اور ابن زہر	جاوزتما الحد فی النکایة دونوں نے تباہی کی حد کر دی ہے
ترفقا للوری قلیلاً تم دونوں ذرا تو لوگوں پر رحم کرو	فواحد منکما کفایة اتنا تو سمجھو کہ تم میں سے تو ایک ہی بس ہے

(زہر) نام ایک شخص یہودی الاصل اشبیلیہ کا رہنے والا جو اسلام سے
مشرف ہوا تھا اس خاندان کا بانی ہے۔

(۱) زہر کا پوتا محمد ابن مروان ابن زہر الایادی اول شخص اس
خاندان کا ہے جس نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ محمد نے مقام طلبیرہ
میں سنہ ۴۲۱ھ مطابق سنہ ۱۰۳۰ع میں وفات پائی۔

(۲) محمد کا بیٹا عبدالملک ابو مروان بھی طبیب تھا اپنے فن کی
تکمیل کے واسطے سفر اختیار کیا اور قیروان اور قاہرہ اور بغداد میں
مدت تک مطب کرتا رہا اور اُن مقامات میں بڑا نام پیدا کیا۔ سیر و
سیاحت کے بعد اپنے وطن اصلی یعنے اندلس کو واپس آکر شہر دانیہ
میں قیام اختیار کیا اور وہاں کے حاکم مجاہد صقلبی کے دربار کا طبیب
مقرر ہوا ابن خلکان لکھتا ہے کہ عبدالملک نے اسی شہر میں وفات
پائی مگر ابن ابی اصیبعہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقام
وفات اشبیلیہ تھا تاریخ وفات ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں مگر قیاس ہے یہ
کہ قریب قریب سنہ ۴۷۰ھ کا یہ واقعہ ہے۔

(۳) عبدالملک کے بیٹے زہر ابو العلا نے بھی اپنے پدر بزرگوار
کے قدم پر قدم رکھا اور اپنے آبائی فن میں بڑی دستگاہ حاصل کی
اور ابو عمرو عباد المعتضد باللہ حاکم اشبیلیہ کا وزیر اور طبیب مقرر رہا

ابنِ ابی اُصیبعہ اس کی وفات کا زمانہ ۵۲۶ھ لکھتا ہے مگر ابنِ خلکان اس کو ایک سال بیشتر کا واقعہ بتاتا ہے ۔

(۴) عبدالملک ابو مروان اس کا بیٹا بھی اپنے فن میں بڑا حاذق تھا چھوٹی سی عمر میں ابراہیم ابنِ یوسف ابنِ تشفین آخر خلفاء مرابطین کے گھر کا طبیب مقرر ہوا - اور خاندانِ مرابطیہ کی بربادی کے بعد عبدالمؤمن کے دربار میں اُسی خدمت سے سرفراز ہوا اور بالآخر درجۂ وزارت کو پہنچا بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عبدالملک یہودی المذہب تھا مگر یہہ گمان غلط ہے اس کی تصنیفات بہت ہیں ایک تیسیر فن طبابت کی بڑی معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی تھی اول زبانِ عبری اور پھر زبانِ عبری سے لاطینی میں ترجمہ ہوئی اور پندرھویں صدی مسیحی میں مملکتِ اٹالی میں چھاپی گئی اس حکیم نے ۵۵۷ھ میں شہر اشبیلیہ میں وفات پائی -

(۵) محمد ابو بکر ابنِ عبدالملک الحفید کے لقب سے مشہور ہے کیونکہ اس کے پردادا کا نام اور کنیت بھی محمد ابو بکر ہے یہ حکیم اور ابنِ رشد دونوں عبدالمؤمن کے دربار کے طبیب تھے محمد الحفید اپنے آبائی فن کے علاوہ فقیہ اور شاعر بھی تھا مورخین اس شخص کو خاندانِ زہر کا تاج گنتے ہیں ابنِ ابی اُصیبعہ کی روایت سے اس حکیم نے ۵۹۶ھ ہجری م ۱۱۹۹ع یا سنہ ۱۲۰۱ع میں وفات پائی مگر ایک مورخ نے ۲۱ ذیحجہ ۵۹۵ھ

لکھا ہے اس کی پیدایش کی تاریخ سنہ ۵۰۷ھ ہی یہ حکیم اور اس کا باپ
عبدالملک آوِنزُور کے نام سے یورپ میں مشہور ہیں -

(۶) عبداللہ ابو محمد ابن الحفید کی ولادت سنہ ۵۷۷ھ میں بمقام
اشبیلیہ اور وفات سنہ ۶۰۲ھ میں آفریقیہ میں مذکور ہے اس نے بہت
تھوڑی عمر پائی اور کہتے ہیں کہ مسموم مرا - یہ بھی اپنے فن میں مشہور تھا
عبداللہ نے دو خلف چھوڑے - ابو مروان عبدالملک اور ابو العلا محمد
ابو مروان نے بڑی شہرت پائی اور بہت تصنیفات چھوڑے -

یہاں تک زہر کے خاندان کا حال مختصر طور پر بیان ہو چکا - اب
کسی قدر تفصیل کے ساتھ عبدالملک ابن زہر چہارم سلسلہ کے حالات
ابن خلکان اور ابن ابی اصیبعہ کی عبارت سے ترجمہ کئے جاتے ہیں

عبدالملک ابن زہر

عبدالملک ابنِ زہر نے اپنے پدرِ بزرگوار سے اپنا آبائی فن سیکھا اور آخر چل کے اپنے بزرگوں اور اپنے ہمعصر اطبا پر سبقت لیگیا اسکی تشخیص اور اس کے نسخے دور دور تک مشہور تھے ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ ابن تیومرت نے جب مرابطین کی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اُس کی وفات کے بعد خلیفہ عبدالمومن اس کا جانشین ہوا اور آفریقہ سے اندلس آیا تو یہاں اس علم دوست بادشاہ نے منجملہ اور علما کے ابنِ زہر کی بھی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے دربار کا طبیب مقرر کیا اور بہت کچھ انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ ابنِ زہر نے عبدالمومن کے واسطے ایک معجون مرتب کی تھی جس میں ستر جز شریک تھے اور تریاقِ سبعینی کہی جاتی تھی پھر اس نے اپنے نسخہ کے اجزا اکٹھا کر کے دس جز رکھی اور اُس کے سات جز رکھی جو تریاق الانتلہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ابوالقاسم معاجنی اندلسی سے روایت ہے کہ ایک دن خلیفہ عبدالمومن نے ابنِ زہر سے فرمایش کی کہ مجھے ایک خفیف سی مسہل

کی ضرورت ہے - ابن زہر نے اسی وقت باغ میں جاکر ایک انگور
کی بیل کو چاروں طرف سے کھدوایا اور پانی میں کچھ دوا ملاکر سینچنا
شروع کیا دوا کا اثر ساری بیل میں دوڑ گیا یہاں تک کہ انگور کے
خوشوں میں بھی سرایت کر گیا ابن زہر اُس وقت ایک خوشہ توڑ کر
بادشاہ کے پاس لیگیا یہاں انگوروں کے تیار ہونے تک بادشاہ کو
بخار آگیا تھا ابنِ زہر نے بادشاہ کو خوشہ دیکر کہا کہ اسے نوش جان
فرمائیے بادشاہ نے دس انگور کھائے ابنِ زہر نے عرض کیا کہ بس
یا امیر المومنین یہ دس انگور کافی ہیں انشاء اللہ اتنی ہی اجابتیں ہونگی
چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ کا مزاج درست ہو گیا -

نقل ہے کہ ایک دن ابنِ زہر اشبیلیہ میں بادشاہ کے دربار کو
جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں ہمام ابوالخیر کے پاس ایک مریض سے
دوچار ہوا جس کا زرد رنگ اور ہر دم کا کراہنا صاف بتاتا تھا کہ
یہ شخص مستسقی ہے ابن زہر اس کے ساتھ ساتھ مکان تک گیا اور
وہاں بہ تفصیل احوال پوچھکر نبض دیکھکر چاہتا تھا کہ نسخہ لکھے کہ یکایک
اس کی نظر ایک گھڑے پر پڑی کہ بستر کے سرھانے رکھا ہوا تھا -
دریافت سے معلوم ہوا کہ مدت سے یہ گھڑا یہیں رکھا ہوا ہے اور
مریض اسی کا پانی پیتا ہے - ابنِ زہر نے کسی نوکر سے کہا کہ اس گھڑے کو

توڑ ڈالو۔ گھڑا جو ٹوٹا تو اُس کے اندر سے ایک بہت بڑا مینڈک نکلا۔
جس نے بظاہر اُسی گھڑے میں پرورش پائی تھی۔ ابن زھر اُٹھ کھڑا ہوا
کہ اب نسخہ لکھنے کی حاجت نہیں رہی تم یونہی اچھے ہو جاؤ گے۔
آج تک جو تم پانی پیا کرتے تھے وہ تمھارے حق میں زہر تھا۔

کہتے ہیں کہ ابنِ زھر کا ہمعصر آلفار نام ایک بڑا طبیب اشبیلیہ میں تھا
جس نے ایک کتاب مفردات ادویہ کے بیان میں دو جلدوں میں
تصنیف کی تھی۔ حکیم صاحب ہمیشہ ابنِ زھر سے کہا کرتے تھے کہ دیکھو
انجیر نہ کھایا کرو ورنہ کسی روز سرطان کا مرض تم کو ہلاک کریگا ابنِ زھر کو
انجیر سے بڑی رغبت تھی خوب کھایا کرتا تھا آلفار سے کہا کرتا تھا کہ تم
اپنی خبر لو انجیر سے پرہیز کرتے ہو قبض میں مبتلا رہو گے اور کسی روز
تپ تمھاری جان لیگی طرفہ ماجرا ہے کہ آخر کار آلفار تپ اور قبض سے
ہلاک ہوا اور ابن زھر سرطان سے۔

مرض الموت میں ابنِ زھر نے بہت کچھ علاج کیا مگر جب کچھ اثر
نہ ہوا تو اُس کے بیٹے ابوبکر نے ایک نسخہ تجویز کیا ابنِ زھر نے
کہا کہ بیٹا اب نسخہ بیکار ہے موت کی کوئی دوا نہیں۔ کوئی دقیقہ اُٹھا
نہیں رکھا مگر کوئی شئی کارگر نہیں ہوتی خدا کا حکم کون ٹال سکتا ہے۔
ابنِ زھر نے ۵۵۷ھ مطابق ۶۲-۱۱۶۱ع میں وفات پائی۔ اور باب الفتح

کے باہر دفن ہوا۔ ابن زہر کے مشہور شاگردوں میں ایک ابو الحسن ابن اسدون ہے جو المصدوم کے لقب سے مشہور ہے ابن ابی اصیبعہ نے اُس کا بھی ترجمہ اپنے طبقات میں لکھا ہے۔

ابن زہر کے مصنفات بہت ہیں مشہور کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں کتاب التیسیر فی المداواۃ والتدبیر۔ کتاب الاغذیہ۔ کتاب الزینیہ۔ اس میں فقط مسہلات کا ذکر ہے کتاب الامراض۔ رسالہ فی البرص والبھق۔ کتاب التذکرہ کتاب التیسیر کا ترجمہ اٹالی میں بار بار چھپا ہے اور وہاں کے اطبا نے اسکی شرح بھی کی ہے جو ۱۲۸۰ء میں چھاپی گئی۔ ابن رشد کے ترجمۂ احوال میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ کتاب ابن زہر نے ابن رشد کی فرمایش سے لکھی تھی اور غرض اس تصنیف سے یہ تھی کہ ابن رشد کی کتاب الکلیات کے ساتھ ملکر فن طبابت کا پورا مجموعہ بن جائے۔

ابو بکر بن زہر

ابو بکر محمدؐ بن مروان ابن ابی العلا ابن زہر۔ میانہ قد صاف رنگ بڑا
مضبوط زور آور قوی الجثہ آدمی تھا بڑی عمر کو پہنچکر مرا۔ اور آخر وقت تک
سارے قویٰ برقرار اور حواس خمسہ صحیح و سالم لے گیا فقط سماعت میں
کسی قدر فرق آگیا تھا۔

فقہ اور حدیث کو اس حکیم نے عبد الملک الباجی سے حاصل کیا اور
طب وغیرہ اپنے پدر بزرگوار عبد الملک ابن زہر سے اور اِن علوم میں
ایسی مہارت اور ایسا کمال پیدا کیا کہ اپنے تصنیفات سے اپنے زمانہ
کے مبلغ معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر گیا اِن علوم کے علاوہ فنونِ
ادبیہ عربیہ میں بھی اُسے بڑی دستگاہ تھی اور حافظِ کلام اللہ تھا اور شعر
بھی خوب کہتا تھا اور بیان بھی اُس کا بہت فصیح و بلیغ تھا۔

ابو الخطاب ابنِ وحیہ نے اپنی کتاب (المطرب فی اشعار اہل المغرب)
میں لکھا ہے کہ ذو الرمہ کا کلام اس کو حفظ یاد تھا اور حکیم اور طبیب ہونیکے
علاوہ بڑا ادیب تھا کچھ کلام بھی اس کا نقل کیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروار
اشعار ذیل سے اُس کے کلام کی رشاقت اور حلاوت کا اندازہ

ہو سکتا ہے :۔

وموسدین علی الاکف خدودہم ۔ قد غالهم نوم الصباح وغالنی

گالوں کے نیچے ہاتھ رکھے ہوئے سب سکتے پڑے ہیں ۔ صبح کی نیند نے اُن کو بھی بے خبر کر دیا اور مجکو بھی

مازلت اسقیهم واشرب فضلهم ۔ حتی سکرت ونالهم ما نالنی

میں اُن کو پلاتا رہا اور اُنسے بچی ہوئی شراب پیتا رہا ۔ آخر بیہوش ہوگیا اور جو حال میرا ہوا ایسی اُنکا بھی ہوا

والخمر تعلم حین تاخذ ثارها ۔ انی املت اناءها فامالنی

شراب اپنا بدلہ خوب لے لیتی ہے ۔ ۔ ۔ میں نے شیشہ کو بار بار جھکایا تھا اُس نے بھی مجھ کو گرا دیا

اپنے ایک بہت ہی صغیر سن بچے کے اشتیاق میں لکھتا ہے ۔

ولی واحد مثل فرخ القطا ۔ صغیر تخلف قلبی لدیه

میرا ایک ننھا سا بچہ ہے جیسے چڑیا کا چینچلا ۔ میرا دل اُسی میں لگا ہوا ہے ۔ ۔

نأت عنه داری فیا وحشتی ۔ لذاك الشخیص وذاك الوجیه

میں اُس سے دور جو ہوگیا ہوں تو کیا دم گھبرا رہا ہے ۔ اس کی پیاری پیاری صورت کے خیال میں

تشوقنی وتشوقته ۔ فیبکی علیّ وابکی علیه

مجھے اُس کا اشتیاق اُسے میرا اشتیاق ۔ وہ میرے لئے روتا ہے میں اُسکے لئے روتا ہوں

لقد تعب الشوق ما بیننا ۔ فمنه الیّ ومنی الیه

ہم دونوں کے بیچ میں شوقِ ملاقات کس کشمکش میں گرفتار ہے ۔ اُس کو میرا شوقِ ملاقات ہے مجھے اُس کا

مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اشعار ذیل میری قبر پر کندہ کر دئے جائیں

تامل بحقك يا واقفا	ولاحظ مكانا دفعنا اليه
اے قبر پر کھڑے رہنے والے تجھے قسم ہے	ذرا غور تو کر کہ ہم کس گڑھے میں ڈالدئے گئے ہیں
تراب الضريح على وجنتي	كاني لم امش يوما عليه
یہ خاک میرے رخساروں پر اسطرح سے پڑی ہوئی ہے	کہ شاید میں کبھی اس پر چلتا پھرتا نہ تھا
اداوي الانام حذار المنون	وها انا قد صرت رهنا لديه
میں خوف موت سے لوگوں کا علاج کیا کرتا تھا	اب میں خود ہی اُس کے پنجہ میں پھنس گیا ہوں

ابو بکر بن زھر اپنے پدر بزرگوار کی رفاقت میں سلطان ابراہیم بن یوسف بن تشفین المرابطی کا طبیب تھا اور اس خانوادہ کی بربادی کے بعد ابن رشد کی شرکت میں عبدالمومن کے دربار کا طبیب مقرر رہا۔ موحدین کے خاندان میں چار پشتوں تک اس منصب سے سرفراز رہا اور خلیفہ عبداللہ محمد الناصر کے زمانہ میں نوے برس کے سن کو پہنچکر ۵۹۶ھ میں مراکش کے مقام میں اس جہانِ فانی سے گذر گیا رحمۃ اللہ علیہ ابو بکر کی تشخیص اور حذاقت کا سارے یورپ میں شہرہ تھا۔ تریاقِ خمسینی اس کی ترتیب دادہ ایک معجون تھی بعض موقعوں پر اپنے پدر بزرگوار کے نسخوں پر بھی اصلاح کیا کرتا تھا اور وہ حکیم اس کی رائے کو تسلیم کر لیا کرتا تھا۔

ابو بکر کی سخاوت اور دوست پرستی کی ایک نقل قاضی ابو مروان

الباجی کے زبانی منقول ہے کہ ابو بکر ایک دن اپنے دوست کیساتھ شطرنج کھیل رہا تھا اُسے کچھ متفکر و متردد پاکر فکر و تردد کا سبب پوچھا اُس نے جواب دیا کہ میری بیٹی کی شادی ہوگئی ہے کل اُس کے رخصت کا دن ہے تین سو دینار صرف ہوں گے میرے پاس ٹکا بھی نہیں ہے میں اس فکر میں ہوں کہ تین سو دینار کس کے گھر سے لاؤں ابو بکر نے کہا کیا مضایقہ بازی تو تمام کرو میرے پاس پانچ کم تین سو دینار اس وقت موجود ہیں تمھاری نذر کرتا ہوں شطرنج گردانے کے بعد ابو بکر نے پانچ کم تین سو دینار کا توڑا اپنے دوست کے حوالہ کیا۔ کئی دن کے بعد وہ دوست پھر ابو بکر کی ملاقات کو آیا اور پانچ کم تین سو دینار واپس لایا اور بیان کیا کہ میں نے ایک زیت کا باغ اپنا سات سو دینار کو بیچا ہے تمھاری عنایت سے عین وقت پر میرا کام نکل گیا۔ اب یہ رقم حاضر ہے میری حاجت روا ہوگئی ابو بکر نے کہا اس رقم کو تم ہی اپنے صرف میں لاؤ میں نے دیتے وقت یہ نیت نہیں کی تھی کہ تم سے واپس لونگا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی عنایت و مہربانی ہے خدا کے فضل سے اب مجھے احتیاج باقی نہیں ہے اور میں کبھی پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے احسان کا بار اپنی گردن پر لوں جس کا عوض مجھ سے نہ ہو سکے۔ ابو بکر نے کہا میں تمھارا دوست ہوں یا دشمن دوست بولا کہ یہہ کیا

فرماتے ہو تم میرے بڑے عزیز دوست ہو ابو بکر نے کہا کہ اگر میں تمھارا
دوست ہوں تو میرا مال تمھارا مال اور تمھارا مال میرا مال ہے پس کیا جائے
تامل ہے اس پر بھی جب اس کے طرف سے تامل ہوا تو ابو بکر نے
جھنجلا کر کہا کہ اگر تم نہ قبول کروگے تو آج سے میری تمھاری ملاقات
ترک ہو جائے گی۔ آخر بہ مجبوری اُسے وہ ہدیہ قبول کرنا پڑا۔
ابن رشد کے ترجمہ میں بیان ہو چکا ہے کہ امیر المنصور نے معقولات
اور حکمت کی کتابیں تلف کرنے کے واسطے ابن زھر کو مقرر کیا تھا
اگرچہ امیر خوب جانتا تھا کہ اس کا کتب خانہ معقولات کی کتابوں سے
مالامال ہے اور یہ خود علوم عقلیہ کا بڑا شایق ہے۔ ابو بکر ابن زھر بادشاہ
کے حکم بجالانے میں بڑی سرگرمی سے مشغول ہوا ڈھونڈھ ڈھونڈھکر
معقولات کی کتابیں جلائیں اس وقت اشبیلیہ میں ایک شخص رہتا تھا
جسے ابن زھر سے عداوت تھی اور ہمیشہ اُس کے درپے رہا کرتا تھا۔
اس فتنہ پرداز کو یہ مشغلہ سوجھا کہ ایک محضر تیار کیا اُس پر اپنے دستخط کئے
اور چند اپنے دوستوں کے بھی دستخط کرائے مضمون محضر کا یہ تھا کہ ابن زھر
خود معقولات کی تحصیل اور تفتیش میں مصروف رہا کرتا ہے اور اس فن
کی کتابیں اُس کے کتب خانہ میں بہت ہیں عرضی دستخط کرا کے امیر کے
حضور میں گذرانی اُس روز خلیفہ حصن الصرح میں مقیم تھا جو ابو بکر کے

مشورہ سے بادشاہ کے تفرج کے واسطے تعمیر ہوا تھا۔ عرضی وہیں پہنچی امیر نے کھولکر اُسے پڑھا اور پڑھتے ہی حکم دیا کہ عرضی گذار گرفتار ہوکر قیدخانہ میں مقید کیا جائے اور علانیہ فرمایا کہ میں نے ابو بکر بن زھر کو اسی غرض سے یہ کام سونپا تھا کہ لوگوں کی زبان اُس کی نسبت بند ہو بخدا اگر سارا شہر متفق ہوکر قسم کھائے کہ اس عرضی کا مضمون صحیح ہے تو بھی میں ہرگز باور نہ کروں ابن زھر کی خداپرستی پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ غرض عرضیگذار مقید ہوا مگر باقی دستخط کرنے والے روپوش ہوگئے ابو العباس احمد بن محمد ابن احمد اشبیلی سے روایت ہے کہ دو لڑکے ابن زھر کے پاس طب کی کتابیں پڑھنے آیا کرتے تھے ایک دن کا ذکر ہے کہ ابن زھر ابو الحسن المصدوم کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا کہ یہ دونوں طالبِ علم کتابیں لئے ہوئے آپہنچے سوائے درسی کتابوں کے ایک لڑکے کے ہاتھ میں ایک چھوٹا رسالہ اور بھی تھا ابن زھر نے اس کے ہاتھ سے لیکر کچھ عبارت پڑھی دیکھا تو منطق کا رسالہ ہے فوراً کتاب کو تو ایک طرف پھینکدیا اور خود لکڑی لیکر شاگردوں کے جانب چلا۔ لڑکے بھاگے یہ پیچھے ہوا دوڑتا دوڑتا ہوا چلا گیا مگر وہ ہاتھ نہ آئے یہ واپس آیا کئی دن تک شاگردوں نے ڈر کے مارے منہ نہ دکھایا مگر بعد چندے جب انھوں نے سمجھ لیا کہ اب حضرت کا غصہ فرو ہوگیا ہوگا۔ پھر آنکر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت

اُس دن ہم سبق لینے کو آرہے تھے سر بازار ہم نے ایک داستان گو کے ہاتھ میں یہ کتاب دیکھی بازاری لوگ کچھ اُس سے تکرار کر رہے تھے ہم نے کتاب اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور آپ کے پاس لے آئے ہمیں کیا خبر تھی کہ اس کے اندر کیا لکھا ہے اور کس فن کی کتاب ہے ابن زھر نے یہ عذر بارد اپنے شاگردوں کا قبول کر لیا اور پھر بدستور درس میں مشغول ہوا مگر اُس روز سے اُس نے یہ معمول باندھ لیا کہ طب کا سبق دیکر ایک آدھ رکوع کلام مجید کا شاگردوں سے پڑھوا کر سن لیا کرتا اور کہدیا کرتا کہ گھر پر اس مقام کی تفسیر دیکھ لو اور علاوہ اسکے سیر و حدیث کی کتابوں کا بھی اُن سے مطالعہ کرواتا اور صوم و صلوٰۃ کے بابت بڑی قدغن رکھتا جب اُس نے سمجھ لیا کہ اب اِن کے عقاید مضبوط ہو چکے اُس وقت ایک دن وہی رسالہ منطق کا اپنے کتاب خانہ سے نکال لایا اور خود اس کا درس دینا شروع کیا اور کہا کہ اب اس علم کے سیکھنے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے -

قاضی ابو مروان الباجی لکھتا ہے کہ ابنِ زھر کی ایک ہمشیر اور اُسکی ایک بیٹی ابنِ زھر کے ساتھ رہا کرتی تھی اُس کی صحبت میں ان دونوں نے بھی فن طبابت میں بڑی دستگاہ حاصل کی تھی خصوصاً عورتوں کے علاج میں بڑی مشاق تھیں اور امیر المنصور کے گھر میں محلات کا

علاج یہی ماں بیٹیاں کیا کرتی تھیں۔

ابن زھر کے وفات کا حال اس طرح لکھا ہے کہ ابوزید عبدالرحمن بن بوجان المنصور کے وزیر نے ازراہِ خبث ابن زھر کے ایک خدمتگار کے ساتھ سازش کر کے انڈے میں ملاکر زہر دلوادیا۔ ابنِ زہرا اور اُسکی ہمشیر دونوں نے وہ انڈا کھایا اور زہر نے دونوں کا کام تمام کیا۔ مورخ لکھتا ہے کہ اُس وقت حکمت اور طبابت کچھ کام نہ آئی۔ مگر منتقم حقیقی نے ابوزید بن بوجان سے اس خونِ ناحق کا عوض اس طرح پر لیا کہ وہ اپنے ایک قرابت دار کے ہاتھ سے قتل ہوا یہاں تک ابنِ ابی اصیبعہ کی روایت تمام ہوئی ابو بکر کی تصنیفات کا ذکر اس مورخ نے چھوڑ دیا ہے مگر ۱۶۱۸ء میں بہ مقام بازل ایک کتاب ابن زھر کی حفظ صحت کے مقدمات میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر چھپی تھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ابنِ زہر کی ہے کیونکہ عبدالملک ابن زہر کی تصنیفات میں اس نام کی کوئی کتاب مذکور نہیں ہے۔

ابن باجہ

ابو بکر محمد بن یحییٰ ابن باجہ الاندلسی ابن الصائغ کے لقب سے مشہور تھا اور اہلِ یورپ اسے (اومپیس) کے نام سے جانتے تھے۔ یہہ مشہور حکیم حافظ قرآن تھا اور علوم عربیہ پر اس کو بڑا عبور تھا اور اپنے وقت کے بڑے حاذق طبیبوں میں گنا جاتا تھا مگر سب سے زیادہ شہرت اس نے حکمت اور فلسفہ میں پائی اِن علوم کا امامِ وقت تھا علاوہ اس کے موسیقی میں بھی اسے بڑی دستگاہ تھی اور نَے خوب بجاتا تھا بعض مورخ اسکی پیدایش سرقسطہ اور بعض قرطبہ کی بتاتے ہیں اُس کے ایک شاگرد ابوالحسن ابنِ عبدالعزیز ابن امام نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں فقط دو ہی شخص یعنے ابنِ باجہ اور ملک ابنِ واہب اشبیلی علوم طبعیہ وفلسفہ میں سربرآوردہ تھے مگر ملک ابنِ واہب نے آخر چلکر دشمنانِ علم کے خوف سے اس طرف توجہ کم کردی اور علوم شرعیہ میں زیادہ توغل شروع کیا اور اِن میں بڑا ملکہ حاصل کیا ابنِ باجہ علی حالہ علوم عقلیہ کی تحصیل واشاعت میں سرگرم رہا اور ہیئت وہندسہ والٰہیات وغیرہ میں بڑا مرتبہ حاصل کیا اور ازراہِ بغض کئی مرتبہ عامی جاہلوں نے اسکی

جان پر حملہ کیا مگر خدا نے بچا دیا ابو الحسن ابن الامام لکھتا ہے کہ بعد ابو النصر الفارابی کے اس مرتبہ کا کوئی حکیم نہیں پیدا ہوا اگر ابو علی ابنِ سینا اور امامِ غزالی سے جنھوں نے مشرق میں علوم عقلیہ کو الفارابی کے بعد زندہ کیا ابن باجہ کا مقابلہ کیا جائے تو شاید ابن باجہ کا پلہ جھک جائے گا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں حکیم بلا ریب اپنے وقت کے ائمہ فن تھے ابنِ باجہ کا زمانہ اوائل مائہ ۱۲۰۰ع ثانی عشر مسیحی ہے۔ تاریخ وفات کا ٹھیک پتہ نہیں ملتا۔ کوئی کہتا ہے ۵۳۳ھ میں وفات پائی۔ کوئی کہتا ہے ۵۲۵ھ میں

ابنِ باجہ نے بہت تھوڑی عمر پائی تئیس برس کے سِن میں اس جہاں سے گذر گیا اور مدینہ فاس میں ابوبکر ابن العربی کے قریب مدفون ہوا کہتے ہیں کہ مسموم مرا۔ اس کے تصنیفات کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) شرح کتاب السماع الطبیعی لارسطاطالیس (۲) القول علی بعض کتاب الآثار العلویہ لارسطاطالیس (۳) القول علی الجزء الآخر من کتاب الحیوان لارسطاطالیس (۴) الکلام علی کتاب الکون والفساد لارسطاطالیس (۵) کلم علی بعض کتاب النبات لارسطاطالیس (۶) قول فی التشوق الطبیعی والماہیت (۷) رسالۃ الوداع (۸) ضمیمہ

رسالۃ الوداع (۹) کتاب فی اتصال العقل بالانسان (۱۰) قول علی قوۃ نزوعیہ (۱۱) تدبیر المتوحد (۱۲) کتاب النفس تعالیق علی کتاب ابی نصر فی الصناعۃ الذھبیہ (۱۳) فصول قلیلہ فی السیاسۃ المدنیہ وکیفیۃ المدن وحال المتوحد (۱۴) کتاب التجربتین علی ادویۃ ابن وافد اس کتاب کی تصنیف میں ابوالحسن سفیان اس کے ساتھ شریک تھا (۱۵) اختصار الحاوی للرازی (۱۶) کلم فی الغایۃ الانسانیہ (۱۷) کلم فی الامور التی بہا یمکن الوقوف علی العقل الفعال (۱۸) کلم فی الاسم المسمی (۱۹) کلم فی البرہان (۲۰) کلم فی الاسطقسات (۲۱) کلم فی الفحص عن النفس النزوعیہ (۲۲) کلم فی المزاج سوا ان کے اور بھی کتابیں ہیں جن کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔

ابن باجہ کبھی شعر و شاعری سے بھی دل لگاتا تھا چنانچہ وفیات الاعیان میں کچھ کلام اس کا منقول ہے لکھا ہے کہ جب موت کا وقت قریب آیا تو یہ دو شعر پڑھتا تھا

اشعار

اقول لنفسی حین قابلنا الوری	فراغت فرارا منہ یسری الی الیمنی
جب موت کا سامنا ہوا اور جان	اس سے چھپنے لگی تو میں نے کہا
قفی تحملی بعض الذی تکرھینہ	فقد طال ما اعتدت الفرار الی الاھنی
بس ٹھہر اور گوارا کر لے اس مرنا گزیر ناگوار کو	بہت دنوں زندگانی کے مزے اٹھا چکی

باجہ ایک شہر کا نام ہے مملکت اندلس میں - وفیات الاعیان میں لکھا ہے لفظ باجہ بہ تشدید جیم لغتِ فرنج مغرب میں چاندی کو کہتے ہیں - اگر یہ درست ہے تو ممکن ہے کہ اہل مغرب نے لفظ فضہ کو بگاڑ کر باجہ بنایا ہے -

کہتے ہیں کہ ابن رشد اس کے شاگردوں میں سے تھا اپنے فلسفی کتابوں میں عزت سے اُس کا نام لیتا ہے - اور اُس کے اقوال کی بڑی وقعت ظاہر کرتا ہے ابنِ طفیل بھی اپنی کتابوں میں اسکی بڑی مداحی کرتا ہے - لوئیس نے اپنی تاریخ فلسفیات میں ابن باجہ کا ذکر کیا ہے مگر کوئی نئی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ دیا جائے -

ابن ابی اصیبعہ اپنے طبقاتِ اطبا میں ابن طفیل کا ترجمہ ترک کر گیا ہے
مگر ابن الخطیب نے کچھ احوال اس کا لکھا ہے۔ ابو بکر محمد بن عبد الملک
بن محمد بن محمد بن طفیل القیسی وادی آش میں متولد ہوا۔ وادی آش ایک
بڑا شہر ہے اعمال غرناطہ سے جسکو وادی الاشات بھی کہتے ہیں اس
بستی کی آب و ہوا کو مذاقِ ادب و شاعری سے بڑی مناسبت تھی
اور یہاں کے باغات اور ندیاں بہت پر فضا تھیں۔ ابن طفیل تحصیل علم
کے بعد تھوڑی ہی عمر میں والی غرناطہ کا کاتب یعنے معتمد (سکرٹری)
مقرر ہوا اور وہاں سے نکل کر یوسف بن عبد المومن کے دربار میں
خدمتِ طبابت اور بعد چندے منصب جلیل وزارت سے سرفراز ہوا
اپنے قرن کے سر آمد اطبا میں اس کا شمار تھا اور ریاضیات اور
ہئیت میں اس کو بڑا ملکہ تھا۔

اس حکیم نے ۵۸۱ھ مطابق ۱۱۸۵ع و ۱۱۸۶ع میں مقامِ مراکش
میں وفات پائی۔ لوئیس اپنی تاریخ فلسفیات میں لکھتا ہے کہ امیر یعقوب
المنصور باللہ خلف امیر یوسف اس کے جنازہ کے ساتھ گیا اور اس کی

موت کا بڑا غم کیا وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ابن طفیل جسقدر ابن باجہ کا ممنون احسان اور ہمیشہ ثناخواں رہا اُسی طرح ابن رشد جس کو ابن طفیل نے بادشاہ وقت تک پہونچایا تھا تمام عمر ابن طفیل کا احسان مانتا رہا۔ اور اُس کی مداحی کرتا رہا ان بزرگواروں کے دلوں میں دستور زمانہ کے خلاف کبھی بغض وحسد کا گزر نہ ہونے پایا۔ لوئیس کا قول ہے کہ یورپ کے علماء میں یہ بات مشہور تھی کہ ابن طفیل نے نظام بطلیموسی کو رد کیا ہے اور ایک دوسرا نظام ایجاد کیا ہے ابن رشد اپنے شرح میں اس جدید طریقۂ عمل کا ذکر کرتا ہے مگر اس کے قول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن طفیل نے بہ تفصیل اس مسئلہ پر کوئی رسالہ نہیں لکھا اگرچہ ہمیشہ لکھنے کا قصد کرتا رہا۔ ابن طفیل کی رائے یہ تھی کہ فلک الافلاک ثوابت کے اوپر اور بالکل خالی ہے اور اس کو ایک ہی حرکت ہے یعنے مشرق سے مغرب کی جانب اُسی کی حرکت سے جملہ افلاک کو مشرق سے مغرب کی جانب حرکت ہوتی ہے مگر جو فلک الافلاک سے بعید تر ہے اُس کی حرکت بھی زیادہ بطی ہے اور جسقدر قریب تر ہے اُسی قدر حرکت بھی زیادہ سریع ہے کیونکہ قریب کو بہ نسبت بعید کے اصل محرک یعنے فلک الافلاک کی حرکت کا اثر زیادہ پہنچتا ہے اور علی ہٰذا القیاس بعید کو بہ نسبت قریب کے کم اور یہی وجہ تفاوت حرکت کی ہے

کسی دوسرے متضاد الجہتہ حرکت کے فرض کر لینے کی حاجت نہیں ہے
ہر فلک کے قطبین فلک مافوق کے قطبین سے ہٹے ہوئے ہیں -
اور ہر فلک باتباع حرکتِ فلک مافوق اپنے محور پر یومیہ حرکت کرتا ہے
یہ دونوں حرکتیں مجتمع ہو کر ایک طرح کی لولبی شکل پیدا کرتی ہیں جسکے
سبب سے ستارے شمال یا جنوب کی جانب جھکے ہوئے نظر
آتے ہیں -

ابن طفیل کی تصنیفات میں کتاب حیّ بن یقظان نے بڑی مقبولیت
پائی - ایک مرتبہ اصل عربی مع ترجمہ لاطینی ۱۶۷۱ع میں طبع ہوئی اور
پھر دوسرے بار ۱۷۰۰ع میں چھاپی گئی تین مرتبہ انگریزی زبان میں اور
دو مرتبہ جرمن میں ترجمہ ہوا - اس رسالہ میں ابن طفیل ایک فرضی قصہ
لکھتا ہے اور اُس کو بعض مطالبِ فلسفی ادا کرنے کا ذریعہ گردانتا ہے
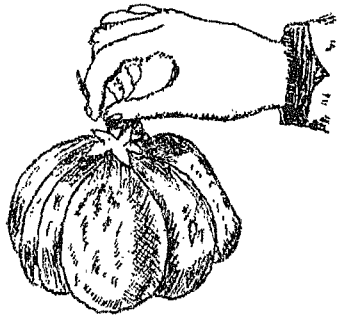
راستی و راستبازی

الصِّدقُ یُنجی وَالکِذبُ یُہلِکُ

راستی موجبِ رضائے خداست	کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

راستی و راستبازی ہمداستان سازی رفتارست با گفتار و گفتار با پندار یعنے ازیں ہر سہ تار ہمیں یک آہنگ خیزد و ہیچ یکے ازیں سہ با دیگرے نہ ستیزد۔

راستی آدمیت کی جان ہے۔ سیدھا وہی چلتا ہے جو سچا ہے جھوٹ کی راہیں ٹیڑھی ہیں۔ منہ پر تلواریں کھانا اور پیٹھ نہ پھیرنا، زخموں میں ٹانکے لگوانا اور تیور میلے نہ کرنا، بڑی جرأت اور جوانمردی کا کام ہے۔ مگر اصلی سورما وہی خدا کا بندہ ہے جس کا سچ بولنے میں پاؤں نہ ڈگے سچی بات اکثر کڑوی لگتی ہے، جھوٹ میں امرت کا مزہ ہے، گو آخر میں ہلاہل ہو۔ وقت پر جھوٹ سے کام بھی نکل آتا ہے جیسے کیمیاگر کا جوڑ کہیں چل گیا مگر پھر ایک نہ ایک دن کھوٹا کھرا پہچان لیا جاتا ہے۔ آدمی ابن الوقت بنکر جھوٹ سے اپنا مطلب تو بنا لیا

کرتا ہے مگر دل کے قرار اور پاکدامنی کی آسایش سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑتا ہے
ہر وقت دل میں کھٹکا لگا رہتا ہے کہ دیکھئے کب یہ بھانڈا پھوٹتا ہے، کب
رسوائی کا سامان ہوتا ہے جس کے دل میں چور بیٹھا ہو وہ کیونکر اپنے
سایہ سے نہ بھڑکے ایک جھوٹ کے نباہنے میں سو جھوٹ نئے گھڑنے پڑتے
ہیں یہاں تک کہ آدمی جھوٹ کا پتلا بن جاتا ہے جان وبال میں پڑ جاتی ہے
اگرچہ آغاز آسان نظر آتا ہو مگر انجام دشوار ہو جاتا ہے، دروغ گو را حافظہ نباشد
آخر کبھی نہ کبھی قلعی کھل جاتی ہے، چشموں میں آنکھیں نیچی کرنی پڑتی ہے، اور
جو اتفاق سے کچھ دنوں داؤں چل بھی گیا تو اپنے دل کی چٹکیاں بے چین
کرنے کو کیا تھوڑی ہیں اور رفتہ رفتہ جب اس پوشیدہ تازیانہ کا بھی متحمل ہو گیا
پھر تو سب مساوات ہے، کیسی ذلت کہاں کی خواری بےحیائی کا جامہ پہن کر
آدمی پکا بے ایمان دغاباز بن جاتا ہے سچ تو یہ ہے کہ جھوٹ آدمیت میں
گھن لگا دیتا ہے۔

زمانہ جھوٹ سے بھرا ہوا ہے، جدھر دیکھو پہاڑ کے پہاڑ جھوٹ کے کھڑے ہیں
بڑی جرأت، بڑی احتیاط، بڑی دانائی چاہیئے۔ تاکہ آدمی راستبازی
کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر جائے اور ان پہاڑوں میں ٹکریں نہ کھائے
اپنی بُرائیوں کا آپ عذر کر کے دل کو سمجھا لینا اور اس عذر بدتر از گناہ سے
اپنی دانست میں اپنے خدا کو دھوکہ دے لینا نقصانِ مایہ یا شماتتِ ہمسایہ

کے خوف سے اپنی شخصیت میں بٹہ آنے یا اپنی حماقت ظاہر ہو جانیکے
ڈر سے جھوٹ بولنا، اُن لات و عزیٰ کی پرستش ہیں جن کا لوگوں نے وضع
نام رکھا ہے سچی بات کو دروغ کے پردے میں چھپانا اور اپنے نزدیک اس کو
بڑی وضعداری قرار دینا دوستوں کی دلداری، دشمنوں کی تذلیل، حاکموں
کی خوشامد، ملانوں کی تسکین، جاہلوں کی تالیف، کی خاطر حرفِ راست سے
درگذر کرنا اس زمانہ کا وتیرہ ہو گیا ہے، راہِ راستی میں بڑے بڑے دشوار
گذار پہاڑ اور ٹیلے ہیں، ذرا غور کرو اپنے نفس کی خوشامد کیسی میٹھی معلوم ہوتی ہے
یہ وہ کافر شراب ہے کہ منہ سے لگی ہوئی نہیں چھوٹتی، یہ وہ جھوٹا آئینہ ہے
کہ کبھی سچی صورت نہیں دکھاتا ہے

وَعَینُ الرِّضا عَن کُلِّ عَیبٍ کَلِیلَۃٌ
وَلٰکِنَّ عَینَ السُّخطِ تُبدِی المَسَاوِیا

اپنے حُسن کا گمان، خوش آوازی کا یقین، علم کا غرہ، دانشمندی کا گھمنڈ
یہ ادنیٰ شعبے نفس کے ہیں جنکی بدولت مردوں کو کنگھی آئینہ کا شوق
ہوتا ہے ہمسایہ والوں کو زیرِ قیم درگوش کن کہنا پڑتا ہے کج بحثی سے دوستوں کا
دماغ پریشان ہوتا ہے، تقدیر کی شکایت ناشکری کے کلمات ہر مجلس میں
سُنے جاتے ہیں۔ عرفانِ نفس کے یہی معنی ہیں کہ اپنے حساب کتاب کی

جانچ میں پہلو تہی، اپنی خطا سے چشم پوشی، اپنی طرف کی پچ نہ کرے، خود بینی کو عیب کیوں گنتے، اگر خود بینی کو اکثر دروغ بینی لازم نہ ہوتی، خود بینی حق بینی کے ساتھ ہو تو عین صواب ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ورنہ سراسر خطا، سبز عینک لگا کر دیکھو تو سارا جہان ایک باغ سبز نظر آتا ہے ہزار میں ہزاروں رنگ ایک سے ایک نرالے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اصل دونوں کی پایا ہوا ہے۔ جو شخص ایسے ڈھکوسلوں پر نہیں بھولتا اپنا حال آنکھیں کھولکر دیکھتا ہے اور آپ سچ بولنے میں کوتاہی نہیں کرتا، وہ کمتر اوروں کی عیب چینی کریگا اور ہمیشہ ان کی خطاؤں کو بچشم حلم و ملائمت دیکھے گا۔

شاید سب سے ذلیل تر وہ جھوٹ ہے جو پیسہ کے واسطے بولا جاتا ہے روزمرہ کی خرید و فروخت، سودا سلف میں لوگ کتنا جھوٹ بولتے ہیں دکاندار چار پیسے زیادہ لینے کی غرض سے اپنی راہ اور خریدار چار پیسے بچانے کی غرض سے اپنی راہ جھوٹ بولتا ہے۔ ایک یہ کہتا ہے کہ ہم نے اسی کے ساتھ کا مال دس روپیہ کو بیچا ہے دوسرا بول اٹھتا ہے کہ میں نے اگلے مہینے فلاں بازار میں دس آنہ کو لیا تھا۔ کوئی لعل سوداگر اپنے بڈھے گھوڑے کے جھوٹے دانت دکھا کر گاہک کو پھانسنا چاہتا ہے۔ کوئی کھلاڑی پرائی زمین کا رہن نامہ لکھتا پھرتا ہے مگر سچائی کا وہ زبردست سکہ ہے کہ کھرا وہی رہتا ہے جو معاملہ کا سچا ہے، سچے بیوپار میں گفت و شنود کی تکلیف نہیں، بھاؤ چکا دینا

درد سر نہیں، کسی قسم کا کھٹکا نہیں، وقت ضایع نہیں ہوتا، زبان نہیں تھکتی،
جانبین کو آسایش ہے۔ جھوٹے بیوپار کا فروغ چار دن کی چاندنی ہے
ساہوکاری میں سچائی کا ساکھ ہے اور ہر قسم کی معاملت میں سچائی سے بہتر
کوئی دلال نہیں۔ ایک قسم کا جھوٹ وہ ہے جس کو عرف میں خلق و مروت کہتے
ہیں، مثلاً جس شخص کی صحبت سے جی بھاگتا ہو اس سے خلوص کا اظہار کرنا
اپنی مقتضائے طبیعت کے خلاف کسی کی رائے یا مذاق سے اتفاق بیان کرنا
خاطر سے ہاں میں ہاں ملا دینا ہر ملاقاتی سے اس کی مرضی کے موافق باتیں کرنا
جس امر پر بہت سے لوگ متفق ہوں اسکو خواہ مخواہ بجا کہنا گو دل میں بیجا
جانتا ہو تالیفِ قلوب کے واسطے سچ کو چھپانا یہ سب دنیا سازی کے کردار
ہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کرداروں میں کبھی کچھ مروت یا احتیاط کو بھی
دخل ہوتا ہے مگر زیادہ تر بزدلی، طمع دنیا، خوفِ نقصان، خواہشِ تحسین
ان کی طرف داعی ہوا کرتی ہے۔ راست باز کو چاہئیے کہ ان دواعی کی
آمیزش کو نکال ڈالے اور جہاں تک مروت یا احتیاط کا مقتضا ہو اسے
قایم رکھے مروت اور احتیاط ان صفات میں نہیں ہیں جو جھوٹ کے
روادار ہوں۔ مبالغہ بھی کیا بے مصرف جھوٹ ہے گناہ بے لذت اسی کا
نام ہے، فقط اس الیچ پر کہ اپنی تقریر کی طرف سامعین متوجہ ہوں یا اپنی
کچھ مشیخت ظاہر ہو سننے والے کچھ تعجب کریں لوگ ایک کو دس بیان کرتے ہیں

جھوٹ کے پہاڑ بنا کر کھڑے کر دیتے ہیں مبالغہ سچا شاعری میں بھی معیوب ہے۔ اگرچہ
شاعر شعر اس غرض سے نہیں کہتا کہ لوگ اُسے سچ جانیں یا اس کے مضمون پر
عمل کریں۔ اور حق تو یہ ہے کہ عالی مرتبت شاعر مُبالغہ کے پردے میں حقایق
ہی بیان کرتے ہیں افسوس کی جگہ ہے کہ ہم لوگ اپنے روزمرہ میں راستی
کی عظمت بھول جائیں، سچائی کے پردے میں جھوٹی باتیں بنائیں، لڑکوں
کو مبالغہ کی عادت سے بہت بچانا چاہیئے، ورنہ آگے چلکر جھوٹ کی عادت
ہو جائے گی، اور جو کار بدنا سمجھی سے کھیل میں کرتے تھے، سن شعور میں غرض سے
کرنے لگیں گے ایک قسم مبالغہ کی خوشامد ہے، خوشامد گو جھوٹ کی تجارت کرتے ہیں
اس کے بازار کی گرمی، سردی، رواج، عجب، اور خود پسندی کا بہت صحیح
تھرمامیٹر ہے۔ خوشامدی کے شرمانے کو حکیم سنائی کے قصیدہ گوئی چھوڑنیکی
حکایت کافی ہے۔ اگر لوگوں کو اتنی سمجھ ہوتی کہ خوشامد درپردہ بنانا ہے تو
خوشامدی کو کوئی منہ نہ لگاتا پیٹ بھرنے کے بہت سے وسیلے دنیا میں ہیں
کیا ضرور ہے کہ آدمی چار پیسوں کی خاطر جھوٹ سے اپنی زبان گندی کرے شعر

چہ حاجت کہ نہ کرسئی آسماں
نہی زیر پائے قزل ارسلاں

تکلف بھی ایک طرح کا مقطع جھوٹ و خوشامد ہے جو منافقانہ ملاقات کی
مشکلوں کو آسان کر دیتا ہے، جب اختلاف مزاج و فطرت یا بغض و عناد

باہمی کی وجہ سے لوگ آپس میں بخلوص ملنے نہیں پاتے تو چار ناچار تکلف اور خلق مصنوعی کو اپنا سفیر بنا لیتے ہیں ایسے معاملوں میں جہاں تک کدورت نفس صاف ہوسکے صاف کرنی چاہئیے اور منافقانہ ملاقات سے پرہیز کرنا چاہئیے ۔

حق سچائی کا یہ ہے کہ سوتے جاگتے خوشی و غم سرا و ضرا امن و خوف میں سچ کے سوا کچھ زبان سے نہ نکلے اور وہ بھی ادھورا نہ ہو پورا ہو، کھرا ہو، جھوٹ کا غش اس میں نہ ملا ہو، جو دل میں ہو وہی زبان پر ہو، اور کردار بھی اس کے خلاف نہ ہو، پکا سالک وہی ہے جسکی پندار و گفتار و کردار ایک ہے دیکھو طبیعت اور فطرت کیسی سچی ہے، پانی کبھی جلاتا نہیں، آگ کبھی بجھاتی نہیں، دھوپ ٹھنڈا نہیں کرتی، برف سے کوئی شئی گرم نہیں ہو جاتی، چاندنی میں تپش نہیں ہوتی، خدا کا کارخانہ عیاذاً باللہ اگر سچا نہ ہوتا تو آدمی کی عقل کس کام آتی، علم سے کیا فائدہ ہوتا، راستی وہ صفت نہیں جسکو کوئی حکیم ہی بتائے کوئی ملا ہی سمجھائے، تو لوگ اس کو اچھا جانیں آج تک کس بندۂ خدا نے کبھی کسی حکیم یا ملا سے پوچھا ہے کہ بتاؤ سچ اچھا ہے یا جھوٹ، وہ کون جھوٹا ہے جو اپنے جھوٹ کی تاویل نہیں کرتا، جھوٹا تو خود کھرا سچ کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے اور پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں سچا ہوں، کوئی مجھے جھوٹا نہ جانے الفضل ما شہدت بہ الاعداء چھوٹے بچے بھی کبھی نہیں پوچھتے کہ جھوٹ

کیوں بُرا ہے سچ کیوں اچھا ہے، سچ ہے کون پوچھ سکتا ہے کہ آگ کیوں جلاتی ہے، پانی کیوں بجھاتا ہے۔

سچائی کو آسان نہ سمجھنا اگر جھوٹ بولنے کے لئے لومڑی اور بندر کی سی مکاری کی ضرورت ہے، تو سچ بولنے کے واسطے حکیموں کی سی جانچنے پرکھنے والی عقل درکار ہے جو ہر شئی کو اپنی حیثیت واقعی میں دیکھے اور جلد بازی سہل انکاری نہ کرے، اور نیت بھی خالص چاہیئے تاکہ غبار نفسانیت نگاہِ صدق کو مکدر نہ کرے نہیں تو پندار و گفتار کا مطابق ہونا معلوم، بہتیرے جھوٹ دنیا میں ایسے بولے جاتے ہیں، جنکا عذاب سارا بے احتیاطی اور کاہلی کے سر ہے۔ سچائی کی عادت وہ عمدہ ریاضت روحانی ہے جسکی بدولت سارے قوائے نفس کو قوت پہنچتی ہے اور جس قدر دروغ گوئی سے نفس میں بُرائی کی قابلیت زیادہ ہوتی جاتی ہے اُسی قدر راستی سے بھلائی کی استعداد بڑھتی جاتی ہے، سچے کی عقل اور علم اور نیکوئی سب کو دن بدن ترقی ہے علاوہ اِن نعمتوں کے خود سچائی میں ایک آسایش اور مسرت دلی ایسی ہے جس کے مزے سے دروغگو واقف ہی نہیں۔ علی الخصوص جب کوئی موقع ایسا آپڑے کہ سچ بولنے میں نقصان اور جھوٹ بولنے میں نفع ہو تو اُس پر بھی سچا سچ بولنے میں اصرار کرے اور داعیۂ نفس کی ایک نہ سُنے ؛؛

اِنَّ اللّٰہ یحبّ معالی الامُور

لیس للانسان الا ما سعی

بے عزم درست و سعی کامل	کس را نشود مُراد حاصل

اقبال و ادبار دو ایسے لفظ ہیں کہ ہر وقت خلق اللہ کی زبان پر جاری ہیں ایک موہوم سے معنی ان لفظوں کے تو البتہ ہر شخص کے ذہن میں ہیں مگر ان کی اصل حقیقت کیا ہے اس پر کم کوئی غور کرتا ہے۔ روزمرہ کے محاورے میں ان کا صرف اس طور پر ہے کہ گویا یہ دونوں خارج میں موجود اور بعض صفاتِ واجب سے متصفِ ذاتی ہیں اور ساتھی اس کے لوگ فعل و انفعال کو بھی ان سے نسبت دیتے ہیں۔ ایاب و ذہاب کا ان پر اطلاق کرتے ہیں خواب و بیداری کی حالتیں ان میں بتاتے ہیں اور بہ غرّہ و نازش یا بحسرت و افسوس انہیں یاد کرتے ہیں، کوئی جو بڑا دقیق بین معنی رس ہوتا ہے وہ تو البتہ اتنا سمجھتا ہے کہ قسمت تقدیر وغیرہ کی مثل یہ بھی اشیاتِ ایزدی کے نام ہیں ورنہ جہلا تو گو زبان سے نہ کہیں مگر انکو شریکِ باری بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے اور جس طرح ہنود لچھمی

اور ستی کی پوجا کرتے ہیں اُسی کے قریب قریب بعض مسلمان بھی اِن آلہۂ فرضی کو مانتے ہیں ۔

بہتیرے لغات ہماری زبان پر ایسے جاری ہیں کہ اُن کے مدلولات محض ذہنی ہیں، خارج میں ان کا وجود نہیں ہے اور ایک ضرورتِ ذہنی کے سبب سے انسان نے انہیں وضع کر لیا ہے جیسے لفظ انسان کہ اُس کا مفہوم کلی کہیں خارج میں موجود نہیں ہے بلکہ چند افراد کو متفق الماہیت پاکر آدمی نے ایک لفظ وضع کر لیا ہے جس کا اطلاق ہر فرد پر ہو سکتا ہے اور ساتھ اس کے کسی فردِ خاص کا نام نہیں ہے، یا مثلاً لفظ جزیرہ کو جو کوئی ٹکڑا زمین کا پانی سے بالکل گھرا ہوا ہو اُس کا نام ہے اعم از ینکہ سنگلدیپ ہو یا جزائر واق ہوں یا کوئی اور سرزمین موصوف بصفاتِ مذکورہ کہیں دیکھنے میں آئے ۔ اِن کے سوا ایک قسم کے اور لغات ہیں جو بہت سی صفاتِ مجتمعہ یا حالتِ مجموعی کے نام ہیں مگر آدمی نے بوجہ جہل ان ناموں کو ان صفات یا حالت کا سبب اور پیدا کرنے والا قرار دے لیا ہے اقبال و ادبار اور قسمت اور تقدیر اس کی نظیریں ہیں ۔ سب کہا کرتے ہیں کہ انگریزوں کا اقبال آج کل یاور ہے ہندو مسلمانوں پر ادبار ہے اگر سرکار انگریزی کوئی لڑائی فتح کرے کسی تدبیر ملکی میں سرسبز ہو، کوئی نہر عمدہ بنائے ۔ کوئی آلہ نیا ایجاد کرے تو بہر حال تعریف اُن کے اقبال کی ہوتی ہے ۔ اگر ہماری

قوم کے لوگ کسی قسم کی تکلیف اٹھائیں کسی امر میں ناقص نکلیں کوئی تدبیر اُن کی الٹی پڑے، علم کی تحصیل میں کوتاہی کریں، حصولِ دولت میں ہمت ہار جائیں، اخلاقِ ذمیمہ سیکھیں، بزرگوں کا وتیرہ چھوڑ دیں تو بہر صورت قصور وار ادبار ٹھہرایا جاتا ہے یعنے گویا یہ اُمور معلول بعلل اور مسبب باسباب نہیں ہیں بلکہ ایک ہرمز یعنے اقبال آسمان زمین کے کسی پردے پر بیٹھا ہوا کسی قوم کو نفع پہنچایا کرتا ہے اور اس کے مقابل میں ایک اہرمن یعنے ادبار بیٹھا ہوا دوسری قوم کو نقصان پہنچایا کرتا ہے عقل ورائے کوئی چیز نہیں ہے یہ دونوں فاعل مختار اور جبار جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، کوئی اُنپر حاکم نہیں اور یہ کسی کے محکوم اور فرمانبردار نہیں، آدمی کے کچھ بنائے نہیں بنتی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی اور اس پرطرہ یہ کہ انسان ہی بیچارے کے معاملات میں اقبال وادبار کا ہر بونگ ہے، ایسی بدعملی عموماً حیوان نبات جماد کے نظم ونسق میں نہیں سمجھی جاتی، گویا خداوند عالم وعالمیاں اشرف المخلوقات سے اُن پر زیادہ مہربان ہے اور ہرمز اقبال اور اہرمن ادبار کے گیرودار سے انہیں محفوظ رکھا ہے۔

ہر صاحبِ عقل اس بات کو تسلیم کرے گا کہ یہ آثار وآیات بے وجہ نہیں ہیں، انتظامِ عالم میں ہر نتیجہ کسی مقدمہ پر مترتب ہوتا ہے ہر معلول کسی علت کے وسیلے سے ظہور میں آتا ہے، کارخانۂ قدرت سلسلۂ علل و

اسباب میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ اُس میں کسی خود دسر دیو یا اہرمن کا گذر نہیں ہے
کسی مخلوق کی یہ مجال نہیں کہ یہ سلسلہ توڑ دے یا ایک معلول کو بھی اپنی علت
سے جدا کردے حکیم اور فلسفی کا کام یہ ہے کہ ہر شئے کی حقیقت اور ماہیت
کی تجسس میں سببِ اول تک پہنچ جائے جس سے بالاتر سبب حقیقی اور حکیم
مطلق کے سوا کوئی نہیں ہے اقبال و ادبار کا نام لینا ایک خاص حالتِ
مجموعی کے وجوہ اور علل تک نہ پہنچنے کا بہانہ ہے۔ تلاش و تفتیش علل
بڑی ریاضت کا کام ہے۔ اسکی محنت کو حکیم ہی گوارا کر سکتا ہے، عوام الناس
آسانی سے دو لفظ گھڑ کے اپنی مشقت بچا لیتے ہیں اور انہیں الفاظ کو علت
بلا واسطہ ٹھہرا کر اپنے دلوں کو تسکین دے لیتے ہیں۔ اسمیں اُنہیں اپنی
کاہلی اور قصور کا بھی عذر اچھا ہاتھ لگ جاتا ہے اور کہنے کو ہوتا ہے کہ ہم
کیا کریں ہمارا اقبال یاور نہیں مجبور ہیں۔

ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ ہماری قومی ہمدردی کا تو یہ حال ہو
کہ ہم میں سے کوئی ایک بھی ابنائے جنس کی فلاح اور بہبودی میں
کوشش نہ کرے اور ہر شخص اپنے ذہن میں ٹھان لے کہ ہمیں ایسے
کاموں میں روپیہ صرف کرنے سے کیا فائدہ، وقت ضایع کرنیسے
کیا حاصل، آخر کوئی نہ کوئی کرہی لے گا یک دلی اور اتحاد کی یہ نوبت
ہو کہ جو کوئی بھولا بھٹکا بھائی ہمارا جان بھی لڑائے اور درد دل سے

ہماری بھلائی کی فکر بھی کرے تو یہ جستجو پیدا ہو کہ اسے کیونکر بدنام کیجئے اسکی نیت کو کس طرح فاسد ٹھہرائیے، کیا گرفت کیجئے کہ لوگ اسے ملحد اور زندیق جانیں، غرض اس کے بگاڑنے میں قرار واقعی دوا دوش کیجائے، جہاں کی خاک چھانی جائے، تربیت اور تعلیم کا یہ نقشہ ہو کہ اپنا علم بھی چوپٹ ہو تحصیل معاش کا وسیلہ نہ سیکھیں مشقت کو ذلت سمجھیں، مفت خواری میں شرم وحیا نہ کریں اور پھر جب تنگی رزق عاجز کرے تو خدا کی ناشکری کے سوا کچھ نہ کریں آل اندیشی اور حسن تدبیر ایسی کہ عمر فکر محال اور شیخ چلی کے سے خیال پکانے میں صرف ہو جائے، گذشتہ حالات پر حسرت و افسوس کیا کریں آئندہ کی نسبت بیہودہ اور بیجا اُمیدوں میں اوقات ضایع کریں ہمیشہ یہ سوچتے رہیں کہ میں فلاں امیر کے مثل متمول، فلاں حاکم کے مانند صاحب اقتدار ہوتا تو کیا ہوتا، اور ہو جاؤں تو کیا ہو، یہاں تک کہ اِن وسوسوں میں واقعی اور ممکن الحصول مواقع تمتع کے بھی ہاتھ سے نکل جائیں حمیت اور غیرت اس درجہ کہ اگر دنیا میں جاہل اور نالایق ٹھہرائے جائیں تو یہ کہکے اپنی بات بنالیں کہ دادا جان بڑے عالم تھے، سیکڑوں شاگردوں کو پگڑی بندھوا دی، نانا جان بڑے مہندس تھے اُن کے زیج آج تک مشہور ہے میں کسی قابل نہیں ہوا تو کیا ہوا اور اس پر یہ توقع کہ لوگ اپنی بھی اتنی ہی قدر دانی اور تواضع تعظیم کریں جتنی کسی صاحب

علم وکمال کی کرتے ہیں، امیروں کا یہ وتیرہ ہو کہ امارت کو مقصود بالذات جانیں اور مخزن ہر فضل وکمال تصور کریں، تحشم کو عزت سمجھیں اپنے خوشامدی اور دست نگر لوگوں کی ستایش کو سچ جانیں اور اس گروہ کی واہ واسے پھولے نہ سمائیں مال و وقتِ عزیز لہو ولعب میں صرف کریں اپنی قوم اور اپنے ملک کی بھلائی میں کوشش نہ کریں اور اس کار خیر میں پیسہ نہ اٹھائیں شرفو کا یہ نقشہ ہو کہ گو کھانے کو پاس نہ ہو مگر محنت اور مزدوری سے اِن کی شرافت میں ٹبا لگے، سوال سے عار نہ ہو مگر پیشہ اور حرفہ سے جی شرمائے، عابد وزاہد ایسے ہوں کہ مذہب وملت کو پیشہ بنائیں اور نماز وروزہ کی روٹیاں کھائیں حج وزیارت کے واسطے سرمایہ تحصیلتے پھریں اور اُس فعل کو جسے خداوند عالم اور ہمارے شارع علیہ التحیۃ والسلام نے حرام کیا ہے بظاہر ذریعہ جذب ثواب اور بباطن وسیلۂ حصول معاش بنائیں۔ عمال وحکام ایسے کہ ان کو پیٹ بھرنے سے کام۔ ملک خدا چاہے بگڑے اور چاہے سدھرے ان کی بلا جانے، حیف صد حیف کہ ہمارا اور ہماری قوم کا یہ حال ہے اور اس پر ہم ادبار ہی کو الزام دیں اپنے قصور پر معترف نہ ہوں اور اپنے ملک کی بہبودی کے خاطر سعی وکوشش کرنیکے عوض بیٹھے ہوئے ہائے قسمت وائے نصیب کیا کریں۔

اصل میں ادبار اسی حالت مجموعی کا نام ہے جس کا ایک شمہ بطور

مشتے نمونہ از خروارے اوپر بیان کیا گیا۔ اقبال کو بالکل اس کا ضد تصور کر لینا چاہیئے، زیادہ اس سے سمجھنا اور ادبار یا اقبال کو ان حالات کا خالق اور مسبب قرار دینا عقلِ سلیم کے نزدیک مشابہ بشرک معلوم ہوتا ہے اگر یہ مقدمہ تسلیم کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ مثل امراضِ جسمانی یہ بھی عوارض ہیں اور ہم برآں قیاس علاج پذیر اور جس طرح طبیب حاذق پہلے اسباب وعلاماتِ مرض کو ہر صورت سے تشخص اور محقق کر کے اس کے مناسب نسخہ لکھتا ہے اسی طرح ہمارے ملک کے عقلا اور حکما کو چاہیئے کہ پہلے اپنی قومی امراض کے اسباب وعلامات بخوبی دریافت کریں اور پھر ہر ہر سبب ردی کے واسطے علیٰحدہ علیٰحدہ دوائیں تجویز کریں، اگر صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے علاج میں کوشش کی جائے اور قربۃً الی اللہ اس امر میں اہل توفیق جد وجہد کو کام فرمائیں تو عجب نہیں کہ اس کا ثمرہ بہت جلد ظہور میں آئے

السّعیُ منّا والاتمام من اللہ ؎

من طریق سعی می آرم بجا	لیس للانسان الا ما سعیٰ
دامنِ مقصود اگر آرم بکف	از غم و اندوہ مانم برطرف
ورنہ شد از جہد من کارم بکام	من دراں معذور باشم والسلام

ہوا اور پانی

ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے (غالب)

یوں تو خدا کی خدائی میں نعمتیں ایک سے ایک اعلیٰ ہیں مگر غور کرکے دیکھو تو ہوا اور پانی کو سب پر فضیلت ہے ہوا نہ ہو تو ایک دم جینا محال ہو جائے اور پانی وہ چیز ہے کہ کوئی پیاسے سے اسقدر پوچھے عرب اور افریقہ کے ریگستانوں میں پانی کا مارا تڑپ کر مرجاتا ہے ۔

سل المصانع رکبا تھیم فی الفلوات
تو قدر آب چہ دانی کہ در کنار فراتی

غرض کوئی اگر ان دونوں نعمتوں کے فائدے لکھنا چاہے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں اور ہنوز ایک شمہ نہ بیان ہو حالانکہ بہتیری مصلحتیں ہزاروں منفعتیں شاید ایسی ہیں کہ ابھی انسان انکی کنہ تک نہیں پہنچا بلکہ انہیں جانتا بھی نہیں ہے اگر آدمی باری تعالیٰ کے حکمت کی سیر کرنا چاہے تو اسکی مصنوعات میں غور و خوض کرے اور دیکھے کہ اُس حکیم مطلق نے کس صنعت سے ہر شئی کو خلق فرمایا ہے اور ہر چیز کو کیسے خواص عطا کئے ہیں کہ خود بخود ہزارہا فائدے نکلتے چلے آئیں اور ہر موقع اور ہر محل پر ایک منفعت خاص اُس سے پیدا ہوا اور ہر بار عقل ناقص انسانی یہی تصور کرے کہ اس شئے کے خلق ہونے کی غایت اب ہم پر کھلی تمہید میں

ہوا اور پانی کا نام لیا گیا ہے اللہ اللہ کیا کیا باریکیاں کیا کیا حکمتیں ان دونوں چیزوں کی خلقت میں بھری ہوئی ہیں کہ جن کی حد ہے نہ شمار اور اس پر حکما اور علما معترف اور مقر ہیں کہ ہماری عقل ان کی تمام حقیقت اور خواص پر حاوی نہیں ہے بہر حال جس قدر تحقیقات سے معلوم ہوا ہے اُس سے بھی دفتر کے دفتر پر ہو سکتے ہیں۔

(۱) ہماری دنیا کرۂ ہوا سے اس طرح گھری ہوئی ہے جس طرح سیب یا نارنگی پوست سے گویا ایک ہوا کا سمندر ہمارے گرداگرد لہرا رہا ہے اور جس طرح سمندر میں پانی کو کسی مقام پر تموج ہے اور کہیں سکون۔ ویسا ہی ہوا کا حال ہے کہ کسی جگہ پر ساکن ہے اور کہیں متحرک کہیں آندھی طوفان گرداب ہے کہیں نسیم کا جھونکا پھولوں سے شبنم کا مینہ برساتا ہے اور کہیں پتا تک نہیں ہلتا ڈولتا اس کرہ کو جو کہتے ہیں۔ ابر و باد۔ و طوفان و برف و ژالہ و قوس و قزح یہ سب کائنات اسی جو کے اندر ہیں اور اس لئے اہل فن ان کو کائنات الجو کہتے ہیں۔

(۲) ہوا اور پانی دونوں رقیق اور سیال چیزیں ہیں جدھر ڈھلکا دو اُدھر ڈھلک جائیں جس شکل کے ظرف میں رکھو اسمیں سما جائیں پنکھے کی حرکت سے سارے مکان میں ہوا اہل جاتی ہے حوض میں لوٹا ڈبو چاروں طرف پانی چھلکنے لگتا ہے صلب اور سخت جسموں میں یہ باتیں
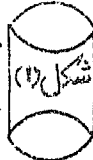
نہیں ہیں اُن کے اجزاء میں باہم اتصال زیادہ ہے بمشکل ایک دوسرے سے
جدا ہوتے ہیں بخلاف اس کے ہوا اور پانی میں خرق و التیام آسانی سے
ہوتا ہے یعنے یہ دونوں جسم بسہولت شگافتہ ہو جاتے ہیں اور بسہولت
جڑ بھی جاتے ہیں سخت جسم کا توڑنا اور جوڑنا دونوں دشوار ہے -

(۳) پھر ہوا اور پانی کے قوام میں بڑا فرق ہے رقیق اور سیال
دونوں ہیں - مگر ہوا میں یہ صفتیں پانی سے زیادہ ہیں ہوا کے اجزا
میں باہم اتصال کم اور پانی کے اجزا میں زیادہ ہے -

ہوا کے اجزاء میں ایک قوتِ دافعہ ایسی ہے کہ وہ اس جسم
لطیف کو بہت ذی مرونتہ یعنے لچکدار کر دیتی ہے مثلاً اگر پھکنے میں ہوا
بھر کر ہاتھ سے دباؤ تو دب کر چھوٹا ہو جاتا ہے اور ہاتھ کھینچ لو تو پھر پھیل
پھولکر اپنی حالتِ اصلی پر آجاتا ہے - یا مثلاً گز بھر ہوا اگر دو یا تین
گز برابر جگہ ہوا سے خالی پا جائے تو پھیل کر سب کو بھر
دیتی ہے -

(۴) پانی کا بوجھ تو سقا بھی جانتا ہے مگر ہوا کا وزنی ہونا
ہر کسی کو نہیں معلوم ہے بلکہ بعض حکما و علما بھی اس غلطی میں پڑے
ہیں کہ ہوا کا حیز اوپر کی جانب ہے یہ شئے مثل اور چیزوں کے
مرکز زمین کیطرف نہیں کھنچتی پس قیاساً اس میں ثقل نہیں ہونا چاہئے حالانکہ

فی الواقع ہوا بھی وزن دار چیز ہے چنانچہ امتحان اس کا آسانی سے ہوسکتا ہے کچھ قیاس کو دخل دینے کی حاجت نہیں ہے۔ اس امتحان کے واسطے فقط ایک بوتل چاہیئے جس کے منہ پر شیر دہان مضبوط لگا ہو اور ایک مفرغہ (جسے انگریزی میں ایر پمپ کہتے ہیں) ایک آلہ بادکش ہے جس کے عمل سے جس ظرف کو چاہو ہوا سے خالی کر دو۔ بوتل کو اس بادکش پر رکھ کے ہوا سے خالی کر ڈالو اور شیر دہان بند کر کے اٹھا لو اور اس خالی بوتل کو کانٹے میں تول کر اس کا وزن یاد رکھو پھر بوتل کا منہ کھولدو کہ ہوا اس میں بھر جائے اور دوبارہ اُسے تولو اب کی مرتبہ کانٹے پر وزن زیادہ چڑھے گا یعنے ہوا کے بھر جانے سے بوتل کا بوجھ بڑھ جائیگا اگر اول بار بوتل کا بوجھ دس تولہ تھا تو دوسری مرتبہ تولنے سے مثلاً دس تولہ اور پانچ رتی نکلا تو ظاہر ہے کہ بوتل میں جس قدر ہوا سماتی ہے اُس کا وزن پانچ رتی کے برابر ہے بامتحان معلوم ہوا ہے کہ سطح زمین پر ایک انچہ مکعب ہوا کا وزن (۳۱) گرین کے برابر ہوتا ہے۔

(۵) ہمارے جو میں بھی ہوا بھری ہوئی ہے اور سارے جو کے ہوا کا بوجھ زمین پر پڑتا ہے اگر بوجھ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہو تو ایک شیشہ فانوس نما شکل کے مشابہ پیدا کرو اور اُس کے منہ پر ایک ٹکڑا جھلی کا مضبوط لپیٹ دو کہ سنفذ ہوا کا نہ رہ جائے پھر دوسرے

شکل (۱۲)

منہ کے بجل آلۂ بادکش پر رکھکر ہوا سے خالی کر ڈالو ادھر شیشہ خالی ہوگا
اور ادھر جو کا بوجھ بھکنے کو دبا کر توڑ ڈالے گا جبتک ہوا کا بوجھ دونوں
جانب پڑتا تھا اُس وقت تک خیریت تھی جس وقت ایک طرف سے بوجھ
اُٹھ گیا فوراً دوسری طرف کے دباؤ نے چمڑے کی جھلی کے پرزے
اڑا دئے اسی طرح اگر کم زور شیشہ کی اجاری ہوا سے خالی کر لی جائے تو
ٹوٹ جاتی ہے شمع جلا کر اس پر کوئی ظرف اس تدبیر سے ڈھانک دیا جائے
کہ باہر کی ہوا اندر نہ جانے پائے تو ایک لحظہ میں شمع گل ہو جاتی ہے
اور پھر اگر ظرف کو اٹھانا چاہو تو دقت سے اُٹھتا ہے - وجہ اس کی یہ ہے
کہ شمع نے ظرف کے اندر کی ہوا تھوڑی سی صرف کر ڈالی اب ایک جانب
بوجھ ہوا کا کم رہ گیا اور ایک جانب زیادہ اگر فراغ کامل پیدا ہوتا تو اور
بھی زیادہ دقت ظرف کے اُٹھانے میں پڑتی مجمہ یعنے شاخ یا بارہ
اسی قاعدے پر لگایا جاتا ہے اور انگریزوں نے ایک قسم کی کیل ایجاد
کی ہے جس کو دیوار میں گاڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی کٹوری کے
شکل پر ربڑ کی بنی ہوئی چیز ہے دیوار پر چپکا دینے سے چپٹ جاتی ہے
اس کی حکمت بھی جو کے بوجھ سے نکالی گئی ہے تم نے دیکھا ہوگا کہ
بوتل میں کوئی چیز مشتعل کر کے ڈاٹ لگا دی جائے تو شعلہ کے گل ہو جانیکے
بعد ڈاٹ بڑی مشکل سے نکلتی ہے اس کا بھی یہی سبب ہے کہ جو کا بوجھ

اوپر کی طرف بہت زیادہ ہو جاتا ہے ۔

(۶) ہوا کا وزنی ہونا اور جوّ کے دباؤ کا موجود ہونا تو اِن مثالوں سے ظاہر ہے مگر اس دباؤ کے تولنے کی کیا تدبیر ہے اس مسئلے کے حل کرنیکے واسطے ایک قلم شیشہ کی سوا ضدا گز بھر لمبی جس کے سوراخ کا قطر ربع انچہ کا ہو درکار ہے ۔ اس قلم کا منہ بند کر دو اور دوسرے منہ کے راستہ سے اس میں منہ تک پارہ بھر دو اور انگوٹھے سے بند کر کے ایک پارے سے بھرے ہوئے پیالے میں تھوڑا ڈبو کر انگوٹھا کھینچ لو اور قلم کو سیدھا بشکل عمود تھامے رہو انگوٹھا کھینچ لینے کے ساتھ ہی پارہ قلم کے اندر سے اُترنے لگے گا مگر نہ اس قدر کہ اندر اور باہر سطح پارے کی متوازی ہو جائے بلکہ باہر کی سطح سے اندر کی سطح بلند ہو گی یہ بلندی سمندر کے سطح سے قریب (۳۰) انچہ کے ہوتی ہے اب غور کرنا چاہئیے کہ (ب) کی جانب منہ قلم کا بند ہے اُدھر سے ہوا نہیں آسکتی کہ پارہ کو دبا دے باہر کی ہوا کا زور پیالے والے پارہ ہی پر پڑتا ہے اور اُسکے سبب سے قلم میں (۳۰) انچہ تک پارہ بلند ہو جاتا ہے یہ بلندی جوّ کے بوجھ کا ٹھیک پیمانہ ہے اگر (ب) کی جانب قلم کا منہ کھول دو تو فوراً قلم کے اندر سے پارہ اُتر کر سطح بیرونی کے برابر

شکل نمبر (۲)

ب

ج

ج

د

ب
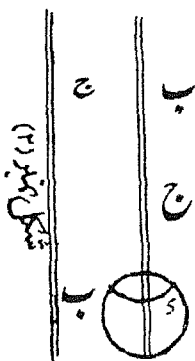
آرہتا ہے کیونکہ دوسرے منہ کے کھل جانے سے جو کا دباؤ دونوں جانب برابر پڑ گیا اگر قلم (۵۰) فٹ لنبا ہو اور پارہ کی جگہ پانی سے یہی عمل کیا جائے تو پانی قلم کے اندر سطحِ بیرونی سے تقریباً (۳۴) فٹ بلند ہوتا ہے اس حساب سے پارہ کی بلندی اور پانی کی بلندی میں وہ نسبت نکلتی ہے جو (۳۰) اور (۱۲×۳۴) میں ہے یعنے ایک ۱ اور (۱۳٫۶) کی نسبت پس اگر یہ قول صحیح ہے کہ پارہ اور پانی دونوں جو ہی کے بوجھ سے قلم کے اندر چڑھ جاتے ہیں تو لازم ہے کہ یہ دونوں مقیاس (یعنے ۳۰۔ انچہ پارہ اور ۳۴ فٹ پانی وزن) میں برابر نکلیں اور پارہ اور پانی کے وزن میں نسبت (۱) اور ۱۳٫۶ کی پائی جائے کس قدر لطف کی بات ہے کہ تجربہ اور امتحان سے بھی پارہ پانی سے ۱۳٫۶ گنا بھاری پایا جاتا ہے اور ۳۰۔ انچہ پارہ کے برابر (۳۴) فٹ پانی کا وزن نکلتا ہے اور کچھ پانی ہی پر منحصر نہیں ہے جو مائع چیز قلم میں بھری جائیگی سطح بیرونی سے اُسی قدر بلند ہوگی جس قدر وزن میں ۳۰۔ انچہ پارہ کے مساوی ہو کیونکہ کیا پارہ اور کیا پانی اور کیا کسی اور قسم کا مائع سب کے سطحِ بیرونی سے اونچا ہونے کا سبب وہی جو کا بوجھ ہے۔

(۷) اس پارہ کے قلم کا وزن کرنا باقی رہ گیا ہے تاکہ جو کا وزن ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے۔ فرض کرو کہ قلم کے سوراخ کا دور ایک

انچہ مکسر کا ہے تو (۳۰) انچہ کی بلندی میں (۳۰) انچہ مکعب پارہ نکلیگا اور ایک انچہ مکعب پارہ کا وزن تولنے سے (۳۴۳۳،۵) گرین نکلتا ہی یعنے (۴۹ء) پونڈ ہیں (۱۳۰) انچہ مکعب یعنے قلم کے اندر جس قدر پارہ ہے اُس کا بوجھ (۴۹ء) پونڈ کا (۳۰) گنا یعنے (۱۴،۷) پونڈ ہوگا جسے تقریبًا (۱۵) پونڈ تصور کرلینا چاہئیے۔ یہ امر بخوبی ذہن نشین رہے کہ فقرۂ (۷) اور (۸) میں جوّ کے بوجھ سے ساری کرۂ ہوا کا بوجھ مُراد نہیں ہے بلکہ مرا یہ ہے کہ ہوائے جوّ کا بوجھ ایک سطح محدود پر اس قدر پڑتا ہے مثلًا اوپر کی مثال میں پارہ یا پانی کی بلندی فقط اسی قدر نشان دیتی ہے کہ ایک انچہ مکسر سطح پر بوجھ (۱۵) پونڈ کا پڑتا ہے اور اس کی زیادہ تشریح کیجائے تو مطلب ظاہر ہوتا ہے کہ اگر سطحِ زمین سے منتہائے جوّ تک ایک قلم ہوا کا فرض کیا جائے جس کا دورہ ایک انچہ مکسر کا ہے تو اس قدر ہوا کا وزن (۳۰) انچہ مکعب پارہ کے برابر ہے سب سے پہلے حسن اندلسی نے بقاعدۂ طبعی جوّ کی پیمایش کرکے بتایا کہ اس کا ارتفاع تقریبًا (۵۸) میل کا ہے آج کل کے اہل فن کا قول یہ ہے کہ ہوائے جوّ کی حد (۴۵) میل تک ہے مگر یہ بھی حساب تقریبی ہے یقینی نہیں ہے۔

(۸) اگر (۴۵ یا ۵۰) میل تک کی بلندی تک اسی وزن کی اور ایسی ہی گاڑھی ہوا ہوتی جیسی سطحِ زمین پر ہے تو جوّ کا بوجھ اتنا ہوتا کہ حیوان

اور نبات کی زندگی مشکل بلکہ محال ہو جاتی مگر فی الواقع یہ صورت نہیں ہے زمین کی سطح سے جوں جوں اوپر چلے جاؤ اتنی ہی ہوا پتلی ہوتی جاتی ہے چنانچہ پہاڑوں پر ہوا سطح زمین کی نسبت بہت پتلی ہے اور برعکس اس کے گہری کانوں میں گاڑھی ہے اس کا سبب مثال ذیل سے بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا فرض کرو کہ۔ ا ب ح ر۔ بارہ انچہ لمبا اور بارہ انچہ چوڑا ایک ظرف لگی یا چوبی ہے جس کی بلندی بھی بارہ انچہ کی ہے اب اس میں اگر پانی بھرنا شروع کرو تو جوں جوں ظرف پُر ہوتا جائے گا اُتنا ہی اُس کے پیندے پر پانی کا بوجھ زیادہ ہوتا جائیگا یہاں تک کہ جب ظرف لبالب ہو جائے گا تو اُس وقت اُس کے پیندے پر ایک فٹ مکعب پانی کا بوجھ ہوگا جو تجربہ سے ہزار اونس کے برابر نکلتا ہے۔ اب اح اور ب کو بارہ بارہ انچوں میں تقسیم کر کے ہر انچہ کا نشان بنا دو پس صاف ظاہر ہے کہ سطح س س پر فقط (۱۴۴) انچہ مکعب پانی یعنے قریب قریب (۸۳) اونس کا بوجھ ہے

شکل (۳)

ا	ب
س	س
ص	ص
ط	ط
ع	ع
ف	ف
ق	ق
ک	ک
ل	ل
م	م
ن	ن
ہ	ہ
ح	ر

اور (ص ص) پر (۲۸۸) انچہ مکعب پانی یعنے قریب قریب (۱۶۶)

اونس کا بوجھ ہے علیٰ ہٰذالقیاس بیچ کے سطح پر (۸۶۴) فٹ مکعب پانی یعنے (۵۰۰) اونس کا بوجھ ہے اور گیارھویں انچہ یعنے ی ی کے سطح پر (۱۵۸۴) انچہ مکعب پانی یعنے قریب قریب (۹۱۷) اونس کا بوجھ ہے اگر آج کا طول ایک فٹ کے بدلے (۴۵) میل فرض کیا جائے اور پانی کی جگہ ہوا تو بھی مسئلہ کی صورت یہی رہے گی۔ مگر چونکہ ہوا پانی سے بہت زیادہ لچک ہے اس لئے تہ کے قریب قریب کی ہوا اوپر والی ہوا کے بوجھ سے دبی اور سکڑی ہوئی پائی جائے گی۔ مثلاً جس قدر ہوا اوپر ایک میل کے بلندی میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے وہ سطح زمین کے قریب چند فٹ یا چند گز کے اندر سما جائے گی اور مساوی الوزن تہین ہوا کی شکل (۴) سے ملتی جلتی صورت پیدا کریں گی پس ظاہر ہے کہ سطح زمین سے منتہائے جو تک ہوا کا بوجھ اور تکاثف یعنے گاڑھاپن گھٹتا جاتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے اگر معلوم ہو جائے کہ فلاں

شکل (۴)

ت		ت
ق		ق
ک		ک
ل		ل
م		م
ن		ن
ط		ط
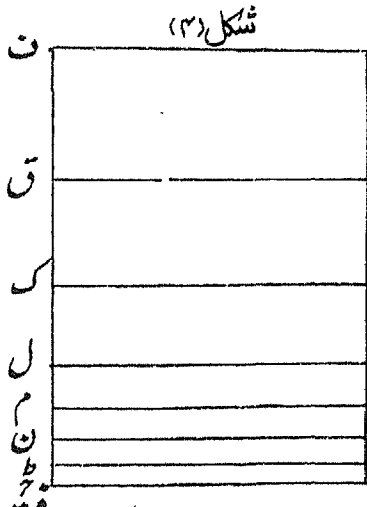
پہاڑ پر بوجھ جو کا زیر کوہ سے اس قدر کم ہے تو بلندی پہاڑ کی دریافت ہو سکتی ہے ہوا اگر لچکدار نہ ہوتی تو جو کی بلندی فقط پانچ ہی میل کی ہوتی

دفع دخل

اول و دوم اتصالِ جسم سے یہ مراد ہے کہ اقل اجزائے جسم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں قند کا ٹکڑا اگر ذرہ بین سے دیکھا جائے تو اُس کے چھوٹے چھوٹے دانے باہم جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اگر اِس اتصال کو زایل کر دیں یعنے مثلاً قند کی ڈلی کو توڑ ڈالیں تو دانے اُس کے الگ ہو کر بکھر جاتے ہیں اور بُورا بن جاتا ہے اِن دانوں کے اجزاء بھی جڑے ہوئے ہیں چنانچہ اگر تھوڑا سا بورا ہاون میں ڈالکر کوٹ لیا جائے یا کھرل میں حل کر لیا جائے تو باریک مثل سُرمے کے ہو جاتا ہے اور اس سے بھی کامل تر اور دقیق تر تجربہ قند کو پانی میں گھول لینے سے حاصل ہوتا ہے۔ تمام اجسام کے اتصالِ اجزاء کو اسی نظیر پر قیاس کرنا چاہیئے کیا پتھر اور کیا لکڑی اور کیا سونا اور کیا لوہا ہر جسم کے اجزائے اولیہ جن کو اصطلاحِ طبعی میں جواہر فردہ کہتے ہیں باہم باتصالِ قوی یا ضعیف متصل ہیں اور اس قوت کو جو اُنھیں اپنی ہیئتِ طبعی پر قایم رکھتی ہے اور اُن کے اجزا کو پاش پاش نہیں ہونے دیتی اصطلاح میں جذب تماسک کہتے ہیں۔ بعض جسم میں یہ قوت بعض کی نسبت قوی تر اور بعض میں ضعیف تر ہوتی ہے جن اجسام میں جذبِ تماسک قوی ہے

اُن کے اجسام میں اتصال بھی زیادہ ہے اور وہ دقت سے ٹوٹتے ہیں
پر کوئی جسم ایسا نہیں جس میں تخلخل نہ ہو یعنی جس کے جواہر فردہ کے
مابین مسامات نہ ہوں فرق فقط اس قدر ہے کہ کسی میں تخلخل زیادہ اور
کسی میں کم پایا جاتا ہے اتصالِ حقیقی جس کا نام ہے وہ کسی جسم میں نہیں ہے
اگر کوئی خاص جسم بآسانی ٹوٹ جائے اور اجزا اُس کے بسہولت
پاش پاش ہو جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جذبِ تماسک
ضعیف ہے اگر حجم مساوی ایک جسم کا دوسرے جسم سے وزن میں
بھاری ہو تو مفہوم ہوتا ہے کہ جسمِ اول میں جسمِ دوم کی نسبت تکاثف
زیادہ ہے یعنے مادہ زیادہ بھرا ہوا ہے اور تخلخل کم ہے اگر کُل اجسام
متساوی التکاثف ہوتے یعنے کسی میں تخلخل نہ ہوتا یا سب میں مساوی ہوتا
کسی میں کم کسی میں زیادہ نہ ہوتا تو متساوی الحجم ٹکڑے کُل اجسام کے
متساوی الوزن ہوتے ایک جسم دوسرے جسم سے بھاری یا
ہلکا نہ ہوتا۔

جسم کیا شئے ہے جسم اُس شئے کو کہتے ہیں جس کے خواص و عوارض
حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہم کو محسوس ہوں جسم کے بعض خواص و عوارض سے
مستنبط ہوتا ہے کہ ہر جسم بہت باریک اور دقیق ذرات یا اجزائے لاتجزیٰ سے مرکب ہے
جو عملاً قابلِ قسمت نہیں ہیں اِن ذرات کے اتصال سے جواہر فردہ

اور ان کے تراکم سے ضخامت جسم کی ظہور پاتی ہے مگر جواہر فردہ میں
ذرات مذکورہ متصل باتصال حقیقی نہیں ہیں بلکہ ان کے مابین کم وبیش
فاصلہ ہوا کرتا ہے جسے مسام کہتے ہیں اور ان میں بعض جاذبہ و دافعہ
قوتیں ایسی متمکن ہیں جن کے باعث یہ اپنی جگہ نہیں چھوڑتے الاّ
بعروض عارض اور قوام جسم کا ایک حال پر قایم رہتا ہے۔ جواہر فردہ
اور ذرات کی مثال ایسی ہے جس طرح قند کے دانے اور پھر ان
دانوں کے اجزاء۔ یعنی ذرات کے باہم جمع ہونے سے جوہر فرد
بنتا ہے اور جواہر فردہ کے اجتماع سے ضخامت جسم کی ظہور میں آتی ہے
اس زمانے کے ایک بڑے نامی گرامی حکیم نے بعد تحقیق و تجسس بسیار
حساب لگایا ہے کہ اجسام کی ترکیب میں جواہر متصلہ کے درمیان
$\frac{1}{000}$ ویں حصہ انچ سے کم اور $\frac{1}{2000000000}$ ویں حصہ
انچ سے زیادہ فاصلہ ہوا کرتا ہے اور اُن کے ضخامت کی یہ تمثیل
دی ہے کہ اگر ایک قطرہ پانی کا یا مٹر کے برابر ایک گولی کانچ کی بڑھکر
کرۂ ارض کے برابر ہو جائے اور اُس کے جواہر فردہ بھی اسی تناسب
کے ساتھ بڑھ جائیں تو اُن کی جسامت باریک چھرے سے زیادہ
ہوگی اور لڑکوں کے کھیلنے کی گیند سے کم۔ طالب شایق کو
لازم ہے کہ گیانو صاحب کی مبادی طبعی اور مل صاحب کی کتاب

کیمیا میں اور حکیم فیراڈی اور ٹنڈل اور تامسن کی تصنیفات میں اس بحث کی تفصیل ملاحظہ کرے۔

مایع اور منجمد جسموں میں یہ فرق ہے کہ جسم مایع میں جواہر فردہ بہ ادنی سبب اپنی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں اور ہیئت جسم کی بدل جاتی ہے بخلاف اس کے منجمد اجسام کی ہیئت بدلنے کے لئے سبب قوی درکار ہوتا ہے یعنے جواہر فردہ اُن کے بآسانی متفرق نہیں ہوتے اور اپنی جگہ نہیں چھوڑتے مثلاً اگر پانی میں کوئی ہاتھ ڈالے تو یہ مایع اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے ہاتھ کے فرو ہونے میں کسی قسم کا زور نہیں پڑتا بخلاف اس کے لکڑی کے اندر کیل بھی بغیر ہتوڑے کے فرو نہیں ہوتی اور لوہے میں تو اور بھی زیادہ دقت سے فرو ہوتی ہے۔ مایع اجسام کی دو قسمیں ہیں ایک سائلات یعنے وہ اجسام جو روانی میں مثل پانی کے ہیں دوسرے رقیق اور ہوائی اجسام جو مثل ہوا کے روانی رکھتے ہیں ہوائی اجسام میں سائلات کی نسبت روانی اور مرونت یعنے لچک زیادہ ہے اور بڑا فرق ان میں یہ ہے کہ ہوائی اجسام ہر وقت اپنے حجم سے زیادہ وسعت میں پھیلا چاہتے ہیں یعنے ان کے جواہر فردہ میں دفع کی قوت غالب ہوتی ہے اور اسی وجہ سے قابلیت انضغاط یعنے دب جانیکی قابلیت ہوائی اجسام میں سائلات کی نسبت بہت زیادہ ہے اور

بہت بڑا حجم ہوا کا مثلاً دبا کر بہت تھوڑی سی جگہ میں بھر دیا جا سکتا ہے
سوم قدما اکثر اسی کے قائل تھے کہ ہوا وزن دار چیز نہیں ہے
یعنی مرکزِ ارض کی طرف مائل نہیں ہوتی بلکہ میلان اس کا اوپر کیجانب ہے
اُن کا یہ قول تھا کہ ہر جسم کے واسطے ایک حیز ہے اور حیز ہوا کا پانی کے
اوپر ہے اور اُس کے اوپر حیز نار کا ہے ہر جسم اپنے حیز کی طرف راغب
اور دوسرے کے حیزوں سے ہارب ہے اس بحث کو شرح ہدایت الحکمۃ
و اسفارِ اربعہ ملا صدر الدین شیرازی و شمس بازغہ میں شرح و بسط کے ساتھ
لکھا ہے ۔

چہارم قدما بین السماء و الارض کو جو بولتے تھے ۔ اس زمانے میں
جو سے وہ کرۂ مجوف پراز ہوا مراد لیا جاتا ہے جو سطحِ فوقانی زمین سے
سطحِ فوقانی ہوا تک واقع ہے اور جس کی پیمایش عموماً (۴۵) میل سے
(۵۰) میل تک تصور کیجاتی ہے اگرچہ بعض علما نے زیادہ اور بعض نے
کم بھی لکھی ہے یہ کرۂ ہوا کرۂ ارض کے ساتھ اُسی طرح حرکت کرتا ہے
جس طرح پانی ۔ اور آفتاب ۔ و ماہتاب کی کشش سے جس طرح پانی میں
جزر و مد ہوتا ہے اُسی طرح ہوا میں بھی جزر و مد ہوتا ہے ۔ عموماً لفظ جو
انہیں معنوں میں مستعمل ہے جو اوپر بیان ہو چکے مگر کبھی بقاعدۂ تجرید
اس سے فقط ظرف بھی مراد لیتے ہیں یعنے وہ محل جس میں ہوا حائل ہے

لفظِ حیز بھی اِن معنوں میں بولا جاسکتا ہے مگر چونکہ کُلُّ جِسْمٍ فلَہٗ حَیِّزٌ طَبْعِیٌّ اور اس قسم کے اور خیالات جن کو فلاسفہ جدید مسلم نہیں جانتے لفظِ حیز کے ساتھ تضمنًا ذہن میں خطور کرتے ہیں اس واسطے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ جدید کے ترجمہ میں کمتر ایسے لغات کا استعمال کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو الفاظ اس قسم کے لکھے جائیں جن کے مدلولات خارج میں موجود ہیں اور محتاج بفرض وتخیل نہیں ہیں

پنجم جس وقت ایسا شیشہ کہ جس کے منہ پر جھلّی یا بھکنا لپٹا ہوا ہو ہوا سے خالی کر لیا جاتا ہے اُس وقت خارج کی ہوا کا بوجھ اُس جھلّی کو توڑ ڈالتا ہے اور اگر ڈاٹ لگی ہو تو اُسے بھی دبا دیتا ہے حتّٰی کہ وہ بدقت اُس میں سے نکلتی ہے یہ خیال کرنا کہ جذب کے باعث سے جھلّی پھٹ جاتی ہے محض غلط ہے کیونکہ جذب کے واسطے جاذب درکار ہے اور جاذب کا وجود اس مثال میں مفقود ہے علاوہ اس کے کچھ بھی دلیل ہوا کے ثقل کی نہیں ہے اسی مضمون کے مسئلہ (۵) (۶) (۷) میں ثبوت اس کا بخوبی مندرج ہے سوائے اِن دلائل کے اور بہت سی وجہیں کتبِ فن طبیعی میں مندرج ہیں طالبِ شایق کو مطولات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

ششم جو لوگ بلند پہاڑوں پر کبھی نہیں چڑھے ہیں وہ نہیں جانتے

کہ ہوا کا بوجھ کس قدر رہتا ہے۔ ثقل کا علم اضافی ہے جبتک ہلکی ہوا
نہ محسوس ہو بھاری ہوا کی کیفیت نہیں محسوس ہوتی دو تین ہزار
فٹ کی بلندی سے یہ کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے اور جس قدر
اوپر چلے جاؤ اور زیادہ معلوم ہوتی ہے مجموع کرہ ہوا کا بوجھ حساب سے
(۴۸۵۰۰) سنکھ ٹن یعنے (۱۳۵۸۰۰۰) سنکھ من نکلتا ہے اگر ہوا کے
وزن مین بنسبت اعلیٰ اور اسفل کے کچھ فرق نہ ہوتا اور جو تکاثف اور
ثقل سطح زمین پر ہے وہی (۴۵) میل تک ہوتا تو بوجھ ہوا کا اس سے نوگنا
زیادہ ہوتا اور ہر انچہ مکسر پر (۱۵) رطل کے عوض (۱۳۵) رطل کا دباؤ
پڑتا انسان کا گوشت و پوست اور اُس کے عضلات و عظام اس کے
متحمل نہ ہوتے۔ غوطہ زن سے پانی کے بوجھ کا حال پوچھنا چاہئے
بانس دو بانس پانی بھی ایسا دباتا ہے کہ تمام بدن پر اثر اُس کا محسوس
ہوتا ہے اعضا میں درد ہونے لگتا ہے مگر چونکہ پانی سخت چیز نہیں ہے
اور بوجھ اس کا جسم کے کسی خاص مقام پر نہیں پڑتا بلکہ برابر ہر عضو پر
پڑتا ہے اس واسطے اُس سے زخم نہیں پیدا ہوتا یا ہڈی نہیں ٹوٹتی
سمندر کے اندر جہاں میلوں پانی ہے بوجھ اس کا بطریق اولیٰ محسوس
ہوتا ہے خالی بوتل اگر بند کر کے سمندر میں ڈال دیجائے تو ایک حد تک
پہنچنے کے بعد اگر شیشے کی ہو تو ٹوٹ جاتی ہے اور اگر فلزی ہو تو

پچک جاتی ہے بہت گہرے عمق میں پانی کا تکاثف اور ثقل بھی سطح کی نسبت زیادہ معلوم ہوتا ہے یہ اُمور بہ تجربہ و امتحان دریافت ہوئے ہیں۔

خاتمہ میں یہ لکھنا ضرور ہے کہ ایسے خدشات و شبہات نہیں رفع ہو سکتے مگر جب متعلم علم طبیعی کو مِن اولہٖ الی آخرہٖ اُستاد سے یا مطالعہ کتب سے علی الترتیب حاصل کرے اور یہ یاد رکھے کہ آج تک جو کچھ اس فن سے متعلق اُردو زبان میں لکھا گیا ہے وہ محض آسان اور ابتدائی مسائل اور نتائج پر مشتمل ہے اس سے کچھ بصیرت تو البتہ ہو سکتی ہے مگر مشکلاتِ فن حل نہیں ہو سکتے۔

---

(۹) فقرۂ (۸) میں بیان ہو چکا ہے کہ ایک انچ مکسر پر ہوائے جو کا بوجھ (۱۵) پونڈ کے قریب قریب پڑتا ہے اس حساب سے ایک فٹ (۱۴۴) انچہ مکسر پر ایک سو چوالیس گنا یعنے (۱۵×۱۴۴) پونڈ یعنے (۲۱۶۰) پونڈ کا بوجھ ہوگا۔ میانہ قد آدمی کے بدن کی سطح تقریباً (۱۶) فٹ مکسر کے پھیلاوے میں ہوا کرتی ہے جس پر بقاعدۂ بالا (۱۶×۲۱۶۰) پونڈ یعنے قریب قریب (۴۳۲) من کا بوجھ ہونا چاہیے بظاہر قیاس میں نہیں آتا کہ بدنِ انسانی کیونکر اس بارگراں کا متحمل

ہوسکتا ہے مگر تھوڑے سے غور اور تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جوّ کا
دباؤ انسان کے جسم پر ہر جہت اور ہر جانب میں برابر پڑتا ہے اور اپنے
بوجھ کو محسوس نہیں ہونے دیتا کیونکہ قواعدِ جرِ ثقیل کے موافق متساوی
المقدار اور متضاد الجہتہ قوتیں ایک دوسرے کی مبطل ہوا کرتی ہیں
جس طرح مثلاً دو برابر زور والے جوان کسی لکڑی کو اپنی اپنی طرف
کھینچیں تو لکڑی جنبش نہیں کرتی - اور اگر یہہ خیال کرو کہ بدن پر جب
اتنی گاؤزوریاں ہوائے جوّ کی ہوتی ہیں پھر یہہ سالم کیونکر رہتا ہے
اور مسل کیوں نہیں جاتا تو اُس کی وجہ یہہ ہے کہ ہڈیاں وغیرہ ایسی
مضبوط چیزیں ہیں کہ اس سے بھی زیادہ بوجھ ہو تو اُٹھالیں -

رہ گئے سیال اجزاء جسم کے سو اُن کا حال یہہ ہے کہ جو ہوا کی
قسم کی چیزیں مساموں میں ساری ہیں اُن کا تکاثف اور ہوائے
بیرونی کا تکاثف برابر ہے اس واسطے یہہ جوّ کے بوجھ سے دب کر
کم نہیں ہوسکتے اور جو مائع یعنے پتلی پانی کی سی چیزیں جسم کے اندر
موجود ہیں اُن میں لچک اتنی کم ہے کہ وہ تو گویا دبتی ہی نہیں چنانچہ
جب بارہ لگایا جاتا ہے یا شاخ کھینچی جاتی ہے اور کسی مقامِ خاص سے
ہوائے جوّ کا بوجھ اُٹھالیا جاتا ہے تو اُتنی سطح بدن کے اندر سے
اُبھر کر پھول آتی ہے -

(۱۰) جن آلات سے جو کے دباؤ کی پیمایش کیجاتی ہے اُنہیں انگریزی زبان میں بیرامٹر یعنے ہوا پیما کہتے ہیں اگرچہ بعض قسم کی ہوا پیما ایسی بھی ایجاد ہوئے ہیں جن کے اندر کوئی جسم رقیق نہیں ہوتا مگر عموماً پارہ ہی کی بلندی سے پیمایش جو کے بوجھ کی کرتے ہیں۔

پارہ کے ہوا پیما گو انواع و اقسام کے ہیں پر اصل اُصول سب کا ایک ہے اس واسطے ایک ہی قسم کی ہوا پیما کی حقیقت بتا دینی بالفعل کافی ہوگی۔

شکل (۵)
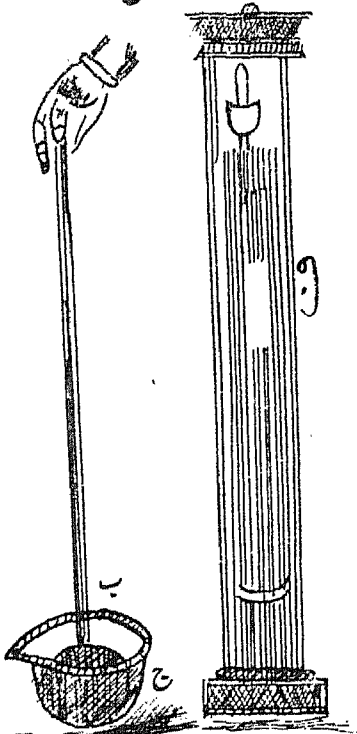
شکل (۵) سے ہیئت مجموعی اس آلے کی معلوم ہو جائے گی د ب ایک شیشے کی (۳۳) فٹ لنبی پارہ سے بھری ہوئی قلم ہے۔ اس کا ایک مونہہ د بند ہے دوسرا مونہہ ب کھلا ہوا ہے اور ب کے بل یہہ قلم حوض ج میں ڈوبی ہوئی ہے جو خود بھی پارے سے بھرا ہوا ہے۔ (دیکھو بیان فقرہ ۷) اور قلم اور حوض دونوں اسی قطع سے ایک چوبین چوکھٹے پر جما دئے گئے ہیں۔ قلم د ب کے سرے پر چوکھٹے میں

ایک تختی فیل دنداں یا کسی فلز کی لگی ہوئی ہے اور اُس پر ہندسے
بنے ہوئے ہیں جن سے بلندی پارہ کی معلوم ہوتی ہے اس بلندی
کا حساب پارہ کی سطح اندرونی سے کیا جاتا ہے اور تقسیم انچوں پر ہے
اگرچہ آج کل تقسیم اعشاری کا رواج زیادہ ہے ایک جانب اِس آلے
کے ایک تھرمامٹر یعنے گرمی پیمائش بھی لگا ہوا ہے۔ آلہ ہوا پیما کا عمل
اس طور پر ہے کہ جس وقت کسی وجہ سے کسی مقامِ خاص پر جَو کا بوجھ
کم ہو جاتا ہے تو پارہ قلم کے اندر تھوڑا بہت اُتر آتا ہے اور حوض والے
پارہ کی سطح کچھ اونچی ہو جاتی ہے اور جب بخلاف اس کے بوجھ کسی
وجہ سے زیادہ ہو جاتا ہے تو پارہ قلم میں چڑھ جاتا ہے اور حوض والے
پارہ کی سطح کچھ پست ہو جاتی ہے۔ سطح سمندر کے قریب اوسط درجہ
بلندی کا تقریبًا (۳۰) انچہ ہے اگر سطحِ دریا سے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر
چلے جاؤ تو پارہ (۱۵) انچہ اُتر آئے گا اور اگر بارہ ہزار فٹ اور اوپر
چلے جاؤ تو ساڑھے سات ہی انچہ رہ جائے گا۔ اس پر قیاس کرو تو
معلوم ہوتا ہے کہ (۴۵) میل کے اوپر بوجھ اور گاڑھاپن ہوا کا
کچھ نام ہی نام کو رہ جائے گا۔ آلۂ ہوا پیما کے فایدے آگے چلکے
بیان کئے جائیں گے۔

(۱۱) انواع اقسام کے بخارات مادی زمین سے صعود کر کے

ہوا میں مل جایا کرتے ہیں اگر ان اخلاط سے خالی کر لی جائے تو ہوا
کی ماہیت یہہ معلوم ہوتی ہے کہ یہہ دو اجزائے مائع بسیط سے مرکب ہے
یعنے آکسیجن اور نیٹروجن باعتبار کیل کے ہوا میں آکسیجن کا حجم سو میں
(۲۰ء۸) اور نیٹروجن کا (۷۹ء۲) اور باعتبار وزن کے سو حصوں میں
(۲۳) حصہ آکسیجن اور (۷۷) حصہ نیٹروجن ہے۔ مگر کسی جا کی ہوا
خالص نہیں ہے بخارات مائی اور کاربانک اسڈ گیس اور گیس امونیا
اور علاوہ ان کے تھوڑی بہت اور مادیات کی بھی اس میں شرکت ہے
مگر کوئی جز ہوا میں ایسا نہیں شریک ہے جو انتظام عالم میں کوئی نہ
کوئی کام نہ دیتا ہو اور اپنا کوئی مصرف نہ رکھتا ہو۔

(۱۲) نیٹروجن کے نکالنے کی یہ ترکیب ہے۔ ایک طشت یا
کاسہ میں پانی بھر دو اور ایک چھوٹے سے تانبے یا لوہے کے
پیالے میں تھوڑا سا فاسفرس رکھکر پانی پر چھوڑ دو کہ تیرنے لگے
اور فاسفرس کو آگ دکھا کر اس پیالے پر کوئی بوتل اس طرح ڈھانک دو
کہ مونہہ بوتل کا پانی میں ڈوبا رہے
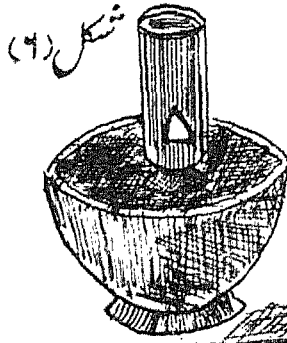
شکل (۶)

شکل (۶) کے ملاحظہ سے یہہ ترکیب
بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی
فاسفرس کے جلتے ہی کچھ سپید سپید

دھواں سا پیدا ہو گا اور آخرکار نیچے بیٹھکر پانی میں مل جائے گا۔ بوتل کے اندر نری نیٹروجن رہ جائے گی کیونکہ جس قدر آکسیجن اسمیں مخلوط تھی وہ فاسفرس کے ساتھ ترکیب کھاکر فاسفرک اسڈ بن گئی اور پانی میں مل گئی۔ اس تحلیل اور ترکیب کا ثبوت کامل اپنے مقام علم کیمیا کی کتابوں میں بشرح و بسط مندرج ہے یہاں زیادہ تفصیل کی گنجایش نہیں ہے۔

الغرض یہہ نیٹروجن ایک گیس یعنے جسم رقیق ہوائی ہے نہ اسمیں کوئی مزہ ہے نہ رنگ ہے نہ بو ہے۔ اگر بوتل کے موںہہ پر ڈاٹ لگاکر پانی میں سے نکال لو اور دفعتہً موںہہ کھول کر ایک روشن کی ہوئی بتی اس کے اندر داخل کردو تو فوراً بجھ جائے گی۔ اگر کوئی جاندار چیز ڈال دو تو دم بھر نہ جیئے گی نہ اس سبب سے کہ خود نیٹروجن میں کسی نوع کی سمیت ہے بلکہ اصل وجہ یہہ ہے کہ بغیر آکسیجن نہ شعلے کو قیام ہوسکتا ہے اور نہ جان کو پانی میں ڈوبنے سے جو حال آدمی کا ہوتا ہے وہی حال ہر جاندار کا خالص نیٹروجن میں ڈوبنے سے ہو گا۔ اگرچہ نیٹروجن کوئی صفت حادہ نہیں رکھتی ہے جس سے اس کا فعل کسی دوسرے مادے پر بطور بین محسوس ہو مگر مصرف اس کا انتظام عالم میں بہت بڑا ہے۔ اس کا کام یہہ ہے کہ حرکے

اکسجن کو پتلا کردے تاکہ تنفس سے اُس کے حیوان اور نبات کو
ایذا نہ پہنچے جس طرح طبیب تیز اور حادّ دوائیں پانی میں ملا کر مریض کو
استعمال کراتا ہے۔ علاوہ اس کے بہت سے مرکبات نیٹروجن کے
کارخانۂ قدرت میں ایسے ہیں کہ حیوان اور نبات ہر وقت اُن کا
محتاج ہے مثلاً کوئی غذا ایسی نہیں ہے جس کی خلقت میں نیٹروجن
شامل نہ ہو۔

(۱۳) اکسجن کے نکالنے میں ذرا بکھیڑا ہے اگرچہ آلات موجود ہوں
تو بات کی بات میں بنالی جاسکتی ہے شکل ۷ کو ملاحظہ فرمائیے ص ایک
صراحی نما شیشہ کا ظرف ہے نیچے اس کے شمع روشن ہے۔ یہہ ظرف
اگر فلزی ہو تو انگاروں پر رکھکر عمل کیا جاسکتا ہے شمع کی حاجت نہیں ہے
صراحی کے موہنہ پر ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور اس ڈاٹ کو چھیدتا ہوا
ایک زجاجی نل ء ب ج تھوڑی دور تک صراحی کے اندر چلا جاتا ہے
اور باقی اوپر سے خم کھا کر ایک دستی حوض میں جا ڈوبتا ہے۔
اس حوض کی قطع یہہ ہے کہ اس کے
ایک جانب ذرا نیچے کو ہٹ کر دیوار
س ش یا ط ظ سے متوازی ایک
پٹری جڑی ہوئی ہے اور اس پٹری
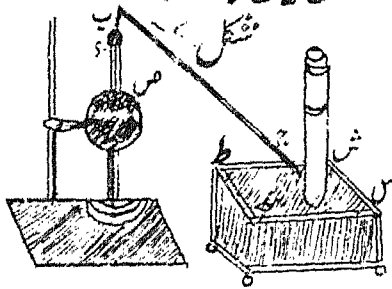
میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تین چار سوراخ ہیں نہ بہت چھوٹے نہ بہت بڑے - اب اس وقت حوض بھرا ہوا ہے چنانچہ پٹری پر تین چار انگل پانی سے کم نہیں ہے - ایک یا دو یا تین پانی سے بھری ہوئی بوتلیں بھی مونہہ کے بل ان سوراخوں پر قطار سے دھری ہوئی ہیں - نل ء بے ح کا سرا ح آنکر سوراخوں میں سے کسی ایک سوراخ میں ٹھہر گیا ہے اور اُس کا مونہہ بوتل کے مونہہ سے ملا ہوا ہے صراحی میں تھوڑا سا پوٹاسیم کلوریٹ شمع کی لو میں پک رہا ہے - تھوڑی دیر اسے یونہی پکنے دو - اب دیکھنا کچھ تماشا نظر آیا چاہتا ہے - دیکھو نل کے مونہہ سے کم کم بلبلے نکلنے شروع ہو گئے - کم کم کیا معنے اب تو تار بندھ گیا ہزارہا نکلتے چلے آتے ہیں اور طرفہ یہہ ہے کہ بوتل بھی اوپر خالی ہوتی چلی آتی ہے اور پانی اس کا حوض میں اُترتا جاتا ہے -

لو بوتل بالکل خالی ہو گئی اور حوض کی اگروں سے پانی نیچے بہنے لگا اب جلد اس بوتل میں ڈاٹ لگا کر اُٹھا لو اور دوسری بوتل کو ہٹا کر اُس کی جگہ قایم کر دو دیکھو یہہ بھی خالی ہوئی جاتی ہے - اب تیسری بوتل کی حاجت ہے - الغرض جتنا پوٹاسیم کلوریٹ تم نے صراحی میں ڈالا ہے اُسی کے حساب سے آکسیجن جمع ہو گی - یہہ بلبلے جو تم دیکھتے ہو آکسیجن گیس کے ہیں - چونکہ یہہ گیس پانی سے بدرجہ ہلکی ہے اس لئے نل سے

نکلتے ہی پانی کو ہٹا کر بوتل میں اپنی جگہ کر لیتی ہے بوتلوں میں پانی
نہ ہو تو آکسیجن خالص نہ ہاتھ آئے ہوائے خارجی میں مخلوط ہو جائے
مگر اس عمل کے واسطے کچھ اسی قطع کا حوض دستیاب ہونا ضرور نہیں
طشت میں پانی بھر لیا جائے تو حوض کا کام دیسکتا ہے ذرا شوق
اور توجہ کو کام فرماؤ تو بہمی ظروف اور آلات سے بہت سے اعمال
کیمیائی ہو سکتے ہیں۔ پوٹاسیم کلورسٹ کے ساتھ تھوڑا سا بالو یا چور
کیا ہوا شیشہ یا منگانک پر اکسائڈ بھی صراحی میں ڈال دینا مناسب ہے
اس حکمت سے گیس زیادہ برآمد ہوتی ہے۔

(۱۴) آکسیجن بھی رنگ اور بو اور مزے سے مبرا ہے انتظام عالم
میں اس جز کو سارے مادیات پر تفوق ہے چنانچہ کرۂ ہوا کے
حجم کا پانچواں حصہ آکسیجن ہے زمین کے کل صلب او منجمد اجسام میں
اس کا وزن نصف کے قریب ہے اور پانی میں نو حصوں میں
آٹھ حصہ آکسیجن ہے۔ جو چیزیں ہوا میں جلتی ہیں اگر خالص آکسیجن کے
اندر جلائی جائیں تو بہت تندی کے ساتھ جلنے لگتی ہیں
اور بعض چیزیں جو ہوا میں بمشکل جلتی ہیں اس گیس میں بآسانی مشتعل
ہو جاتی ہیں مثلاً لوہے کے باریک باریک تاروں کے سروں میں
ذراسی گندھک لگا کر آگ دکھائی جائے اور آکسیجن سے بھری ہوئی

بوتل کے اندر یہہ تار لٹکا دئے جائیں تو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جلنے لگتے ہیں۔ الماس یعنے ہیرا اس گیس میں جل کر کوئلا ہو جاتا ہے اور جلتے وقت بڑی روشنی دیتا ہے۔ پیشتر فقرۂ (۱۴) میں بیان ہو چکا ہے کہ ہوا اگر اس جزو سے خالی کر لی جائے تو جلتی ہوئی شے اُس میں بجھ جاتی ہے اور جانور جان سے جاتا رہتا ہے۔ غرض یہہ کہ جاندار کے واسطے اکسیجن ضرور ہے حرارتِ غریزی بدن میں اسی گیس کے سبب سے پیدا ہوتی ہے اور خون میں سرخی اسی سے آتی ہے اگر کوئی جاندار نری اکسیجن کو کچھ دیر تک تنفس کرے تو اُس پر تپ کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور آخر کو کثرتِ حرارت اور جوشِ خون سے مرجاتا ہے۔

گیس نیٹروجن ہوا سے چھتیسویں حصہ ہلکی ہے اور اکسیجن نویں حصہ بھاری ہے۔ کاربانک اسڈ گیس بھی مثل اکسیجن اور نیٹروجن کے رنگ سے خالی ہے مگر بخلاف اُن گیسوں کے ایک خفیف سی بو اس میں ہے اور مزے میں فی الجملہ ترش ہے ایک بڑا فرق اور یہہ ہے کہ اکسیجن اور نیٹروجن بسیط گیسیں ہیں اور یہہ مرکب ہے ایک جزو اُس کا کوئلا ہے اور دوسرا اکسیجن چنانچہ تحلیل کیمیائی سے دریافت ہوا ہے کہ اس میں دو حصہ اکسیجن اور ایک حصہ کاربن یعنے کوئلا شریک ہے جاندار کے حق میں یہہ گیس سم قاتل ہے۔ نیٹروجن میں جانور فقط

گھٹ ہی کر مر جاتا ہے مگر کاربانک اسڈ ہیں اثر سمی سے ہلاک ہوتا ہے
شعلہ بھی اس میں نہیں ٹھہرتا گل ہو جاتا ہے - وزن اس گیس کا ہوا سے
ڈیوڑھا اور مقدار اس کی ہوا سے جو ہیں آکسیجن اور نیٹروجن کی نسبت
بہت قلیل ہے یعنے باعتبار کیل دس ہزار حصہ ہوا میں کم و بیش چار حصہ
کاربانک اسڈ گیس ہے - یہہ مقدار بظاہر بہت قلیل معلوم ہوتی ہے
مگر کل ہوا کا اگر حساب کیا جائے تو اس میں قریب (۸۰) پدم من کے
کاربانک اسڈ گیس نکلے گی - کاربانک اسڈ گیس اگر بنانا چاہو تو ایک
بوتل میں کچھ ٹکڑے سنگ مرمر یا کھریا مٹی کے اور تھوڑا سا نمک کا تیزاب
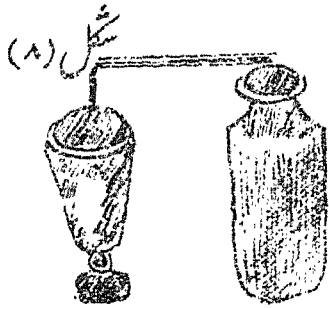
شکل (۸)

اور پانی ڈال دو اور شکل (۸) کی طرح
اس کے موہنہ پر ڈاٹ لگا دو اور ایک
کھنی دار نل اوپر سے داخل کر دو -
تیزاب کے پڑتے ہی بوتل میں کھد
بد ہونے لگے گی اور کھریا مٹی کے ٹکڑے پگھلنے لگیں گے اور بلبلے گیس کے
نکل نکل کر نل کی راہ باہر کا رستہ لینے لگیں گے یہہ بلبلے کاربانک اسڈ گیس
کے ہیں اگر اس کو جمع کرنا چاہو تو مثل آکسیجن کے پانی میں نہیں جمع ہو سکتے
کیونکہ اس کا خاصہ ہے کہ یہ پانی میں گھل جایا کرتی ہے ہاں اگر پانی کے
عوض حوض اور بوتلیں (فقرہ ۱۴۳ ملاحظہ کرو) پارہ سے بھری جائیں تو

ہوسکتا ہے لیکن آسان ترکیب یہہ ہے کہ باہر والی کہنی نل کی ایک گلاس یا اور کسی گہرے ظرف میں رکھدی جائیں اس طرح سے کہ نل کا سرا گلاس کے پیندے سے متصل ہو تو یہ گیس نل نکلکر گلاس میں جمع ہوتی جائے گی اور باہر کی ہوا اٹھتی جائے گی کیونکہ ہوا سے اس کا وزن زیادہ ہے اور اسی طرح تھوڑی ہی دیر میں گلاس بھر جائے گا اور پھر اگر شمع روشن کرکے اُس کے اندر رکھدوگے تو فوراً بجھ جائے گی اگر کوئی جانور اُس میں ڈالدوگے تو اُسی دم مرجائے گا۔

(۱۵) سوائے اِن اجزا کے ہوائے جو میں بخار پانی بہت سا شریک ہے سمندر دریا تالاب جھیلیں یہہ سب کے سب مخزن پانی کے ہیں اِن میں سے ہر وقت اور ہر ساعت بخارات صعود کرکے ہوا میں ملا کرتے ہیں بخارات کے پیدا کرنے کا ذریعہ حرارت ہے۔ دیکھو جب بھیگا ہوا کپڑا پھیلا دیا جاتا ہے کس قدر جلد خشک ہوجاتا ہے اگر دھوپ میں یا آگ کے پاس پھیلا دیا جائے تو اور بھی جلد تر خشک ہوتا ہے سبب اس کا یہہ ہے کہ پانی بخار بن کے اُڑ جاتا ہے اور ہوا کے ساتھ مل جاتا ہے بخار اور ہوا میں بظاہر کچھ تمیز نہیں ہے دونوں بے رنگ اور بے مزہ چیزیں ہیں قوام دونوں کا ایک سا ہے اور جس طرح گرمی سے پانی بخار بن جاتا ہے اسیطرح سردی سے بخار پانی بن جاتا ہے اور کچھ زیادہ

سردی پہنچی تو پانی سے برف ہوجاتا ہے۔ اگر کسی خشک کٹوری میں
تھوڑی سی برف یا سرد پانی ڈالدو تو باہر کی طرف سطح کٹوری کی
نمناک ہوجاتی ہے اور ایک ہلکی سی تہ شبنم کی اُس پر نظر آنے لگتی ہے
اگر برف کے ٹکڑوں میں شورہ اور کھاری نمک اور نوشادر ملاکر کٹورا
بھر دو تو باہر کی سطح پر شبنم کی تہہ تھوڑی ہی دیر میں جم کر برف ہوجاتی ہے
یہہ دونوں نظیریں اس بات کی گواہ ہیں کہ ہوائے خارج میں بخار
ملا ہوا ہے ابخرۂ مائی کی مقدار باعتبار اختلافِ فصل وعرض وطول
بلد وغیرہ مختلف ہوا کرتی ہے سرد ملکوں میں پیدایش اس کی کم اور
گرم ملکوں میں زیادہ ہے علیٰ ہٰذالقیاس گرمی کی فصل میں زیادہ اور
جاڑوں میں کم ابخرے پیدا ہوتے ہیں مگر عموماً کسی سرزمین اور
کسی فصل میں ١/٤ حصے سے زیادہ اور ١/٤٠ حصے سے کم نہیں ہوتا۔

(١٧) یہاں تک بالاجمال ہوا کے اجزا کا بیان ہوچکا اور یہہ
معلوم ہوگیا کہ اس کی ترکیب میں چار قسم کے گیس یعنے آکسیجن نیٹروجن
کاربانک اسڈ اور بخار مائی شامل ہے اور اگرچہ بعض اِن میں سے
ہلکے اور بعض بھاری ہیں پر خداوند عالم نے اِن رقیق ہوائی اجسام
کو ایک ایسا خاصہ عطا کیا ہے کہ اُس کی بدولت ایسا نہیں ہونے پاتا
کہ بھاری گیس کی تہہ نیچے جمع ہوجائے اور ہلکی گیسیں اوپر تیرتی رہیں

جیسا تیل اور پانی کا حال ہے بلکہ ہلکی اور بھاری سب کی سب خوب
مِل ملا کر ایک ہو جاتی ہیں اور جس کسی جائے کی ہوا کا امتحان کرو
اُس کے اجزا قریب قریب برابر پائے جاتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو
کاربانک اسڈ گیس جو اِن سب میں بھاری ہے سطح کرۂ زمین کو گھیر لیتی
اور کوئی جان دار دنیا میں جینے نہ پاتا اِن چاروں اجزا کے فواید
مختصر طور پر کچھ بیان ہو چکے ہیں اس قدر اور اس مقام پر حوالۂ قلم
ہوتا ہے کہ حیوان اور نبات دونوں کے واسطے اکسیجن کا ہونا ضروری
ہے ؎ ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است ؎ سانس کے ساتھ ہوا
شُش یعنے پھیپڑے میں داخل ہوتی ہے اور جان دار اُسمیں سے
ایک مقدار اکسیجن کی نکال لیتا ہے اگر یہہ ہوائے حیات اُسے نہ پہنچے
تو چند دقیقہ میں سارے افعال اعضا و جوارح کے بند ہو جائیں
خون کا سیلان موقوف ہو جائے اور جان بدن سے مفارقت
کر جائے آگ بھی بغیر مدد اکسیجن کے نہیں جل سکتی اور نہ شمع کہیں
روشن ہو سکتی اس سے عجیب تر صنعتِ پروردگار دیکھو کہ مقدار بھی
اکسیجن کی ہوا میں اُسی اندازہ سے پیدا کی ہے جتنی اُس کے
مخلوقات کو درکار ہے اگر سارا کرۂ ہوا اکسیجن سے بھرا ہوا ہوتا تو بھی
جان دار کا جینا محال تھا شدتِ حرارت غریزی اور جوش خون سے

بہت جلد جان فنا ہو جاتی اور آگ جو ایک مرتبہ جلائی جاتی تو پھر
کسی کے بجھائے نہ بجھتی لکڑی یا کوئلا تیل یا شمع جو کوئی چیز جلتی
ہوتی بھڑک اُٹھتی اور ایک آن میں جل کر خاک سیاہ ہو جاتی اسواسطے
آکسیجن کی تندی کو نیٹروجن میں ملا کر دھیما کر دیا ہے تاکہ انتظامِ عالم میں
کسی طرح کا خلل نہ واقع ہو اور جس قدر ضرورت حیوانات کو آکسیجن کی ہے
اُسی قدر نباتات کاربانک اسڈ کے محتاج ہیں اور جس طرح ہمارا جسم
سانس لینے میں آکسیجن کو جذب کر لیتا ہے اُسی طرح نبات کے پتے سانس
لینے میں ہوا سے کاربانک اسڈ گیس کو جذب کر لیتے ہیں اور اسی
چیز پر اُن کی زندگی اور نشو ونما زیادہ تر موقوف ہے اگر کرۂ ہوا اس
گیس سے خالی ہو جائے تو ایک گھانس یا پتا بھی روئے زمین پر
باقی نہ رہے -

(۱۷) تنفس حیوان و نبات میں ایک عمدہ نکتہ ہے جس کو
خاصیات ہوا سے کچھ تعلق نہیں ہے مگر بہ لحاظ اُس کی باریکی اور
صنعت کے یہاں بیان کیا جاتا ہے یقین ہے ناظرین اُسے
دیکھکر محظوظ ہوں گے - آدمی اور عموماً کل شش دار حیوانات کے
تنفس میں دو فعل ہیں اول تو آدمی سانس کے ساتھ ہوا اندر کو
کھینچ لیتا ہے اور بعد اُسی ہوا کو باہر نکال دیتا ہے سانس کے ساتھ

شش کے اندر وہی ہوا جاتی ہے جو باہر جو میں پھیلی ہوئی ہے ۔
ترکیب اس ہوا کی بخوبی معلوم ہو چکی ہے ۔ اس میں سے شش بقدر
حاجت آکسیجن لے لیتا ہے اور باقی کاربانک اسڈ بنکر ہوا کے نیٹروجن
وغیرہ کے ساتھ باہر نکل جاتی ہے اس واسطے جب سانس باہر نکلتی ہے
اُس وقت کاربانک اسڈ گیس بہت اُس سے زیادہ ہوتی ہے جو
باہر کی ہوا میں موجود ہے اور یہہ کاربانک اسڈ گیس شش کے
عمل سے پیدا ہوتی ہے سچ ہے ؎ ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است
وچوں برمی آید مفرح ذات ؎ اگر کسی تنگ مکان میں بہت سے
آدمی جمع ہوں تو تھوڑی ہی دیر میں اُن کے فعلِ تنفس سے بہت سی
کاربانک اسڈ گیس پیدا ہو کر وہاں کی ہوا میں پھیل جاتی ہے اور
لوگوں کو بیمار کر دیتی ہے ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جہاں کہیں زیادہ
مجمع خلایق کا ہوتا ہے وہاں آخر کو آدمی کا دم گھبرانے لگتا ہے
اس کا بھی یہی باعث ہے کہ یہی ہوا بہت سی پیدا ہو جاتی ہے
اور اُس کے تنفس سے تکلیف پہنچتی ہے ۔ نبات کا یہہ حال ہے کہ
دن کو آفتاب کی روشنی میں اس کے ہرے اجزا یعنے پتے وغیرہ
کاربانک اسڈ گیس پیتے رہتے ہیں اور اس گیس کا ایک جز یعنے
کاربن (کوئلا) تو جذب کر لیتے ہیں اور دوسرے جز یعنے آکسیجن کو

اُس میں سے جدا کرکے باہر چھوڑ دیتے ہیں اور یہہ کوئلا اُن کا
جزو بدن بنتا جاتا ہے اور رات کو جب آفتاب کی روشنی نہیں
رہتی ہے اُس وقت ایسا دریافت ہوا ہے کہ بعض اجزا اُن کے
علی الخصوص وہ جو ہرے نہیں ہیں کاربانک اسڈ کے بدلے آکسیجن
جذب کرتے ہیں اور کاربانک اسڈ گیس چھوڑتے ہیں مگر جس قدر
دن کو یہہ گیس جذب ہوا کرتی ہے وہ مقدار میں کہیں زیادہ
اُس سے ہے جو شب کو پھر درختوں میں سے نکلتی ہے۔ نبات کے
تنفس سے یہی عمل مراد ہے جو اوپر بیان کیا گیا اور اسی بنا پر اطبّاء
شب کو گنجان درختوں کے نیچے سونے کو منع کرتے ہیں اور
بڑے بڑے معموروں میں جہاں کثرت آبادی کی زیادہ ہوتی ہے
درخت اور باغات کو باعثِ صفائی ہوا تصور کرتے ہیں کیونکہ
ان کے فعلِ تنفس سے انسان وحیوان کے فعل تنفس کا اثر زائل
ہو جاتا ہے اور کاربانک اسڈ گیس جو ان کے بدن سے نکلا کرتی ہے
اُسے پتے درختوں کے جذب کر لیا کرتے ہیں اور مقدار اس ہوائے
سمّی کی بڑھنے نہیں پاتی۔

(۱۸) ابخرۂ مائی کا بھی ہوا میں شریک ہونا انتظامِ عالم کیواسطے
ضرور ہے علاوہ اس امر کے کہ بارش اور شبنم وغیرہ انہیں ابخروں

سے پیدا ہوا کرتے ہیں اور بارش و شبنم وہ چیزیں ہیں کہ حیوان و نبات کو کسی طرح بغیر ان کے چارہ نہیں ہے خود ابخروں کی بڑی حاجت اِن موالید کو ہر وقت رہا کرتی ہے حیوان کے جسم کا بڑا جز پانی ہے۔

اگر عموماً (۱۵۴) رطل بحساب اوسط آدمی کا وزن فرض کرو تو اسمیں سے یقیناً (۱۱۶) رطل پانی سمجھ لینا چاہئے اور فقط (۳۸) رطل اجزائے خشک۔ آدمی کی جلد اور شش سے ہر وقت پانی بخار بن کے نکلا کرتا ہے دیکھو منہ کی بھاپ میں کس قدر بخار ہوتا ہے آئینہ پر پھونک مارو تو بوجہ سرد ہونے اُس کی سطح کے شبنم کے ایک جھائیں سی اُس پر چھا جاتی ہے اور جاڑوں میں تو منہ سے نکلتے ہی شبنم بنکر نظر آنے لگتی ہے اور نہایت سرد ملکوں میں شبنم کے بدلے برف بنجاتی ہے۔ اگر ہوا ابخرے سے خالی ہو تو تھوڑے ہی عرصہ میں جو کچھ رطوبت عروق و احشا و اعضا میں موجود ہے سب کی سب آدمی پھونک پھونک کر اُڑا دیوے اور بدن بالکل خشک ٹھاٹھر ہو جائے جس طرح بعض درخت مرجھا کر سوکھ جاتا ہے۔ بادسموم سے عربستان میں مسافروں کے اس قدر خوف کرنے کا یہی باعث ہے کہ یہ ہوا اس درجہ خشک اور بخارات سے خالی ہوتی ہے کہ آدمی اگر آپ کو اُس سے نہ بچاوے تو تھوڑی ہی دیر میں جان بحق تسلیم ہو جائے۔

ہمارے ملک کی لُون کیا تھوڑی ہے کتنے مسافروں کو اس نے ہلاک

نہیں کیا ہے گو کہ یہہ اس درجہ رطوبت سے خالی نہیں ہے جیسے بادسموم
نبات کا علیٰ ہٰذالقیاس حال مثل حیوان کے ہے کہ یہ بھی چار حصوں
میں تین حصہ پانی کا بنا ہوا ہے اور اس کے پتوں کے ہر ہر منفذ سے
بخار نکلا کرتا ہے اگر ہوا میں ابخرے نہوں تو مثل آدمی اور حیوان کے
یہ بھی دیکھتے دیکھتے بالکل خشک ہو جائے دیکھو لُون کی فصل میں کہیں
ہندوستان کے ملک میں ہریالی نہیں نظر آتی ہے۔ بنگالے میں چونکہ
لُون نہیں چلتی اور ہوا میں رطوبت زیادہ رہتی ہے اسواسطے کبھی
ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی ٹکرا زمین کا ہرا شاداب نہ نظر آوے۔

(۱۹) باقی خاصیتیں ہوا کی اور اُس کے وساطت سے ہمارے
جو میں جس قدر آثار مترتب ہوتے ہیں اور انتظام عالم میں یہ جزو لطیف
جس طور کی مداخلت رکھتا ہے پانی کے خواص پر مطلع ہونے کے بعد
بہتر سمجھ میں آئیں گے اس واسطے یہاں کچھ مختصر بیان اس شراب الصالحین
کا کیا جاتا ہے پس جاننا چاہیئے کہ بعد ہوا کے پانی سے زیادہ کوئی شئی
عالمگیر اور کارآمد نہیں ہے نبات و حیوان کے جسم میں تین حصہ پانی ہی
اور ایک حصہ اجزائے دیگر اور کرۂ زمین کی سطح کا بھی یہی حال ہے
یعنے ایک ربع خشک ہے باقی تین حصہ پر پانی بھرا ہوا ہے جس کا
عمق آج تک کسی کو بہ تحقیق نہیں معلوم ہے۔ بحر اٹلانٹک میں تیس ہزار

اور بحر پاسیفک میں چالیس ہزار فٹ تک ڈوری ڈالی گئی ہے اور تہ ملی ہے
مگر ابھی بہت سے مقامات سمندر میں ایسے باقی ہیں کہ وہاں کا عمق
مطلقاً نہیں معلوم ہے - یہہ جسم مایع لطیف و شفاف بھی سرمایۂ حیات ہے
کوئی جاندار اس کے بغیر جی نہیں سکتا جو لوگ قصداً اس کو ترک کر دیتے
ہیں وہ بھی بلا قصد و ارادہ بہت سا پانی غذا کے ساتھ استعمال کرتے
ہیں اور بہت سا خارج سے اُن کے مسامات بدن میں جذب ہو جاتا ہے
(۲۰) آب خالص دو جزو بسیط یعنے مفرد سے مرکب ہے - آکسیجن
اور ہیڈروجن باعتبار حجم ایک حصہ آکسیجن اور دو حصہ ہیڈروجن کے
ملنے سے پانی بنتا ہے اور باعتبار وزن سولہ حصہ آکسیجن اور دو حصہ
ہیڈروجن ترکیب پانے سے آکسیجن کا ذکر ہوا کے بیان میں ہو چکا ہے
اور اس کے بنانیکی ترکیب لکھی جا چکی ہے - ہیڈروجن بھی مثل آکسیجن کے
ایک جسم رقیق سیال مزے اور رنگ اور بو سے بالکل مبرا ہے -
ترکیب اس کے بنانیکی یہ ہے کہ کسی بوتل میں کچھ ٹکڑے جست یا لوہے
کے اور اُس پر سے تھوڑا سا گندھک کا تیزاب دو حصہ پانی میں ملا کر
ڈال دو اور بوتل کے مونہہ پر نلدار ڈاٹ مضبوط لگا دو جس طرح کاربانک
اسڈگیس نکالنے کی ترکیب میں ہم بتا چکے ہیں (شکل ۸) اور نل کے
باہر والے سرے کو حوض دستی میں پانی سے بھری ہوئی بوتل کے

تلے لگا دو (شکل ۷) بوتل میں تیزاب اور پانی کے پڑتے ہی جست کے سطح پر سے بلبلے نکلنے شروع ہو جائیں گے۔ یہ بلبلے ہیڈروجن گیس کے ہیں جست تیزاب کے اثر سے پانی کے ایک جز یعنے اکسیجن کے ساتھ ملکر ایک نیا مرکب بن جاتا ہے اور ہیڈروجن کو مفرد چھوڑ دیتا ہے۔ یہ گیس نل کی راہ بوتلوں میں جا جا کر جمع ہو جاتی ہے۔

اس عمل میں اتنی احتیاط کرنی چاہئے کہ پہلے بوتل خالی کر لی جائے کیونکہ اس میں خواہ مخواہ کچھ ہوا بھی شریک ہوگی اس وجہ سے کہ جس بوتل میں جست اور تیزاب وغیرہ ڈالا جاتا ہے اس میں لامحالہ تیزاب کی سطح کے اوپر ہوا ہی ہوا ہوتی ہے اور علی ہذالقیاس نل بھی ابتداء میں ہوا سے بھرا ہوا ہوتا ہے مگر ہاں تھوڑی دیر میں ہیڈروجن نکل کر ہوا کو بوتل اور نل کے اندر سے نکال دیتی ہے اور خود اپنی جگہ کر لیتی ہے پس پہلی بوتل تک ہوا کی شرکت کا گمان بلکہ یقین ہے اس کے بعد جو بوتلیں بھرتی جاتی ہیں ان میں خالص ہیڈروجن ہوتی ہے، یہ گیس نہایت ہی خفیف یعنے ہلکا اور رقیق یعنے پتلا جسم ہے کوئی جسم بسیط اس سے رقیق تر اور خفیف تر آج تک عالم میں نہیں ملا ہے خواص میں اکسیجن سے اور اس سے بڑا تفاوت ہے۔ اس میں جاندار جی نہیں سکتا اور شمع گل ہو جاتی ہے مگر یہ گیس خود مشتعل خیز ہے یعنے آگ لگا دو تو

جلنے لگتی ہے جب چاہو اس کا امتحان کرلو اس کے بنانے اور بوتلوں
میں بھرنیکی ترکیب تو اوپر بیان ہوچکی ہے اب ایک بوتل کو حوض پر
اس ترکیب سے سر کا لو کہ مونہہ اُس کا نیچے ہی کی جانب رہے اور
ایک تنکا یا بتی روشن کرکے اُس کے اندر پہنچا دو تو بتی خود بجھ جائیگی
مگر گیس جلنے لگیگی اور بوتل کے مونہہ پر شعلہ نظر آئے گا اب چاہو تو
اس شعلے سے بتی کو پھر روشن کرلو کیونکہ بوتل کے باہر اکسجن موجود ہے
جس کے بغیر کوئی سلگنے والی شئے سلگ نہیں سکتی اور کوئی جلنے والی
چیز جل نہیں سکتی اگر یہ جلنے والی اور جلانے والی گیسیں دونوں کسی ظرف
میں ملائی جائیں تو باروت سے زیادہ تیز ہو جاتی ہیں اور اس مجموعے
کو آگ دکھائی جائے تو دفعتہً سب کا سب مشتعل ہو جاتا ہے اور ظرف
اگر نہایت مضبوط نہ ہو تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اور کسی تیل یا لکڑی
یا کوئلے کے جلنے سے اس قدر حرارت نہیں پیدا ہوتی ہے جس قدر
اس مرکب کے جلنے سے چنانچہ جب کبھی نہایت تیز شعلہ پیدا کرنا منظور
ہوتا ہے تو اکسجن اور ہیڈروجن کو علحدہ علحدہ بناکر علحدہ علحدہ نلوں
کی راہ ایک پچھی میں پہونچاتے ہیں اور اُسے روشن کر دیتے ہیں۔
اس پچھی میں دونوں گیسیں ملکر جلتی ہیں یعنے اصل میں ہیڈروجن
جلتی ہے اور اکسجن جلاتی ہے اور اس کے شعلے میں اس درجہ

حدت ہوتی ہے کہ تمام فلزات گل جاتے ہیں لوہا اس کے اندر جل جاتا ہے
کھریا مٹی یا چونے کی کنکری اگر اس شعلے کے اندر رکھی جائے تو مثل
انگارے کے دہکنے لگتی ہے اور ایسی تیز روشنی پیدا کرتی ہے کہ دیکھنے
والوں کو چکا چوند لگ جائے اور کوسوں بلکہ منزلوں تک نظر آئے -
ممالک فرنگستان میں اس روشنی کے ذریعے سے شب کو دور دور خبریں
بھیجی جاتی ہیں اگرچہ تار برقی نے اب اس کی قدر گھٹا دی ہے -
اور طرفہ تر یہ ہے کہ فقط ہیڈروجن کی آکسجن میں جلنے سے بہت ہی
ضعیف روشنی پیدا ہوتی ہے ہمارے تیل کے چراغوں میں جو راتوں کو
ہمارے گھر میں ٹمٹمایا کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ نور ہے اس کی
وجہ اور آکسجن اور ہیڈروجن سے متعلق بہت سی باتیں علم کیمیا کی کتابوں سے
معلوم ہوں گے یہاں اُن کے بیان کی گنجایش نہیں ہے اور نہ پانی
کی ترکیب کی وجہ ثبوت بہ تفصیل اس تحریر میں لکھی جاسکتی ہے بالفعل
ہمیں فقط اس علم کے بعض نتائج سے غرض ہے -

(۲۱) پانی اگر خالص اور مقدار میں کم ہو تو شفاف ہوتا ہے اس میں
کوئی رنگت ہوتا ہے نہ مزا نہ بو اور جب بہت سا ایک جا مجتمع ہو تو دیکھنے
میں نیلگوں معلوم ہوتا ہے مگر دنیا میں کہیں آب خالص نہیں ملتا ہمیشہ
کوئی نہ کوئی اجزائے ترابی ملے ہوئے ہوتے ہیں عموماً ہوا اور نیٹروجن

اور کاربانک اسڈ گیس اور بیش و کم کچھ ملحیات یعنے نمک کی قسم کی چیزیں
اور بعض مرکبات فاسفرس اور نیٹروجن اور گندھک اور لوہے وغیرہ
کے اس میں مخلوط ہوا کرتے ہیں۔ تھرمامیٹر یعنے گرمی پیما کے (۲۱۲) درجے
تک سطح دریائے شور کے متصل اگر پانی گرم کیا جائے تو اُبلنے لگتا ہے
مگر سطحِ دریائے شور سے جس قدر بلندی پر چلے جاؤ اُسی قدر اُس کے
جوش دینے میں حرارت کم درکار ہوتی ہے یعنے جوں جوں ہوائے
جو کا بوجھ کم ہوتا جائے اُسی قدر کمتر حرارت کے پہونچنے سے پانی جوش
کھانے لگتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ حرارت سے پانی کے اجزا میں
انبساط پیدا ہوتا ہے اور ابخرے بننے شروع ہوتے ہیں اور یہہ ابخرے
اپنی خفت کی وجہ سے اوپر کو صعود کرنا چاہتے ہیں مگر جو کا بوجھ اِن کو
نکلنے نہیں دیتا تاوقتیکہ ان میں اس قدر مرونت یعنے لچک نہ پیدا ہوجائے
کہ ان کا زور جو کے زور پر غالب آوے آخر جب زیادہ حرارت پانی کو
پہنچتی ہے اور ابخرے جو کے دباؤ پر غالب آجاتے ہیں تو بخار کے بلبلے پانی
کے سطح پر سے نکلکر بھاگنے لگتے ہیں اور پانی پکنے لگتا ہے اور اسی کا
نام جوش ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اگر جو کا دباؤ زیادہ ہو تو حرارت زیادہ
درکار ہوگی ابخروں کو دیر میں اس قدر طاقت حاصل ہوگی کہ جو کے
بوجھ کو اٹھا کر اپنی راہ نکالیں اور اگر کم ہو تو تھوڑی حرارت کافی

ہوگی اور جوش کھانے میں عرصہ کم لگے گا مگر پہاڑوں کی بلندی پر اگرچہ
پانی بہت جلد اُبلنے لگتا ہے مگر اثر اُس کا اُسی قدر ہوتا ہے جس قدر
حرارت پہنچتی ہے اس کی اُمید نہ رکھنی چاہیے کہ پانی کے اُبلنے
کے ساتھ چانول بھی گل جائیں گے یا گوشت پک جائیگا - اگر آنچ تیز
نہ ہو تو گھنٹوں ادھن اُبلا کرے گا اور پکانے والے کی دال نہ گلے گی
اس مسئلے کی ایک نظیر بہت عمدہ اور آسان یہ ہے کہ کسی آتشی
شیشے میں پانی ڈال کر جوش کرو جب خوب اُبلنے لگے اُس وقت
اُس کے مونہہ پر ڈاٹ مضبوط لگا کر جلدی سے اوتار لو اور تھوڑی دیر تک
اُس سے خبر نہ ہو بعد اس کے کوئی رومال ٹھنڈے پانی میں تر کر کے
شیشہ پر ڈال دو فورًا پانی پھر اُبلنے لگے گا اور جب رومال اٹھا لوگے
اُبلنا موقوف ہو جائے گا اسکی یہ وجہ ہے کہ شیشہ جب آگ پر سے اُتار
لیا گیا اُس وقت پانی خوب کھول رہا تھا تھوڑی دیر میں کھولنا اُس کا
موقوف ہو گیا اور انجرے اُس کے گلو میں بھر گئے اور اُن کے بوجھ نے
تازے انجروں کا نکلنا اور پانی کا جوش کھانا موقوف کر دیا پھر جب
بھیگا ہوا رومال اُس پر ڈالا گیا تو اُس کی سردی نے شیشے کے گلو میں
جس قدر بخار بھرا ہوا تھا اُسے پانی بنا دیا اور دباؤ اُن کا اٹھا دیا
اس واسطے انجروں نے پھر زور کیا اور اوپر نکلنے لگے اور پانی دوبارہ

کھولنے لگا۔ یہ عمل متواتر کیا جاسکتا ہے اور ہر مرتبہ یہی تماشا نظر آتا ہے کہ بظاہر احوال سردی سے پانی اُبلنے لگتا ہے دیکھنے والے تعجب کرتے ہیں اور جو اصل حال نہیں جانتے اس کو جادو اور شعبدہ سمجھتے ہیں۔

(۲۲) جس طرح ۲۱۲ درجے کی حرارت سے پانی جوش کھا کر بخار بنجاتا ہے اسیطرح جب حرارت گھٹ کر ۳۲ درجے پر آجاتی ہے تو پانی جم کر برف بنجاتا ہے اور ایک طرفہ امر یہہ ہے کہ برف میں بنسبت آبِ سرد کے تخلخل زیادہ ہوتا ہے یعنے اجزاء اس قدر باہم متصل نہیں ہوتے ہیں جس قدر پانی کے اجزاء باہم متصل ہوتے ہیں۔ بتجربہ و امتحان معلوم ہوا ہے کہ ۴۰ درجے میں پانی کو انتہائے مرتبہ کا تکاثف یعنے گاڑھاپن حاصل ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ گرمی پہنچنے سے پانی کے اجزاء میں انبساط ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جب حرارت کا درجہ بڑھتے بڑھتے ۲۱۲ تک پہنچ جاتا ہے اُس وقت قوام اس کا بالکل متغیر ہونے لگتا ہے اور پانی سے بخار بننے لگتا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس حرارت کا گھٹنا بھی پانی کے انبساط کا باعث ہوتا ہے یعنے ۴۰ درجے سے جس قدر حرارت کم ہوتے جاتی ہے اُسی قدر پانی پھیلتا جاتا ہے یہاں تک کہ جگر

برف بننے میں پانی کا حجم (۱) سے (۱:۰۹۹) ہو جاتا ہے اگرچہ
بظاہر یہ خاصہ پانی کا جملہ مادیات کی عادت کے خلاف معلوم
ہوتا ہے اور مشکک شک کر سکتا ہے کہ اس ایک شئے کو قاعدہ
عام کے خلاف خلق کرنے میں کیا حکمت ہے کل چیزیں سردی سے
منقبض ہوتی ہیں گرمی سے پھیل جاتی ہیں پانی کیوں سردی سے
پھیلتا ہے اور گرمی سے ایک حد تک منقبض ہوتا ہے لیکن حکیم خدا پرست
جانتا ہے کہ اس تخصیص میں ایک غرض خاص پوشیدہ ہے جو
انتظام عالم میں اپنا کرشمہ دکھاتی ہے اور مخلوق کے واسطے
موجب بہبودی و آسائش ہوتی ہے حکیم اس شکاک کا یہ جواب دیگا
کہ اول تو خلاف قاعدہ کلیہ ہونا اس کا غیر مسلم ہے کیونکہ شاید (۳۰)
درجے سے نیچے جاکر پانی کا پھیل جانا کسی ایسے سبب مخفی پر موقوف ہے
جو آج تک ہماری تحقیق میں نہیں آیا جس دن وہ سبب ہم پر ظاہر ہو جائیگا
اس دن شاید یہ بھی معلوم ہو جائے کہ قاعدہ کلیہ ہمارا پانی پر بھی
جاری اور صادق ہے اور دوسرے یہ کہ اس خاصہ میں پانی کے
بہت سے منافع ہیں اگر پانی مثل اور اجسام کے ہوتا تو یہ منافع
اس سے حاصل نہ ہوتے بلکہ بعض مخلوقات کو بڑا صدمہ پہنچتا اس
قاعدہ کا ایک ادنیٰ منفع یہ ہے کہ اس کے باعث بہت سی چشموں میں

پتھر کی پہاڑ میں سے خود بخود جدا ہو جاتی ہیں اور آدمی کے کام
آتی ہیں کیونکہ سرد ملکوں میں پہاڑوں کی سوراخوں میں پانی جمع
ہوتا رہتا ہے اور جاڑوں کی فصل میں جم جایا کرتا ہے اور جمتے
ہی پتھروں کو توڑ دیتا ہے اور رفتہ رفتہ ایک کو دوسرے سے جدا
کر دیتا ہے۔ بعض بلاد ایسے ہیں کہ وہاں موسم سرما میں جھیل تالاب
دریا سمندر سب کے سب جمنے لگتے ہیں مگر چونکہ جمنے کے بعد
پانی کا حجم بڑھ جاتا ہے چنانچہ برف پانی سے ہلکی ہوتی ہے اس وجہ سے
جو پرت پانی کی پہلے جم جاتی ہے وہ اوپر ہی تیرا کرتی ہے نیچے
ڈوبنے نہیں پاتی اور چونکہ یہ تہ برف کے پانی اور ہوا کے مابین
حایل رہتی ہے اس واسطے پانی کی حرارت نکلنے نہیں پاتی اور باہر
سرد زمہریری ہوا اس پر اثر نہیں کر سکتی اور اسے جما کر برف نہیں
بنا سکتی۔ آبی جانور راحت سے پانی کے اندر بسر کرتے ہیں اور جب
جاڑے نکل جاتے ہیں تو وہ تہ برف کی پگھل جاتی ہے اور دریا اور
تالاب وغیرہ اپنی اصلی حالت پر آ جاتے ہیں۔ اگر پانی جمنے سے پھیلتا
نہ ہوتا بلکہ حجم میں گھٹتا ہوتا تو برف پانی سے بھاری ہوتی اور جب
ان بلاد میں پانی جمنے لگتا تو پرتیں برف کی جمتی جاتیں اور نیچے
بیٹھتی جاتیں یہاں تک کہ تھوڑے عرصے میں تہ آب سے سطح آب تک

سب برف ہی برف ہوتی آبی جانور مرجاتے اورتابستان کی فصل میں
بھی تھوڑے ہی عمق تک برف پگھلتی نیچے کی برف پر حرارت آفتاب
کچھ بھی اثر نہ کرتی۔

(۲۲) ہیڈروجن گیس جس کی کچھ صفت اوپر بیان ہو چکی ہے
نہایت درجہ ہلکا جسم ہے۔ اگر جھلی کا غبارہ بناکر اس میں یہ گیس بھردیجائے
تو اپنی خفت کی وجہ سے اُسے لے اڑتی ہے بلکہ اس کے ساتھ
سنگین چیزوں کو بھی اڑالیجاتی ہے چنانچہ اس زمانہ میں جو لوگ
غبارہ پر بیٹھ کے سفر کرتے ہیں وہ اسی گیس کے بل بوتے پر اڑتے
ہیں۔ علاوہ پانی کے بہت سی چیزوں میں یہ گیس شریک ہے مثلاً تیل
چربی۔ کانی کوئلا۔ لکڑی وغیرہ اور جب یہ چیزیں ہوا میں جلتی ہیں
اُس وقت ان کی ہیڈروجن اکسیجن کے ساتھ ملکر پانی بن جاتی ہو
گو وہ پانی ہم کو نظر نہ آوے اور ابخرہ کی شکل میں غایب ہو جاوے۔

(۲۳) پانی کے فوائد کوئی کہانتک بیان کر سکتا ہے دیکھو
آدمی کو اس سے کس قدر راحت پہنچتی ہے۔ پیتا ہے تو دل کو اور
معدہ کو اور زبان کو کیسی تسکین ہوتی ہے۔ نہاتا ہے تو کتنی صفائی
اور فرحت اور تازگی بدن وروح کو حاصل ہوتی ہے۔ اس میں نہ بو ہے
نہ مزا کہ کسی شخص کو کسی وقت ناگوار ہو۔ یہ وہ تبرید ہے کہ کوئی

کوئی جوشاندہ اور خیساندہ اسکی ٹھنڈک کو نہیں پہنچتا۔ یہ وہ شربت ہے کہ
کسی دوا اور کسی شراب کو اس کے آگے رتبہ نہیں۔ جس قدر حرارت
تیس رطل پارہ کو (۶۰) درجے سے (۶۱) درجے تک گرم کردیتی ہے
اس قدر حرارت فقط ایک ہی رطل پانی پر اس قدر اثر کرتی ہے یعنے
پانی کے گرم کرنے میں حرارت بہت زیادہ صرف ہوتی ہے مثل اور
اجسام رقیق کے یہ جلد گرم نہیں ہوتا اور جب پانی ابخرہ بننے لگتا ہے
اس وقت اور بھی زیادہ حرارت اس میں صرف ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ
اس شراب الصالحین میں اس قدر قوتِ مبردہ ہے اور اس کا
پینا یا اس سے نہانا اس درجہ حرارتِ بدن کو دور کردیتا ہے اور مسامات
بدن سے اس کا ہر وقت ابخرہ بن کے نکلتا رہنا خصوص موسمِ تابستان
میں اس قدر بدن کو سرد رکھتا ہے۔

(۲۵) پانی میں بہت سی چیزیں گھل جاتی ہیں اور بہت سی چیزیں
نہیں گھلتی ہیں مثلاً کوئلا گندھک۔ کھریا مٹی کو یا ین وغیرہ پانی میں
ملائی جائیں تو حل نہیں ہوتی ہیں بخلاف اس کے نمک۔ شکر۔ شورہ
سبھی وغیرہ پانی میں گھل جانے والی چیزیں ہیں مگر ان میں بھی تمیز ہے
بعض چیزیں کم گھلتی ہیں مثلاً نمک یا شورہ آبِ سرد میں گھولا جائے تو
ایک حد معین تک گھلتا چلا جائے گا اگر اس سے زیادہ ڈالا جائے

تو نہ گھلے گا یعنے اگر ایک رطل پانی میں چھے اونس سے زیادہ ڈالا جاوے تو جس قدر زیادہ ہوگا وہ سالم رہ جائے گا بخلاف اس کے شکر بہت گھلتی ہے ایک رطل میں سیر بھر شکر بخوبی گھل جاتی ہے -

(۲۶) یہی وجہ ہے کہ آب خالص کہیں نہیں دستیاب ہوتا - کنوؤں اور باؤلیوں میں پانی ارد گرد کی زمین سے رس کر جمع ہوتا ہے اور بہت سے اجزائے جمادی و نباتی و حیوانی گھولکر ساتھ لاتا ہے جن شہروں میں کوڑا جمع ہوتا ہے اور صفائی بخوبی نہیں ہوتی اور غلیظ شہر کا دور نہیں پھینکا جاتا اور بدرو گندہ اور میلی رہا کرتی ہے وہاں کے کنویں بہت خراب ہوتے ہیں اُن کا پانی کثیف ہوتا ہے اور اُسکے پینے سے آدمی بیمار ہوتا ہے اکثر یہ پانی وبا کا باعث ہوتا ہے - ایسے مقاموں میں آبادی کے باہر سے پانی منگوا کر پینا بہتر ہے قبرستانوں کے گرد و نواح میں بھی پانی بگڑ جاتا ہے - مادہ متعفن کنوؤں تک سرایت کر جاتا ہے سمندر کے پانی کی تلخی کا یہی باعث ہے کہ زمین پر سے اجزائے ملحی دریا اور بارش کے پانی میں گھل گھل کر سمندر میں ملتے ہیں اور سمندر کا پانی ہمیشہ آفتاب کی حدت سے خشک ہوتا رہتا ہے اور اُسکے سطح پر سے انجرے اُٹھتے ہیں اور ان انجروں میں کوئی جزو صلب شریک نہیں ہوتا خالص پانی کے انجرے ہوتے ہیں اور علاوہ صلب اجزا کے

اجزائے ہوائی بھی پانی میں گھل جاتے ہیں مثلاً ہوائے جو سمندر اور دریا اور تالاب اور کنواں سب کے پانی میں گھلی ہوئی پائی جاتی ہے مگر عجب کی جائے یہ ہے کہ اگرچہ ہوائے جو میں آکسیجن کا وزن سو میں (۲۱) حصہ ہے لیکن پانی میں یہ گیس (۳۱) سے (۳۳) تک پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا نفع یہ ہے کہ دریائی جانوروں کو بمقدار کافی آکسیجن پہونچتی رہتی ہے اگر اس مقدار سے کم آکسیجن ہوا کی پانی میں ملتی تو شاید ان کا جینا دشوار ہوتا۔

(۲۷) ناظرین کو معلوم ہے کہ پانی باعتبار قوام کے تین صورتیں پیدا کرتا ہے۔ انجماد کی حالت میں اسے برف بولتے ہیں۔ مائعیت کی صورت میں پانی کہلاتا ہے اور جب پانی رقیق بنکر ہوا کی صورت پیدا کرتا ہے اس وقت اسے بخار کہتے ہیں۔ حرارت کی کمی یا زیادتی ان تغیرات کا باعث ہوتی ہے۔ متوسط حالت میں پانی پانی ہے اگر حرارت زیادہ پہنچے تو بخار بنکر اُڑ جاتا ہے اور اگر حرارت کم ہو جائے تو جمکر برف بنجاتا ہے۔ ابخرے اگر ٹھنڈے ہو جائیں تو پانی ہو جاتے ہیں اور اگر زیادہ سردی پہنچے تو برف بن جاتے ہیں علیٰ ہذالقیاس برف بھی گرمی سے پگھل کر پانی اور پانی سے بخار بن جاتی ہے۔ غرض یہ کہ پانی کا بہروپیا پن حرارت کا ایک کرشمہ ہے اب دیکھنا

چاہیئے کہ اس بازی گری کا کیا ثمرہ ہے کیونکہ طبیعت کا کوئی فعل عبث نہیں ہوتا۔ اس کا لہو و لعب عین حکمت ہے۔ اس کی حقہ بازی طلسم کشائے عالم کون و فساد ہے۔ تحقیق و تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ ابر و باران و طوفان و دریا و برف و ژالہ و تگرگ وغیرہ جن سے دنیا کے لوگوں کو ہر روز سروکار رہتا ہے اسی پانی و ہوا کے آوردہ ہیں اور یہ سب کرشمہ حرارت کے ہاتھوں کا پھیلایا ہوا ہے جس کا معدن خورشید جہاں تاب ہے تفصیل اس اجمال کی فقرات ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

(۲۸) اگر بھیگا ہوا کپڑا الگنی پر پھیلا دیا جائے تو تھوڑی دیر میں خشک ہو جاتا ہے اور اگر الگنی تک دھوپ پہنچتی ہو تو زیادہ تر سرعت کے ساتھ خشک ہو جاتا ہے اور اگر اس کے نیچے آگ جلا دی جائے تو اس سے بھی جلد تر سوکھ جاتا ہے بخلاف اس کے اگر اسے لپیٹ کر صندوق میں بند کر دو تو مدتوں نم رہتا ہے کسی رکابی میں تھوڑا سا پانی ڈالکر دھوپ میں رکھدو تو تھوڑے دنوں میں رکابی خالی ہو جاتی ہے۔ گرمی کی فصل میں یہ آثار جلد تر مترتب ہوتے ہیں مرطوب ایام میں کاغذ پر روشنائی تک مشکل سے خشک ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے کس نے نہیں دیکھا ہے کہ ہمارے ملک میں تالاب

اور جھیلیں گرمیوں کے ایام میں خشک ہو جاتی ہیں۔ آخر یہ پانی کیا ہوتا ہے
اور خشک ہو جانے کے کیا معنی ہیں اس سوال کا جواب آسان ہے
گرمی کے سبب سے پانی رقیق ہو کر بخار بن جاتا ہے اور ہوا میں
مل جاتا ہے اور ہماری نظروں سے غایب ہو جاتا ہے کیونکہ بخار
بھی مثل ہوا کے بو اور رنگ اور مزے سے مبرا ہے اور شامّہ و
باصرہ و ذائقہ اس کے ادراک سے عاری ہے ہاں اگر بار دگر اس بخار
کو سردی پہنچائی جائے یعنے حرارت اُسکی کم کر لی جائے تو پھر اپنی
اصلی حالت مائیعت پر آجاتا ہے اور آنکھوں سے نظر آنے لگتا ہے
چنانچہ کسی گلاس یا پیالے میں تھوڑی سی برف چور کر کے ڈال دو تو
اس کے باہر کی سطح پر ایک تہ شبنم کی جم جاتی ہے۔

(۲۹) یہی کارخانہ پانی کے خشک ہونے کا سمندر کی سطح پر جاری ہے
آفتاب کی حرارت خشکی اور تری دونوں کو گرم کرتی رہتی ہے اور
اس گرمی کی وجہ سے پانی بخار بنکر ہوا میں مل جایا کرتا ہے اور چونکہ
بخار ہوا سے ہلکا ہوتا ہے اس واسطے ہر دم نئی ہوا سطح دریا سے
ملصق ہوتی ہے اور بخار کے پیدا ہونے میں معین ہوتی ہے۔
بخار کا ہوا میں مل جانا اُس طرح کا ہے جسطرح نمک پانی میں ملجاتا ہے
یعنے ایک حد معین تک ملتا چلا جاتا ہے جس سے تجاوز کرنیکے بعد ہوا

زیادہ بخار قبول نہیں کرتی اور جس طرح گرم پانی میں سرد پانی کی نسبت
نمک زیادہ گھل جاتا ہے اسیطرح ہوا جس قدر زیادہ گرم ہو ابخرے اسمیں
زیادہ مل جاتے ہیں اور جسطرح گرم پانی میں تا حد استعداد قبول نمک
گھول دینے کے بعد جس قدر پانی ٹھنڈا ہوتا جاتا ہے اُسی اندازہ سے
نمک جگر پانی سے جدا ہوتا جاتا ہے اُسی طرح گرم اور مرطوب ہوا بھی
جس قدر ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے اُسی قدر اسمیں قابلیت ابخروں کے
قبول کرنیکی کم ہوتی جاتی ہے اور پانی بنتا جاتا ہے الغرض جس قدر
ہوا میں حرارت زیادہ ہو اسی قدر اُس میں بخار کے اُٹھانے کی استعداد
زیادہ ہوتی ہے۔ بہت ٹھنڈی ہوا میں ہمیشہ رطوبت کم ہوتی ہے اور
یبوست غالب ہوتی ہے۔

جاڑوں کی ہوا کو دیکھو کیسی خشک ہوتی ہے کہ جلد بدن پر اُسکی
یبوست کا اثر پیدا ہوتا ہے اور آدمی کو موم روغن کی حاجت ہوتی ہے
اور برسات میں بخلاف اس کے جلد نرم رہا کرتی ہے۔ گرمیوں میں اگرچہ
ابخرے جاڑوں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں مگر ہوا ایسی گرم ہوتی ہے کہ
اُس میں استعداد قبول بہت ہوتی ہے اور رطوبت محسوس نہیں
ہونے پاتی۔

(۳۰) آفتاب کی حدت اُن بلاد پر زیادہ موثر ہوتی ہے جو سال میں

کبھی نہ کبھی عین اس معدنِ حرارت کے نیچے آجاتے ہیں۔
مدارِشمس جسے طریق الشمس و منطقۃ البروج بھی کہتے ہیں اس کے میل کلی سے خط استوا کے دونوں جانب دو حدیں قایم ہوتی ہیں جن کے اندر آفتاب کبھی نہ کبھی سمت الراس میں ہوتا ہے شمال کیجانب طریق الشمس کا میل کلی برج سرطان تک ہے اور جنوب میں برج جدی تک اور ان کے مابین سینتالیس درجہ کا فاصلہ ہے وہ بلاد جوان دونوں برجوں کے اندر واقع ہیں اقالیم حارہ کہلاتے ہیں انگریزی زبان میں اس کو منطقۂ حارہ کہتے ہیں اس منطقہ میں گرمی بشدت ہوتی ہے اور جس قدر خط استوا سے قریب تر واقع ہو ملک گرم تر ہوتا ہے۔

(۱۳۱) اس منطقہ میں آفتاب کے عمودی اشعۂ زمین کو نہایت گرم کر دیتے ہیں اور زمین سے گرمی منعکس ہوکر ہوا کو گرم اور سبک کرتی ہے یہ سبک ہوا بوجہ خفت کے سطحِ زمین سے بلند ہوکر اوپر کو صعود کرتی ہے اور اُس کی جگہ ٹھنڈی ہوا اردگرد سے آکر سطحِ زمین پر مجتمع ہوجاتی ہے اور پھر یہ بھی گرم ہوکر بلند ہوجاتی ہے اور میدان اردگرد کے ٹھنڈی ہوا کے ہاتھ چھوڑ جاتی ہے یہ ردوبدل برابر چلا جاتا ہے۔ چنانچہ آسان ثبوت اس مسئلے کا مبتدی اس طرح حاصل کرسکتا ہے کہ کسی لوہے یا تانبے کے برتن کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈالدے جب خوب گرم ہوجائے

تو اُسے نکالکر کسی بلند مقام پر رکھدے اب اگر کوئی نہایت باریک
اور ہلکا سفوف جس کو ہوا بآسانی اڑالیجا سکتی ہو اس گرم برتن پر چھڑکا
جائے تو وہ اوپر کی جانب صعود کرے گا کیونکہ برتن کی گرمی نے ایک
دھار ہوا کی ایسی پیدا کر دی ہے کہ وہ نیچے سے اوپر کو جاتی ہے۔
جس کسی نے مکانوں میں آگ لگتے دیکھی ہو وہ بھی گواہی دیسکتا ہے کہ
آگ بھڑکنے کے ساتھ ہوا تند چلنے لگتی ہے اور اردگرد سے کھنچکر شعلے
کے ساتھ اوپر کی طرف جھپٹنے لگتی ہے اور شعلے کے زبانہ کو گزوں
بڑھالیجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جلتی ہوئی چیزوں کا دھواں بھی
اوپر کو اُڑتا ہے اور زبانہ سے بہت بلند ہونے کے بعد پھر کہیں
منتشر ہوتا ہے حالانکہ دھواں بھاری چیز ہے اگر کسی دھار کے
سمیٹ میں نہ آجائے تو پھیل کر زمین کے متصل ٹھہر جاتا ہے۔
(۳۲) آفتاب کی شعاعیں پانی کی سطح کو بھی گرم کرتی ہیں مگر
نہ اُس قدر کہ جس قدر زمین کو۔ پانی کی گرمی ہوا کی اُس تہ کو جو اُس کی
سطح سے مماس ہے گرم کر دیتی ہے اور یہاں بھی وہی نقشہ پیدا ہوتا ہے
جو خشکی میں ہوتا ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ پانی کی گرم سطح گرمی بھی
پہنچاتی ہے اور ساتھ ہی اس کے ابخرے بھی ہوا میں پھیلاتی ہے اور
چونکہ سطح پانی کی منطقہ حارہ میں نہایت وسیع ہے اس واسطے ہوا

بھی اس طبقے کی نہایت سیراب ہوتی ہے اور ابخروں سے پیٹ بھر لیتی ہے۔ یہ گرم اور سیراب ہوا بلند ہوکر دو کرشمے دکھاتی ہے۔

(۳۳) اول یہ کہ منطقۂ حارہ کی سطح پر سے ہوا بلند ہوکر قطب شمالی اور قطب جنوبی کی جانب پھیلتی جاتی ہے اور جس قدر قطبین سے قریب تر ہوتی جاتی ہے اُسی قدر پست تر ہوتی جاتی ہے کیونکہ سطحِ ہوائی جانبین سے بلند ہونے کے بعد اس ہوا میں اُتنی گرمی نہیں رہتی اور سردی کے سبب سے بھاری ہوکر زمین کی طرف مائل ہوتی ہے اور جذب مرکز اُس پر غالب آجاتا ہے اس وجہ سے دو دھاریں ہوا کی منطقۂ حارہ میں سطح زمین سے نہایت بلندی پر قطبین کی جانب چلا کرتے ہیں۔ جیسا شکل ذیل کے دیکھنے سے معلوم ہوگا اس شکل میں تیر کا نشان رخ ہوا کا بتاتا ہے اور قوس ق ق دائرہ نصف النہار کی قوس فرض کر لی گئی ہے اور خط س س سے خط استوا مراد ہے اگر زمین ساکن ہوتی تو یہ دھاریں ٹھیک جنوب و شمال رویہ ہوتیں مگر چونکہ زمین متحرک ہے اور خط استوا سے قطبین تک دوایر متوازیہ کی سرعت سیر بوجہ کرویت زمین کے گھٹتی جاتی ہے اس واسطے رخ ان دھاروں کا قطبین کے قرب کے باشندوں کو جنوب مغرب رویہ اور شمال مغرب رویہ معلوم ہوگا اور جب گرم ہوا منطقۂ حارہ سے

بلند ہو کر اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہے تو اُس کے ساتھ ہی قطبین کی جانب سے
ٹھنڈی ہوا اپنے حیز سے حرکت کر کے منطقۂ حارہ کی طرف چلتی ہے
چنانچہ اس سبب سے دو دھاریں اور پیدا ہوتے ہیں جو سطحِ زمین سے
ملصق اور پہلے دھاروں سے نیچے چلتی ہیں اور رُخ ان کا پہلی
دونوں دھاروں کے بالکل مخالف ہوتا ہے یعنے یہ قطبین سے
خط استوا کی طرف چلتی ہیں جیسا
کہ شکل ذیل کے دیکھنے سے معلوم
ہو گا مگر چونکہ زمین متحرک ہے اور
خطوط متواتر یہ کی سرعت قطبین سے
خط استوا تک برابر بڑھتی جاتی ہے
اسواسطے خط استوا کے متصل
رہنے والوں کو یہ دونوں ہوائیں
جنوب مشرق رویہ اور شمال مشرق رویہ معلوم ہوں گی شکل ذیل سے
رخ ان چاروں دھاروں کا
بخوبی واضح ہو جائے گا اس
شکل میں س س، خط استوا ہے
ق قطب شمالی ق، قطب جنوبی
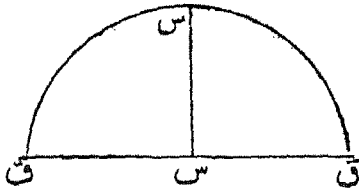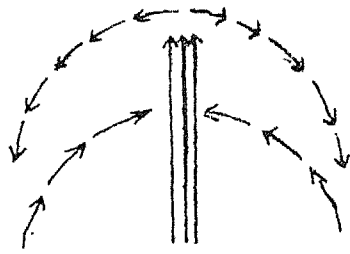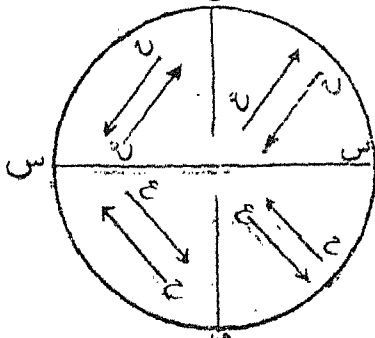
شکل ۹

جن تیروں پر ح کا نشان ہے وہ نیچے والی دھاروں کی سمت بتاتے ہیں جن پر ع کا نشان ہے وہ اوپر والی دھاروں کی سمت بتاتے ہیں۔

(۳۴) ہوا کی یہ نیچے والی دھاریں تجار اور جہاز رانوں کے بہت کام آتی ہیں۔ بادبانی جہازوں کا مدار اسی پر ہے ہزاروں میل اسی ہوا کی اعانت سے طے کرتے ہیں اسواسطے یہ دھاریں باد تجارت کہلاتی ہیں۔ اوپر والی دھاریں اس قدر بلند ہیں کہ اُن سے جہاز رانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا ہے مگر نظام عالم میں اُن کے بھی ذمہ ایک بڑی بھاری خدمت ہے جس کا بیان آگے لکھا جائے گا۔

اس فقرے میں بعض نتائج باد تجارت کے حوالہ قلم ہوتے ہیں

(۱) قطبین کی طرف سے جو دھاریں ہوا کی خط استوا کی طرف چلتی ہیں یا اُن کو خط استوا یا اُس کے قرب وجوار میں تلاقی ہونا ضرور ہے پس یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کے باہم ٹکرانے سے قوت دونوں کی شکستہ ہو جائے گی اس واسطے خط استوا کی دونوں جانب دور دور تک منطقہ سکون کہلاتا ہے۔

(۲) مگر چونکہ ان دونوں دھاروں میں مواجہت کامل نہیں ہے

بلکہ شمال مشرق رویہ اور جنوب مشرق رویہ چلتی ہیں اس واسطے
ان کی تلاقی سے ایک دھار پُروا ہوا کی پیدا ہوتی ہیں جو دائما
پورب سے پچھم کی جانب چلا کرتی ہے - اس کو قبول تجارت
کہتے ہیں -

(۳) اور چونکہ باد تجارت کی دونوں دھاروں میں تلاقی کامل نہیں
ہوتی بلکہ خط استوا کے قرب وجوار میں جو دھار گرم ہوا کی اوپر کو
صعود کیا کرتی ہے بیچ میں حایل ہوتی ہے اس وجہ سے اس
منطقہ میں ایک سکون بے ثبات پیدا ہوتا ہے جسے ادنیٰ تغیر
حرارت و برودت وغیرہ متغیر کر دیتا ہے چنانچہ اس منطقہ میں بوجہ
تلوّن موسم جہازرانوں کو بڑا خطرہ رہا کرتا ہے - دفعتہً طوفان اور
گرد باد چلنے لگتا ہے اور دفعتہً ایسا سکون جو میں ہو جاتا ہے کہ
پتہ تک نہیں ہلتا -

(۴) بیرامیٹر یعنے ہوا پیما پر اس ردّ و بدل کا یہ اثر ہوتا ہے کہ
منطقہ حارہ میں جہاں سے ہوا گرم ہو کر بلند ہوا کرتی ہے بُوجھ
جو کا بہت کم ہو جاتا ہے چنانچہ س س میں آلہ ہوا پیما کا سیماب
نیچا ہوا کرتا ہے اور ق ق میں جہاں اوپر والی ہوا جا کر جمع
ہوتی ہے سیماب بلند ہوتا ہے - اور عموماً خط استوا کے قرب و جوار

میں سیماب نیچا ہوگا اور اُس سے دور اونچا ہوگا اور گرمیوں میں بہ نسبت جاڑوں کے نیچا ہوگا۔ ہمارے ملک میں مئی اور جون کے مہینے میں سیماب جاڑوں کی نسبت ایک انچ کے قریب نیچا ہوتا ہے جب کبھی آلہ ہوا پیما کا سیماب فصل کی معمولی بلندی سے نیچا ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ طوفان) یا تند باد کی آمد ہے یعنے ہوا گرم اور ہلکی ہو کر ہمارے حوالی سے نکل گئی پس ضرور ہے کہ ارد گرد کی ٹھنڈی ہوا اس کی جگہ لینے کو جھپٹے اور تند باد یا طوفان یا گردباد پیدا کرے۔

(۳۵) باد تجارت اختلاف حرارت اقلیمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے مگر فصلی اختلاف حرارت کے باعث بھی ہوا کی دھاریں مختلف بلاد میں مختلف وضع کی پیدا ہوتی ہیں چنانچہ ہندوستان میں جب مئی اور جون کی گرمی سے سارا طبقہ راجپوتانہ اور پنجاب اور ممالک شمالی و مغربی وغیرہ بلاد کا تپنے لگتا ہے اور ہوا بشدت گرم ہو جاتی ہے اُس وقت خط استوا کے پار سے ابخروں سے چھکی ہوئی ہوا ہندوستان کی طرف حرکت کرتی ہے اور جنوب مغرب رخ یہ چلتی ہے اس کو باد موسمی کہتے ہیں۔ ہماری برسات اسی کی بدولت ہوتی ہے اور برسات کی ہوا یہی ہوا ہے۔

یہ ملک دکن بھی اسی ہوا سے سیراب ہوتا ہے علاوہ اس کے
اناٹ اور باد موسمی بنگالہ اور ہندوستان وغیرہ میں شمال یا شمال مغرب
رویہ چلتی ہے اس ہوا کا سبب یہ ہے کہ اسٹریلیا وغیرہ بلاد جنوبی
خط استوا جس زمانے میں بشدت گرم ہو جاتے ہیں اُس زمانے میں
ہمارے ملک میں جاڑوں کی فصل ہوتی ہے اور ہمارے ملک کی
ٹھنڈی ہوا کھینچکر اُس ملک کو جاتی ہے اور اُسے تازگی پہنچاتی ہے اور
وہاں کی گرم ہوا اوپر ہی اوپر ہندوستان اور پنجاب کی طرف آتی ہے
اور گندہ بہار برساتی ہے جس سے ہماری ربیع سیراب ہوتی ہے۔علاوہ
ان ہواؤں کے جو فصلی ہیں اور بہت سی مختص المقام دھاریں ہوا کی
ہر جگہ بوجوہ واسباب عارضی پیدا ہوتی ہیں۔علم طبعی کا جاننے والا
ان سب کے وجوہ بآسانی بتا سکتا ہے اس مختصر میں اُن کے بیان
کی گنجایش نہیں ؎

(۳۶) دوسرا کرشمہ منطقہ حارہ کے ابخروں سے جھکی ہوئی گرم ہوا کا
یہ ہے کہ ربع مسکون کو مینھ پہنچاتی ہے اور بلاد وممالک کو سیراب کرتی ہی
اور حیوان ونبات کی زندگی میں معین ومددگار ہوتی ہے۔ پہلے جھکی ہوئی
ہوا کی تعریف سمجھ لینی چاہئے۔ جھکی ہوئی ہوا اُسے کہتے ہیں جس نے
ابخروں سے پیٹ بھر لیا ہو یعنے اپنی حد استعداد تک ابخرے اُٹھالئے ہوں

اور زیادہ انجرے اُسمیں نہ سما سکتے ہوں۔

فقرۂ ۳۰ میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ استعداد حرارت ہوا کے ساتھ تناسب رکھتی ہے یعنے جس قدر ہوا گرم زیادہ ہوگی اُسی قدر انجرے زیادہ اُٹھائے گی مثلاً یہ فرض کیا جائے کہ ج درجۂ گرم ہوا سوا نچہ مکعب انجرے اُٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور د درجۂ گرم ہوا پچاسی انچہ مکعب انجرے اُٹھانیکی صلاحیت رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ ج درجہ کی چھکی ہوئی ہوا اگر کسی طرح اس قدر سرد ہو جائے کہ گرمی پیما میں سیماب کو د درجہ تک اوتار دے تو بمجرد اس تغیر کے ۱۰۰-۸۵ یعنے ۱۵ انچہ مکعب انجرے اُس ہوا میں جمکر جدا ہو جائیں گے اور ہوا چھکی کی چھکی رہے گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ج درجہ کی ہوا اگر چھکی ہوئی نہ ہو بلکہ سوا نچہ سے کم مگر پچاسی انچہ سے زیادہ انجرے اس میں ملے ہوئے ہوں جب بھی د درجہ تک اُترتے ہی اس میں سے کچھ انجرے جدا ہوں گے کیونکہ ہم فرض کر چکے ہیں کہ د درجہ کی ہوا فقط پچاسی ہی انچہ انجرے اُٹھا سکتی ہے بخلاف اس کے اگر ج درجہ کی ہوا میں مثلاً فقط پچیس ہی انچہ انجرے ہوں تو د درجہ تک پہونچنے سے پانی کا قطرہ نہیں پیدا ہوگا۔ غرض یہ کہ انجرول دار ہوا کے ٹھنڈے ہونے سے ہمیشہ تھوڑے بہت انجرے جم جاتے ہیں اور اسی قاعدہ پر ابر اور شبنم

اور کہر اور برف اور پالا اور اولے اور مینھ وغیرہ کی پیدایش موقوف ہے
اب مختصر حقیقت ان کائنات جو کی بیان کی جاتی ہے -

(۳۷) ابر کہر اور شبنم سب ایک قسم کی چیزیں ہیں -

بخار جب زمین سے بہت بلند ہونے کے بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ابر پیدا ہوتا ہے اگر زمین کے قریب ہو تو کہر اگھر جاتا ہے اور سطحِ زمین پر اور درختوں کے پتوں پر ہو تو شبنم جمع ہوتی ہے چنانچہ پہاڑ پر کے رہنے والے جس شئی کو کہر اتصور کریں گے وہ دامنِ کوہ کے باشندوں کو ابر معلوم ہوگا - پہلے شبنم کی حقیقت سنیے کہ یہ کیونکر پیدا ہوتی ہے - شبنم کس نے نہیں دیکھی ہے جناب میر انیس مرحوم ومغفور فرماتے ہیں

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار	پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار

یہ موتی سے دانے کس چیز کے ہیں جو صبح کو دوب کے نرم نرم ہرے ہرے پتوں پر اور کھیتوں میں زرد زرد ربیع کے بالوں پر اور چمن میں گل ولالہ ونسرین ویاسمن وشبو دنافرمان وداؤدی پر جھلک رہے ہیں جب سورج کی کرن پھوٹتی ہے ہر قطرہ بجائے خود قوس قزح کو ماند کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ رنگ برنگ کے نگینے جڑے ہیں بقول جناب میر صاحب مغفور

ہیرے خجل ہیں گوہرِ یکتا نثار ہیں	پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار ہیں

یہ سب شبنم کے قطرے ہیں جسے ہندی میں اوس اور فارسی میں ژالہ

کہتے ہیں حکیم حبیب قاآنی ابر و بہار کی تشبیب میں لکھتا ہے -

لبِ غنچہ رُخِ لالہ بروں آورد وہ تبخالہ
زبس باراں ازاں ژالہ بطرفِ گلشن و صحرا
عذارِ گُل خراشیدہ خطِ ریحاں تراشیدہ
زبس الماس پاشیدہ بباغ از ژالہ بیضا

اب دریافت کرنا چاہیئے کہ یہ شبنم جس سے چمن و دمن بہارستان بنجاتا ہے بوٹا بوٹا تر و تازگی پاتا ہے کہاں سے آتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے -

(۴۳) شبنم - جب جاڑوں میں یا برسات کی فصل میں یا گرمیوں کے اوائل و اواخر میں آفتاب چھپ جاتا ہے یا حدت اس کرۂ آتشین کی کم ہو جاتی ہے اُس وقت دن بھر کی تپی ہوئی زمین سے گرمی نکلنے لگتی ہے تھوڑی دیر میں بوٹی پتے درخت لکڑی اور اس قسم کی جتنی چیزیں زمین کے متصل ہیں بہت سرد ہو جاتی ہیں اور ساری حرارت ان کی نکل جاتی ہے اُس حالت میں ان کے سطح سے جو ہوا چھو جاتی ہے وہ بھی سرد ہو جاتی ہے اور تھوڑے بہت ابخرے اُس میں کے جدا ہو کر اُن سطحوں پر قطرے قطرے بنکر جم جاتے ہیں اوس پڑنے کے واسطے چند شرطیں ضرور ہیں - اول یہ کہ ہوا میں

رطوبت موجود ہو یعنے انجروں سے سیراب ہو۔یہی وجہ ہے کہ جس زمانے میں ہمارے ہاں لُون چلتی ہے اور گرمی کی شدت ہوتی ہے راتوں کو شبنم کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ہوتا کیونکہ گرمیوں کی پچھوا ہوا راجپوتانہ اور بلوچستان کے بیابانوں اور ریگستانوں سے آتی ہے اور اس غضب کی گرم ہوتی ہے کہ ہماری سرزمین کی ساری تروتازگی کو چوس لیتی ہے۔اِس فصل میں اوس نہ پڑنے کی ایک اور بھی وجہ ہے جو آگے بیان کی جائے گی۔

دوم یہ کہ آسمان صاف ہو یعنے ابر وغبار وغیرہ حائل نہ ہو جب جومیں ابر پھیلا ہوا ہوتا ہے یا ہمارے ہاں لون کے زمانے میں غبار چھایا ہوا ہوتا ہے تو گرمی زمین کی نکلنے نہیں پاتی بلکہ یہ پردہ حائلِ حرارت کی لہروں کو پھر زمین ہی پر پلٹا دیتا ہے اور سطح زمین گرم کی گرم ہی رہتی ہے اسواسطے ایسی راتوں میں شبنم نہیں پڑتی ہے علیٰ ہذا القیاس مکانوں اور درختوں کے سایہ میں اوس نہیں گرتی

سوم یہ کہ ہوا میں سکون ہو کیونکہ جب ہوا چلتی رہتی ہے تو سطح زمین پر گذر اس سرعت سے ہوتا ہے کہ اُس کی سردی ہوا میں سرایت نہیں کرنے پاتی اور شبنم نہیں گرنے پاتی ہے یا اگر گرے بھی تو کم ہی کم گرتی ہے۔

چہارم یہ کہ جو دو وہ چیز بھی جس کے سطح پر اوس گرے سوائے زیر آسمان ہونے کی اُن چیزوں میں ہو جو دیر میں گرم ہوتی ہیں اور جن میں سے گرمی بہت جلد نکل بھاگتی ہے چنانچہ اگر ایک آئینہ اور ایک شفاف لوہے کا پتّرا اور تھوڑا سا اون اور کچھ گھاس اور ایک چٹان پتھر کی جاڑوں میں زیر آسمان رکھدی جائے تو صبح کو آئینہ اور اون اور گھاس اوس سے تر ملینگی مگر لوہے کے پتّرا اور پتھر کی چٹان پر مطلق نمی نہ ہوگی کیونکہ لوہا اور پتھر بخلاف آئینہ اور اون اور گھاس کے اُس قسم کی چیزیں ہیں جن میں گرمی بہت جلد سرایت کرجاتی ہے پس شب کو زمین کی گرمی انہیں گرم رکھتی ہے۔ اس قدر ٹھنڈا نہیں ہونے دیتی کہ اِن کی سطح پر شبنم گرنے پائے۔ جب کبھی سردی بہت زیادہ ہوتی ہے اور سطحٔ زمین پر تیس یا تبیس درجہ سیماب کی نوبت آجاتی ہے تو بھی اجزے شبنم کے عوض جمکر برف ہو جاتے ہیں اسکو ہمارے ملک میں پالہ بولتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں پوس ماگھ کے مہینے چلے کے جاڑوں کے ہوتے ہیں پالہ اکثر پڑتا ہے اور آلو ارہر چنے وغیرہ کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ سرد ملکوں میں بہار کی فصل میں پالہ پڑتا ہے پالہ اگر ذرہ بین سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اجزا قلم کی صورت کے ہیں اور ہر قلم ایک چھہ ضلع کا مثنو رہے

جس کا ہر زاویہ (۱۲۰) درجے کا ہے -

(۳۹) کہر - ابخرے مثل ہوا کے شفاف ہوتے ہیں مگر یہ اُس وقت نظر آتے ہیں جب کسی سبب سے ہوا ٹھنڈی ہو جائے اور اُس کی ابخرے اُٹھانیکی صلاحیت کم ہو جائے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا - ہمارے ملک میں جاڑے اور برسات کی فصل میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دریا یا تالاب یا جھیل یا زمین مرطوب سے گرم گرم بھاپ اُٹھتی چلی آتی ہے اور زمین کے اوپر سردی پاکر اپنی شفافی کھو دیتی ہے اور آنکھوں سے دکھائی دینے لگتی ہے - اس کو کہر کہتے ہیں کبھی تو کہر ایسی چھا جاتی ہے کہ درخت اور مکان وغیرہ اس میں چھپ جاتے ہیں اور دور سے آدمی کو آدمی نہیں دکھائی دیتا ہے - کبھی کہر اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے اور پانی گرم اور گرم ابخرے سرد ہوا میں ملکر جم جاتے ہیں جیسا ہمارے ہاں جاڑوں میں ہوا کرتا ہے اور کبھی معاملہ بالعکس ہوتا ہے یعنے ہوا گرم ہوتی ہے اور پانی سرد اور پانی کی سردی ہوا کے گرم ابخروں میں سرایت کر جاتی ہے اور سطح آب پر کہر کی تہیں چھا جاتی ہیں - کہر کی حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت باریک پانی کی بوندوں سے مرکب ہے ان بوندوں کی جسامت ایک مقدار کی نہیں ہے بلکہ کبھی زیادہ کبھی کم ہوتی ہے بعض اوقات تو کہر کے

قطرے ایسے باریک ہوتے ہیں کہ فرادیٰ فرادیٰ آنکھوں سے نظر نہیں آسکتے
محض یکجائی کی وجہ سے ہم انہیں دیکھتے ہیں۔ اور کبھی جسامت انکی
ایسی ہوتی ہے کہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اُس صورت میں بھی ان قطروں کا
قطر ۱/۲۵ انچہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ جب چند قطرے باہم ملجاتے ہیں اور
ان کا قطر بڑھ جاتا ہے تو اپنے بوجھ سے زمین پر گر پڑتے ہیں چنانچہ
گہرے کھر میں اکثر باریک باریک پھوہار پڑتی ہے۔ چنانچہ آدمی باہر
ہو تو بھیگ جاتا ہے۔

(۴۰) ابر پہلے بیان ہوچکا ہے کہ ابر اور کھر میں فقط فرق اس قدر ہے
کہ اگر زمین سے بہت بلندی پر دکھائی دے تو اُسے ابر تصور کرتے ہیں
اور اگر سطح زمین کے متصل نظر آسے تو کھر کہتے ہیں۔ اِن دونوں
حوادث کے اسباب ایک ہی ہیں یعنے گرم اور سیراب ہوا کے دفعتاً
سرد ہو جانے سے کھر اور ابر دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہوا
کئی طرح سے سرد ہوتی ہے چنانچہ کھر اور شبنم کے ذکر میں بعض صورتیں
اس کی بیان کی گئیں ہیں۔ چند صورتیں اور یہاں بیان کی جاتی ہیں
جو اکثر ابر کی پیدایش کا سبب ہوتی ہیں۔ ایک اُن میں سے یہ ہے کہ
ہوا جب گرمی کی وجہ سے اوپر کو صعود کرتی ہے تو حجم میں زیادہ
ہو جاتی ہے اور حرارت اُس کی کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر پھیلنے میں

تھوڑی سی ہوا بھرو اور اُسے کسی بلند پہاڑ پر لیجاؤ تو ہوا پھیل کر پھکنے کو
بھردیگی۔ اُس کی خنکی کے امتحان کے واسطے آلہ درکار ہے۔ اس قدر
سمجھ لینا کافی ہے کہ آلات کے ذریعے سے اس کا بھی ثبوت بخوبی
ہوسکتا ہے کہ پھیلنے کے ساتھ ہوا ٹھنڈی ہوجاتی ہے پس جب
سطحِ زمین و دریا پر ہوا آفتاب کی حرارت سے گرم ہوکر اوپر چڑھتی
اور پھیلتی ہے تو ایسی حالت میں اکثر ابر پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ
پہاڑوں کی چوٹیوں پر ابر اکثر نظر آیا کرتا ہے کیونکہ ہوا دامن کوہ سے
ٹکرا کر ضرور اوپر چوٹی کی طرف چڑھ جاتی ہے اور ٹھنڈی ہوکر ابر
پیدا کرتی ہے۔ اس صورت میں ایک اور سبب قوی معین ہوتا ہے
یعنے ایک تو ہوا خود اپنے پھیلاؤ سے ٹھنڈی ہوجاتی ہے دوسرے
جب پہاڑ کی چوٹی سے جاکر ٹکراتی ہے تو اُسکی سطح کی خنکی بھی اُس میں
سرایت کرتی ہے اور اُسے زیادہ تر سرد کر دیتی ہے۔ خطِ استوا کے
متصل کمتر ایسا ہوتا ہے کہ آسمان پر کسی قدر ابر نہ نظر آئے۔
دوسری ایک صورت ابر کے پیدا ہونے کی یہ ہے کہ آفتاب کے
غیبوبت میں کسی خاص مقام کی ساکن ہوا کی گرمی رفتہ رفتہ نکلجاتی ہے
اور یہاں تک خنکی پیدا ہوتی ہے کہ ابخرے اُس کے ابر بنکر نظر
آنے لگتے ہیں۔ ایک صورت اور یہ ہے کہ دو دھاریں ہوا کی

ایک گرم اور ابخروں سے چھکی ہوئی اور دوسری ٹھنڈی دو جانب سے آنکر کسی خاص مقام پر ٹکرا جاتی ہیں اور گرم ہوا سرد ہوا میں ملکر سرد ہو جاتی ہے اور ابر پیدا ہو جاتا ہے۔

(۴۱) اہل فن نے باعتبار ساخت وہیئت ابر کی کئی قسمیں قرار دی ہیں اور اُن کے واسطے جدا جدا نام وضع کئے ہیں یہاں ان قسموں کی تفصیل میں اندیشہ طول کلام کا ہے اس قدر البتہ سب لوگ جانتے ہیں کہ برسنے والا ابر کس شکل کا ہوتا ہے اور نہ برسنے والا کیسا ہوتا ہے۔ ابر کو اگر بغور دیکھنا منظور ہو تو نیلی عینک لگا لینی چاہیے کیونکہ دن کو روشنی کی ایسی تیزی ہوتی ہے اور خود ابر ایسا چمکدار ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھوں میں چکا چوند لگجاتی ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ جو ابر سمت الرأس میں یعنی سر کے اوپر ہو اُسکی شکل وشباہت بہتر اور صاف تر نظر آتی ہے اُس ابر سے جو اُفق کے قریب ہو ابر کی بلندی اور قلت وکثرت ہر وقت اور ہر جگہ ایک حال پر نہیں ہوتی۔ نیچے سے نیچا ابر کبھی زمین کے سطح سے ملجاتا ہے اور اونچے سے اونچا ابر (۲۳) ہزار قدم کی بلندی سے بھی گاہی لساک صاحب کو غبارہ میں بہت بلند نظر آیا عمق ابر کا عموماً نصف میل سے زیادہ نہیں ہوتا ہے مگر کبھی قریب چار میل کے بھی

گھرا ہوتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دس میل سے زیادہ بلندی پر ابر نہیں نظر آتا ہے اور قلت و کثرت کا حال یہ ہے کہ انگلستان میں سال میں بحساب اوسط ۱/۲ وین حصہ آسمان پر گھٹا چھائی رہتی ہے اور بمبئی میں فقط ۲۶/۱۰۰ وین حصہ پر اور شمالی امریکہ میں ۵۳/۱۰۰ حصہ پر حدود منطقہ حارہ کے اندر بعض جائے ایسی ہے کہ وہاں کا آسمان ہمیشہ مکدر رہتا ہے

(۴۲) ابر بھی پانی کے بہت باریک قطروں سے مرکب ہے۔ اور یہ خوب معلوم ہے کہ پانی ہوا سے بہت وزنی ہے پس ضرور ہے کہ ابر رفتہ رفتہ نیچے کو بیٹھتا جائے اور اگر ہوا تند نہ چلتی ہو تو آخر کو زمین پر گر جائے مگر واقع میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ قبل زمین تک پہونچنے کے ابر کو اپنی جائے پیدائشی سے زیادہ گرم اور پیاسی ہوا ملتی ہے جو اس کے مائی قطروں کو چوس لیتی ہے یعنے یہ قطرے گھل کر پھر بخار بن جاتے ہیں اور ہوا میں مل جاتے ہیں مگر جس حالت میں نیچے کی سطح سے اس طرح کی تبخیر ہوتی رہتی ہے ابر کے اوپر کی سطح پر ہر آن انجرے آنکر جما کرتے ہیں اور ابر کا حجم ایک طرح پر قایم رہتا ہے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی اکثر یہی کیفیت ہوتی ہے یعنے دامن کوہ سے ہوا ٹکرا کر اوپر کو چڑھتی ہے اور ابر پیدا کرتی ہے جس کی شکل کبھی نشان کے پھریرے کی سی ہوتی ہے اور کبھی کمر کوہ تک

غلاف سا معلوم ہوتا ہے - اس ابر کو اگرچہ ہوا کی تندی ہر دم بہا لیجاتی ہے اور منتشر کر دیتی ہے مگر ساتھ ہی اُس کے نیچے سے تازہ ہوا پہنچکر اُسی سرعت کے ساتھ ابر پیدا کر کے جبر نقصان کرتی رہتی ہے اور بظاہر اگرچہ ابر اپنے حال پر قایم معلوم ہوتا ہے مگر در حقیقت اسمیں ہر ساعت تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے کبھی مکدر آسمان دفعتہً بغیر مدد ہوا کے صاف ہو جاتا ہے یعنے اُس مقام کی گرمی زیادہ ہو جاتی ہے اور ابر کو گھلا کر پھر انجرے بنا دیتی ہے -

(۴۳) مینہہ - یہ تو معلوم ہو چکا کہ انجروں کے ٹھنڈے ہو کر بھاپ کی شکل بن جانے سے ابر پیدا ہوتا ہے جب تک انجرے کم کم اور آہستہ آہستہ جمتے رہتے ہیں اُس وقت تک ابر ہی ابر پیدا ہوتا ہے مینہہ نہیں برستا مگر جب آمد انجروں کی زیادہ ہوتی ہے اور سرعت کے ساتھ تہ پر تہ ابر کی جمنی شروع ہوتی ہے اُس وقت پانی کے ذرے جن سے یہ ابر مرکب ہے ایک دوسرے سے مل مل کر بڑے قطرے بننے لگتے ہیں اور اپنے بوجھ سے زمین پر گرنے لگتے ہیں اور مینہہ برسنے لگتا ہے اِن قطروں کا قطر ایک اندازے کا نہیں ہوتا کبھی اتنی بڑی بوندیں برستی ہیں کہ قطر اُن کا انچہ کے چہارم حصے کے برابر ہوتا ہے اور کبھی ایسی باریک پھوہار پڑتی ہے کہ

اُس کے قطروں کا قطر ۱/۲۵ وین حصہ انچہ بلکہ کبھی ۱/۲۵ وین حصہ انچہ
سے زیادہ درازی نہیں رکھتا۔ مینہ کی بوندوں کی رفتار چنداں تیز
نہیں ہوتی اگرچہ بڑے فاصلے سے زمین پر گرتی ہیں اگر جو خالی ہوتا
تو ان قطروں کی تیزی ہر لمحہ بڑھتی جاتی اور زمین تک پہونچتے
پہونچتے پلے سرے کی سرعت پیدا کرتی مگر چونکہ جو میں ہوا بھری
ہوئی ہے اس واسطے ہوا کی رکاوٹ ان بوندوں کو جلدی گرنے
نہیں دیتی اور زمین تک پہنچتے پہنچتے بالکل ان کا زور ٹوٹ جاتا ہے
مقدار بارش کی پیمایش باران پیما سے ہوتی ہے۔ پیمایشِ مقدار
بارش سے یہ مراد ہے کہ اگر کل مینہ جو کسی خاص مقام میں سال بھر کے
اندر برسا ہو بہہ نہ جائے اور خشک نہ ہو جائے تو کس قدر گہرا پانی
جمع ہوگا۔ بارانِ پیما کی کئی قسمیں ہیں
ایک کی صورت یہ ہے۔ شکل (۱۱) ح
ایک ظرفِ فلزی ہے جس کے منہ پر
ایک قیف ق لگی ہوئی ہے۔ قیف کے
سطح کی مساحت معلوم ہے نیچے ایک
شیر دہاں ش لگا ہوا ہے جس کی راہ حوض ح میں سے پانی نکالکر
پیمانے میں ناپ لیا جا سکتا ہے اس آلہ کو باہر میدان میں مسطح

زمین پر لگا دیتے ہیں۔ مینہہ کے قطرے قیمت کی راہ حوض میں جمع ہوا کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً شیر وہاں کی راہ پانی نکالکر ناپ لیا جاتا ہے کہ کئے انچہ ہے۔ بعض باران پیما کے اندر شیشے کا پیمانہ لگا ہوا ہوتا ہے جس سے انچہ کا حساب معلوم ہو جاتا ہے اور پانی کو نکالکر الگ ناپنے کی حاجت نہیں ہوتی دونوں صورتوں میں پیمانہ اور حوض کے قطر کے مابین ایک نسبت معلوم ہونی چاہئے کہ حساب ٹھیک لگے۔ مثلاً حوض کا قطر اگر دس انچہ کا ہو اور پیمانے کا ایک انچہ تو صاف ظاہر ہے کہ اگر پیمانے میں ایک انچہ پانی پایا جائے تو معلوم ہوگا کہ انچہ کا سوا حصہ بارانِ پیما میں جمع ہو اور اگر پیمانے میں دسواں حصہ انچہ کا نکلے تو معلوم ہوگا کہ انچہ کا ہزارواں حصہ بارانِ پیما میں جمع ہوا اس حساب سے عمق بارش کا بخوبی معلوم ہوتا رہے گا۔

(۴۴) مقدار بارش ہمیشہ اور ہر جگہ برابر نہیں ہوتی اس کے اختلاف کے موجب بہت سے ہیں (مثلاً) اختلاف عرض بلد اختلافِ ارتفاع۔ قربِ جبال۔ قرب دریا و شکل ساحل۔ معمولی ہواؤں کا اختلاف مہب۔ یہ سب اُمور مقدار بارش کی تقلیل و تکثیر میں اثر قوی رکھتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی کسی قدر بیان کی جاتی ہے۔

(۴۵) عرض بلد خط استوا کی محاذی حرارت و رطوبت دونوں کی کثرت ہے اور جس قدر خط استوا سے شمال یا جنوب کی جانب سے چلے جاؤ اسی قدر ان دونوں باتوں میں قلت ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ عرض بلد (۶۰) کی نسبت خط استوا کے محاذی ابخرونکی آمیزش ہوا میں پانچ گنی زیادہ ہے پس ظاہر ہے کہ بارش بھی اسیطرح علی الترتیب کم ہوتی جائے گی چنانچہ خط استوا سے ۶۰ درجہ تک مقدار بارش از روئے تجربہ و امتحان بحساب ذیل پائی گئی ہے:۔

خط استوا	۰	مقدار بارش	۱۰۴	انچہ
عرض بلد	۱۰	"	۸۵	"
"	۲۰	"	۷۰	"
"	۳۰	"	۴۰	"
"	۴۰	"	۳۰	"
"	۵۰	"	۳۵	"
"	۶۰	"	۲۰	"

اس فہرست میں ایک امر قابل لحاظ یہ ہے کہ عرض بلد ۱۰ سے ۳۰ تک مقدار بارش قیاس سے زیادہ گھٹی ہوئی پائی جاتی ہے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خط استوا اور عرض بلد ۶۰ دونوں مقاموں

دو دھاریں ہوا کی مختلف سمتوں سے باہم ٹکراتی ہیں اور عرض بلد ۱۰ و ۳۰ کے مابین ہوائیں یکساں چلا کرتی ہیں۔

(۴۶) اختلافِ ارتفاع۔ متوسط بلندی کے پہاڑوں پر دامن کوہ اور سطح دریا کی نسبت بارش زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ہوا دامن کوہ سے ٹکرا کر اوپر چوٹی تک پہنچ جاتی ہے اور سرد ہو جاتی ہے اور مینہ برس جاتا ہے۔ جزیرۂ گواڈلوپ میں جو عرض بلد ۱۶ میں واقع ہے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک سال (۲۹۲) انچ مینہ برسا حالانکہ دامنِ کوہ میں فقط (۱۲۷) انچہ بارش ہوئی ملک دکن کے مغربی ساحل کے متوازی ایک سلسلہ پہاڑوں کا چلا گیا ہے جسے گھاٹ کہتے ہیں اس پہاڑ کے اوپر جس قدر بارش ہوتی ہے اُس قدر ساحل پر بمبئی وغیرہ میں نہیں ہوتی اور پہاڑ کے اس پار یعنے پورب کی طرف تو ایک ثلث سے بھی کم مینہ برستا ہے۔ بمبئی میں سال میں (۱۷) انچہ بارش ہوتی ہے اور پہاڑ پر ۴۵۰۰ فٹ کی بلندی پر (۲۵۴) اور کبھی (۳۰۰) انچہ مینہ برستا ہے اور پہاڑ کے اس طرف پونہ میں فقط (۲۹) انچہ سال میں برستا ہے اور حیدرآباد میں کبھی ۳۲ یا ۳۵۔ انچہ سے زیادہ نہیں برستا ہے۔ یہ بارش جون سے اکتوبر تک ہوتی ہے کیونکہ ان ایام میں جنوب

مغرب رویہ ہوا بحروں سے سیراب سمندر کی طرف سے آتی ہے
اور گھاٹوں پر الغاروں مینہ برسا دیتی ہے۔ جو کچھ رہے سہے ابخرے
باقی رہ جاتے ہیں وہ پہاڑوں سے اتر کر نیچے ملک دکن کو تازگی
بخشتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کوہ ہمالہ کے جنوبی دامن سے ٹکرا کر یہی
ہوا (۴۵۰۰) فٹ کی بلندی پر (۱۱۰) انچہ مینہ برسائی ہے اور ہمالہ
کے اوس پار بلاد تبت وغیرہ میں مینہ بہت کم برستا ہے۔

(۴۷) قرب جبال محض قرب جبال بھی باعث افزونی بارش ہے
اس امر کا ثبوت فہرست ذیل سے پایا جاتا ہے:

نام مقام	فاصلہ پہاڑ سے	مقامی بارش سالانہ
ڈھاکہ	۱۰۰ میل	۷۴٫۵ - انچہ
بوگرا	۶۰ "	۸۸٫۴ "
میمن سنگھ	۳۰ "	۱۰۳ "
سلہٹ	۶۰ "	۱۵۴٫۳ "
چیراپونجی	بلندی بالا کوہ ۴۱۲۵ فٹ	۵۲۴ "

چیراپونجی کے برابر دنیا میں کسی جائے کثرت بارش کی نہیں ہوتی
شمالی ہندوستان میں بھی یہی قاعدہ پایا جاتا ہے۔ لاہور میں جو
پہاڑوں سے پچاس کوس کے فاصلے پر ہے سال میں (۱۵٫۲) انچہ

مینہ برستا ہے اور راول پنڈی میں جو کوہ ہزارہ کے دامن میں واقع ہے (۲۸۵۶) انچہ برستا ہے اور کوہ ہزارہ پر (۴۳۶۹) انچہ برستا ہے۔

(۴۸) قرب دریا۔ ساحل دریا میں قطع نظر اور سببوں کے محض قرب دریا کی وجہ سے بارش زیادہ ہوتی ہے چنانچہ یورپ میں ساحل اطلانٹک پر (۳۰) انچہ سے (۴۰) انچہ تک مینہ برستا ہے۔ اور وسط ممالک میں (۲۰) انچہ سے زیادہ نہیں برستا اکثر بلاد روس میں فقط (۱۵) انچہ اور شمالی ایشیا میں اس سے بھی کم مینہ برستا ہے

(۴۹) اختلاف مہب ہوا۔ ہوا کے رخ کے اختلاف سے بھی مینہ میں بڑا اختلاف ہوتا ہے ہندوستان کے مغربی ساحل پر جون سے ستمبر تک برسات رہتی ہے جس زمانے میں جنوب مغرب رویہ ہوا چلا کرتی ہے باقی مہینوں میں سال کے شمال مشرق رویہ ہوا چلتی رہتی ہے یہ ہوا خشک ہوتی ہے اور مینہ نہیں برساتی ہے۔ بخلاف اس کے مشرقی ساحل پر جنوب مغرب رویہ ہوا کے دنوں میں مینہ نہیں برستا بلکہ شمال مشرق رویہ ہوا خلیج بنگالہ پر سے گذرتی ہوئی ان بلاد میں مینہ لاتی ہے۔ بعض مقاموں میں خط استوا کے قریب دو برساتیں ہوتی ہیں اور شدت بارش ایک مرتبہ جون میں اور ایک مرتبہ ڈسمبر میں

ہوتی ہے۔

(۵۰) بعض جھڑیاں دنیا میں یادگار گذری ہیں۔ کوہ ہمالہ کے جنوبی رُخ میں ۴۰۰۰ فٹ کی بلندی پر عرض بلد ۲۵ میں کسی سال (۶۱۰) انچہ مینہ برس گیا ہے۔ ہندوستان میں کبھی ایک دن میں (۱۵) انچہ برس گیا ہے اور ملک سوٹیزرلینڈ میں ۳۰ انچہ تک ایک دن میں برسا ہے۔ ذیل میں بعض مشہور مقاموں کا نام درج ہے جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اور اُس کے نیچے اُن مقاموں کا نام ہے جہاں مینہ کثرت سے برستا ہے اس فہرست میں اکثر ولایت ہندوستان کے مقامات لکھے گئے ہیں۔

نام مقام	عرض بلد تقریباً	ارتفاع از سطح دریائے شور	مقدار بارش سالانہ بحساب انچہ
قاہرۂ مصر	۳۰ درجہ ۲ دقیقہ شمالی	۰	۱٫۳ انچ
کراچی بندر (سندھ)	۲۴ درجہ ۵۱ " "	۰	۱٫۵ "
کوٹری (بمبئی)	۲۳ درجہ ۵۴ " "	۰	
ہستراخان (روس)	۴۶ درجہ ۱۵ " "	- ۷۰ فٹ	۴٫۸ "
چیراپونجی (بنگالہ آسام)	۲۵ درجہ ۱۵ " "	۴۱۲۵ "	۵۹۲ "
مہابلیشور (بمبئی)	۱۷ درجہ ۵۴ " "	۴۳۰۰ "	۲۵۴ "
سیالکوٹ (پنجاب)	۳۲ درجہ ۳۱ " "	۰	۲۰۹ "

اراکان (برما)	۲۰ درجہ ۴۴ دقیقہ شمالی	۰	۲۰۰ انچ
سندولا //	۱۷ درجہ // // //	۶۰۰ فٹ	۱۸۵ //
ساندوی //	۱۸ درجہ ۲۷ دقیقہ //	۰	۱۷۸ //
مولمین	۱۵ درجہ ۳ // //	۰	۱۷۵ //
آنگرای (مدراس)	۹ درجہ ۲۱ // //	۲۲۰۰	۱۷۰ //
اکیاب (برما)	۲۰ درجہ ۷ // //	۰	۱۵۵ //

(۵۱) صحاری۔ دنیا میں چند مشہور صحرا ہیں جنکی وسعت بہت بڑے ممالک کے برابر ہے۔ ایک انمیں سے صحرائے افریقہ ہے جو ہزارہا کوس کی وسعت میں واقع ہے۔ اس صحرا کا سبب یہ ہے کہ اس کی شمالی اور جنوبی دونوں حدوں پر مرتفع پہاڑ واقع ہیں شمال مشرقی ہوا سمندر سے ابخرے لیتی ہوئی آتی ہے اور اس کوہ شمالی سے ٹکرا کر برس جاتی ہے اور بعد اس کے اس ہوا کو عرض بلد (۱۰) تک کوئی اور بلندی نہیں ملتی جو اسے سرد کرے اور بیچ میں جو وسیع ملک واقع ہے یہ خود بہت گرم ہے اس واسطے یہاں مطلق مینہ نہیں برستا البتہ جنوبی حد پر پہونچنے سے پھر ہوا سرد ہوتی ہے اور باقی ابخرے اپنے برسا دیتی ہے۔

اس واسطے یہ وسط والا ٹکڑا ہمیشہ گرم رہتا ہے اسمیں کہیں پانی کا نام نہیں ہے نہ درخت ہیں اور نہ آبادی ہے - دہکتی ہوئی ریگ کے سوا کچھ نہیں ہے بیچ بیچ میں سیکڑوں کوس کے فاصلے پر البتہ کہیں کہیں کوئی پہاڑی ہے اور اُس پر بوجہ بلندی کے کبھی بارش بھی ہو جاتی ہے صحرائے عرب کا بھی یہی حال ہے اور صحرائے گوبی جو تبت کے شمال میں واقع ہے اسیطرح کوہ ہمالہ کے باعث وجود میں آیا ہے -

اب اُن کائناتِ جو میں جو بخارات مائی سے پیدا ہوتے ہیں فقط برف اور یخ اور تگرگ کی ساخت اور خلقت کا مختصر سا احوال لکھنا باقی رہ گیا - باقی کائناتِ جو مثل شہاب ثاقب و قوس قزح و ہالہ و رعد و برق وغیرہ اس بحث خاص سے چنداں تعلق نہیں رکھتے طوفان اور گرد باد وغیرہ کے بیان کو اگر اس رسالہ میں جگہ دیجاتی تو بیجا نہ ہوتا کیونکہ یہ ہوا کی قسمیں ہیں اور ابخروں کو بھی ان کی پیدائش میں بخوبی دخل ہے مگر جہاں صرف چند ضروری اور آسان مسائل فن کا بتانا منظور تھا وہاں ایسے مشکل اور طویل مقدمہ کو چھیڑنا قرین مصلحت نہ معلوم ہوا کسی قدر اشارہ ان سب کے اسباب و علل کی طرف سابق میں ایک مقام میں گزر چکا ہے

بالفعل اُسی پر اکتفا کرنا بہتر ہے -

برف کبھی ابخروں کو بہت شدت کی سردی دفعتہً پہنچ جاتی ہے ایسی حالت میں پانی کے قطرے نہیں بنتے ہیں اور نہ مینہ برستا ہے بلکہ ابخرے اپنی اصلی حالت میں یکبارگی جمکر برف بن جاتے ہیں اور مثل روئی کے گالوں کے بہت سبکی اور آہستگی کے ساتھ زمین پر گر پڑتے ہیں - ان گالوں کی شکل نہایت خوشنما گل بوٹوں کی سی ہوتی ہے جنکی تیپی اور پنکھڑیاں بہت ہی باریک اور نازک یخ کی قلموں سے بنی ہوئی ہوتی ہیں - اگرچہ برف اجزاے شفاف سے بنی ہوئی ہے پر یہ خود شفاف نہیں ہے یعنے شعاع آفتاب اس کے جرم میں سے گزر نہیں جاتی اور نہ وار پار نگاہ کام کرتی ہے -

مثال اس کی آئینہ بے قلعی کی سی ہے کہ اگرچہ خود شفاف ہے پر چورا اس کا شفاف نہیں ہوتا - یہی وجہ ہے کہ رنگ برف کا نہایت سفید اور براق ہوتا ہے - بعض اوقات ارض تسعین میں پرانی برف ٹپرے پڑے سرخ ہو جاتی ہے بعض جائے سبز بھی دیکھی گئی ہے - سرخی یا سبزی برف کی اصالت نہیں ہے عارضی رنگ ہیں ایک قسم کی کائی کے جم جانے سے پیدا ہوتے ہیں عجب یہ ہے کہ برف کی سی سرد چیز گرمی کی بڑی محافظ ہے

دشت قبچاق اور سائبیریا وغیرہ میں خرس مادہ چند ماہ برابر برف کے نیچے دبی رہتی ہے اور ایام ربیع میں حسب قدرت تن و توش پیدا کرلیا ہے اُسی کے بل بوتے جاڑوں کی سختی جھیل لیجاتی ہے۔ موسم برف کے شروع ہوتے ہی کسی پتھر کی آڑ پکڑ کر بیٹھ رہتی ہے تھوڑے عرصے میں برف کا انبار اس کے اوپر جمع ہو جاتا ہے اور طرفہ یہ کہ مثل لحاف کے اُس کے بدن کو گرم رکھتا ہے۔ یعنے خارج کی سردی جو (۳۲) درجے سیماب سے کہیں نیچے اتر آتی ہے ریچھ کے بدن تک پہنچنے نہیں پاتی اس لئے حرارتِ غریزی اُس کے خون کی فنا نہیں ہونے پاتی اور رشتۂ زندگی قایم رہتا ہے۔ غذا اس عرصہ میں کہاں مل سکتی ہے حالتِ بیخودی میں پڑی ہوئی دن کاٹتی ہے۔ بعض اوقات آدمی بھی برف میں دب گئے ہیں اور عرصۂ دراز کے بعد سلامت نکلے ہیں۔

کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ برف گرتے گرتے کسی گرم تہ ہوا میں ہو کر گزرتی ہے جس میں (۳۲) درجے سے زیادہ حرارت موجود ہے اور پانی بنکر برس جاتی ہے چنانچہ اگر پہاڑ قریب ہو تو ایک ہی ابر سے بالائے کوہ برف پڑتی ہے اور زیر کوہ مینہ برستا ہے کبھی نہایت سرد موسم میں ایک طرفہ تماشا نظر آتا ہے مکان کے اندر برف پیدا

ہو جاتی ہے۔ اگر کسی چھوٹے حجرے میں جس کے اندر بہت سے
لوگ جمع ہوں اور دروازے اور کھڑکیاں سب بند ہوں اور ہوا گرم ہو
دفعتہً کوئی کھڑکی کھول دیجائے اور باہر کی سرد ہوا اندر آنے پائے
تو فوراً اندر کی ہوا میں جس قدر انجرے ملے ہوئے ہیں جمکر برف
بنجاتے ہیں اور نہایت نازک نازک اور سپید سپید گالے برف کے
فرش پر گرنے لگتے ہیں۔

مگر یہ سب واقعے سرد ملکوں میں گزرتے ہیں گرم ملکوں کے
لوگ برف کی صورت سے بھی آشنا نہیں۔ ہندوستان میں کس نے
گالے برستے دیکھے ہیں۔ ہاں بلند پہاڑوں پر چلے جاؤ تو تمھارا
ہندوستان اس سیر سے بھی خالی نہیں ہے۔ اور یہی حال تمام
منطقۂ حارہ کا ہے یعنے سوائے مرتفع مقامات کے اور کہیں برف
نہیں پڑتی۔ منطقۂ معتدلہ میں جہاں گرمی کم ہے موسم زمستان میں
اکثر برف پڑتی ہے اور منطقۂ باردہ میں جہاں آفتاب کی حدت
بہت کم اثر کرتی ہے دوازدہ ماہ برف پڑا کرتی ہے بلکہ اُن بلاد میں
تمام انجرے برف ہی کی صورت میں زمین تک پہنچتے ہیں۔

برف باری کا قاعدۂ عام یہ ہے کہ جن بلاد میں موسم زمستان میں
کبھی سیماب ۳۲ درجے سے نیچے اوتر آتا ہے وہاں اگر گاہے ماہے

برف پڑے تو عجب نہیں۔ چین کے ملک میں ۲۴ درجے عرض بلد سے نیچے برف نہیں پڑتی اور ہندوستان کی شمالی حد پر باوجود زیادہ عرض بلد کے برف اس وجہ سے نہیں پڑتی ہے کہ شمال رخ اُس کے کوہ ہمالہ حایل اور زیادتی حرارت کا موجب ہے جیساکہ ایک مقام پر پیشتر بیان ہو چکا ہے۔ کوہ ہمالہ میں سولہ ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر دوازدہ ماہ برف پڑا کرتی ہے۔ یورپ کے بعض پہاڑوں میں آٹھ یا نو ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر ہمیشہ برف پڑتی ہے اِن پہاڑوں کے بلند دروں میں اور گھاٹیوں میں سالہا سال کی برف مجتمع ہوکر اور اپنے بوجھ سے آپ جمکر بستہ مثل یخ یعنے آب منجمد کے ہو جاتی ہے اِن سپید پہاڑوں کو انگریزی زبان میں گلیزیر کہتے ہیں جس کی جمع بزیادت (ز) گلیزیرز آتی ہے۔ بعض اِن میں کے اس قدر بڑے ہیں کہ طول ان کا (۵) میل سے (۱۰) میل تک کا اور عمق بارہ ہزار فٹ کا ہے اور چونکہ درے اور گھاٹیاں اس بلندی پر نہایت ڈھالوان شکل کی ہوتی ہیں اس واسطے یہ انبار برف کا اپنے بوجھ سے آپ حرکت کرتا ہے اور کہیں ایک فٹ روز اور کہیں زیادہ اور کہیں کم نیچے اُترتا رہتا ہے حتی کہ گرم مقاموں تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے اطراف و جوانب کے پتھروں کو اپنی رگڑ سے چکنا کر دیتا ہے اور بعض اوقات بڑی بڑی

چٹانیں اپنے ساتھ لیتا آتا ہے اور نیچے پہنچا دیتا ہے۔ اکثر بڑے
بڑے دریا دنیا کے اسی قسم کے یخ کے پہاڑوں سے نکلے ہیں۔
بلاد بارد میں اس قسم کے پہاڑ ٹوٹ کر سمندر پر تیرنے لگتے ہیں اور
بہتے بہتے دور تک پہنچ جاتے ہیں ان کو آیس برگ کہتے ہیں۔
تگرگ یعنے اولا۔ اولے کی شکل اور شباہت سے سب واقف
ہیں۔ عموماً گول کچھ سڈول مگر اکثر تھوڑی بہت کجی اور ناہمواری
لئے ہوئے اور کبھی بادامی اور کبھی چپٹا ہوتا ہے۔ رنگ سپید ہوتا ہے
اور یخ بستہ کے مثل شفاف نہیں ہوتا۔ اگر کسی اولے کو بیچ سے تراش کر
دو ٹکڑے کر ڈالو تو اندر پیاز کے چھلکوں کی سی تہیں دکھائی دیتی ہیں
بعض شفاف اور بعض سپید اور بیچوں بیچ میں ایک چھوٹی سی گولی
برف کی ہوتی ہے۔ ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ اولے کی ابتدا برف
ہوتی ہے اور زمین تک پہنچتے پہنچتے کئی تہیں یخ شفاف اور برف
غیر شفاف کی اس پر چڑھ جاتی ہیں۔ اور یہ بھی قیاساً معلوم ہوتا ہے کہ
اولا اصل میں چھوٹا ہوتا ہے اخروٹ سے بڑا نہیں ہوتا مگر زمین تک
پہنچتے پہنچتے پانچ چار ملکر حجم بڑھ جاتا ہے۔ صورت اس کی
پیدایش کی یہ معلوم ہوتی ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر مشاہدہ
کیا گیا ہے کہ اولوں کے ابر کے ساتھ ایک گردباد تند چلتا

ہوتا ہے جس کا محور سطح زمین سے متوازی ہوتا ہے۔ اس کی گردش سے برف کے گالے چھوٹی چھوٹی گولیاں بنجاتے ہیں اور اوڑکر کسی ایسے طبقے میں پہنچتے ہیں جہاں کی ہوا گرم اور سیراب ہے۔ یہاں آنکے اپنی سردی سے ان پر ایک تہ پانی کی اور پانی کے جمجانے سے ایک شفاف یخ کا غلاف سا چڑھ جاتا ہے۔ یہاں سے پھر وہی گردباد ان دانوں کو اڑاکر کسی ابر برف بار میں پہنچادیتی ہے جہاں ان پر ایک غلاف برف غیر شفاف کا چڑھ جاتا ہے یہاں سے اوڑکر پھر کسی گرم ابر میں سے ان کا گذر ہوتا ہے اور پھر ایک غلاف یخ شفاف کا ان پر چڑھ جاتا ہے اسی طرح چند بار کی ردوبدل میں اولے تیار ہو جاتے ہیں اور زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اولوںکی پیدایش کے وقت دو مختلف دھاریں ہوا کی چلتی ہیں اور ایک دوسرے میں تصادم عظیم ہوتا ہے۔ اول دھار ہوا کی جو قبل اولے پڑنے کے شروع ہوتی ہے نہایت گرم اور ابخروں سے بھری اور جھکی ہوئی ہوتی ہے اُس کے بعد ایک برف سے سرد دھار ہوا کی آنکر گرم ہوا سے ٹکراجاتی ہے اور اُسے ہٹاکر بہت دور تک اوپر کی جانب اوڑادیتی ہے اس طبقے کی سردی اس پر دو طرح کا اثر کرتی ہے یعنے اس کے ابخرے ابر نگر گیا ہو

کی جانب اسفل میں پانی ہوکر برستے ہیں اور وسط میں زیادہ بلندی پر برف بنکر اولوں کے بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اولے پڑنے کی بڑی علامت یہ ہے کہ ایک خاص قسم کی آواز آسمان میں پیدا ہوتی ہے جس طرح کوئی بہت سے کنکر یا اخروٹ تھیلی میں ڈالکر زور سے ہلاتا ہو اس کی وجہ لوگوں نے مختلف بتائی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہوا اس زور سے اولوں کو اڑاتی ہے کہ اُس کے سبب سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ بعض قوتِ برقیہ کو اس کا سبب بتلاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُولے پڑتے وقت قوتِ برقیہ بہت پیدا ہوتی ہے مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اولوں کی علت عظمیٰ برق ہے۔

نباتات کو دو طرح غذا پہنچتی ہے۔ اول زمین سے جڑوں کے ذریعے۔ دوم ہوا سے پتوں کے ذریعے۔ اگر زمین سے تقویت کافی پہنچے اور ہوا بقدر وافی اعانت کرے تو درخت شاداب پھول پھل پتوں سے ہرا بھرا ہو گا اگر زمین و ہوا ناموافق ہو یا بقدر حاجت زور نہ پہنچائے تو پژمردہ ہو گا۔ جن عروق یعنے رگوں کے وسیلے سے درختوں کو غذا پہنچتی ہے وہ نہایت درجہ باریک اور نازک ریشوں سے بنے ہوئے ہوتے ہیں پس ظاہر ہو کہ ایسی باریک اور نازک راہوں سے جو غذا پہنچتی ہے اس کے اجزا بیشتر مائع چیزوں پر مشتمل ہوں گے مگر چونکہ زمین سخت چیز ہے اس واسطے ضرور ہوا کہ اسے رطوبت پہنچے تاکہ اجزا اس کے گھل کر مائعیت پیدا کریں۔ اس لئے زمین کی شادابی اس کی قابلیت جذب رطوبت پر موقوف ہے۔ زمین اکثر اجزائے ذیل سے مرکب ہوا کرتی ہے:۔

(۱) مادۂ ریگی یعنے بالو اور اس کے اقسام۔ (۲) مادۂ گلی

ت یعنے چکنی مٹی اور اس کے اقسام (۳) مادۂ آہکی یعنے چونے اور کھریا مٹی کی قسمیں (۴) مادۂ آہنی یعنے خبث الحدید کے اقسام۔ (۵) مادۂ حیوانی۔ (۶) مادۂ نباتی۔ انہیں اجزا کی آمیزش سے زمین پیدا ہوتی ہے مگر کسی زمین میں کوئی جزو زیادہ اور کسی میں کوئی جزو کم ہوتا ہے۔ اگر مادۂ ریگی و گلی و آہکی بمقدار مساوی کسی زمین کا جزو اعظم ہو تو وہ زمین نہایت سیر حاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی جزو غالب ہو تو اسی قدر زمین کمزور ہوتی ہے۔ ان اجزائے ستہ میں سے کوئی جزو واحد نباتات کو غذائے کافی پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نہ کسی مدت تک ایسی زمین میں کوئی درخت سر سبز رہ سکتا ہے۔ کوئی زمین ایسی نہیں پائی گئی ہے جس میں کسی قدر مادۂ ریگی نہ شریک ہو۔ ریگ کی یہ خاصیت ہے کہ زمین کو سبک کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے جڑ کی باریک باریک اور نئی نئی رگیں بآسانی زمین کے اندر نفوذ کر سکتی ہیں اور نشو و نما پا سکتی ہیں مگر جب یہ جزو بکثرت ملا ہوا ہو تو زمین کمزور ہو جاتی ہے اور جذب و حفظ رطوبت کی صلاحیت اس میں کم پائی جاتی ہے یعنے ایسی زمین میں بخوبی جذب نہیں ہوتا اور جو جذب بھی ہوتا ہے تو بہت جلد نکل جاتا ہے اجزائے ستہ میں قوت جاذبہ ریگ کی سب سے

کم ہے اپنے ربع وزن تک بھی رطوبت جذب نہیں کر سکتا۔ آہکی مادہ اپنے وزن کے برابر جذب کرتا ہے اور اُس کی آمیزش سے زمین کی قوت زیادہ ہوتی ہے مگر اس کی کثرت سے بھی زمین کو نقصان پہنچتا ہے اور زور گھٹ جاتا ہے مادہ گلی ان دونوں سے زیادہ جاذب ہے اپنے وزن سے ڈھائی گنا پانی جذب کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سخت ٹیار زمین سے جس میں ہل بدقت چلتا ہے اور بڑی محنت اور بہت کھات یا پانس کے صرف سے کھیت تیار ہوتا ہے باوجود ان مشکلوں کے ریتی یا آہکی زمین کی نسبت زیادہ پیداوار حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ ریتی اور آہکی کھیتوں کو ہمیشہ پانس اور پانی پہنچانا ضرور پڑتا ہے بخلاف اس کے ٹیار زمین اگر بخوبی کمائی جائے اور کھیا دیجائے تو کھات کا زور اُس میں بہت زمانہ تک باقی رہتا ہے آہنی مادہ اگرچہ کمابیش تمام روئے زمین پر منتشر ہے اور ہر قسم کے کھیت میں تھوڑا بہت پایا جاتا ہی پر ابتک اہل فن کو اُس کے خواص و فوائد پر بخوبی اطلاع نہیں ہے۔

حیوانی اور نباتی مادہ سب سے زیادہ جاذب و حافظ رطوبات ہو زمین کی سیر حاصل ہونے کے لیئے فقط یہی امر کافی نہیں ہے کہ اجزائے ستہ اُس میں بمقدار مناسب موجود ہوں بلکہ اُن کا باہم

ملا ہوا ہونا بھی ضرور ہے اس کے بغیر زمین میں صلاحیت اس امر کی
نہیں پیدا ہوتی کہ درخت کو قوت پہنچائے اور کسی مدت تک
سرسبز اور شاداب رکھے پس ان اجزا کی آمیزش کی ترکیب کو بھی
کھیتوں کی برائی بھلائی میں بڑا دخل ہے مٹی کے ڈلے جس قدر
زیادہ باریک اور بھربھرا ہوں اسی قدر قوت جاذبہ زمین کی زیادہ ہوگی
اور اسی قدر زور زیادہ ہوگا کھیت جس قدر کمایا جائے اور بویا کیا جائے
اُسی قدر جڑیں درخت میں سے زیادہ پھوٹیں گی جس قدر جذب
رطوبات غذائی کے ذریعے زیادہ ہوں گے اسی قدر شبنم کی نمی سے
درخت زیادہ فایدہ اٹھائے گا۔ کھیت کتنا ہی زوردار کیوں نہ ہو
تھوڑے دنوں کے متصل جوتنے بونے سے زور اس کا جاتا رہتا ہے
اس واسطے پھر اُسے پانس ڈالکر زور پہنچانا ضرور ہوتا ہے کسی قسم
کی پانس کس وقت کس کھیت میں ڈالنی چاہئیے اس کے جاننے
کے واسطے علم فلاحت سے بخوبی ماہر ہونا ضرور ہے سب سے
عمدہ اور ہر جگہ عموماً کام دینے والی پانس البتہ وہ پانس ہے جسمیں
حیوانی اور نباتی دونوں قسم کے مادے بمقدار مناسب ملے ہوئے
ہوں انگلستان کے کسان اس قسم کی پانس بہت تیار رکھتے ہیں
مگر اس ملک میں بوجہ رسم پرستی اور تعصبات کے رواج اس کا مشکل ہے

پانس سے غرض جبر نقصان ہے یعنے جو جزو ضروری کسی خاص
زمین میں نہ ہو یا صرف ہوگیا ہو اُسے دوبارہ زمین میں ملا دینا
تاکہ قوت اصلی اس کی عود کر آئے اور چونکہ ہر قسم نبات کی غذا
خاص ہے اس واسطے پانس ڈالنے کے قبل دو باتوں کا دریافت
ہونا ضرور ہے اول یہ کہ وہ خاص زمین کن اجزا سے مرکب ہے
اور دوئم یہ کہ اس میں جس غلہ یا درخت کا بونا منظور ہے اُس کو
کس قسم کی غذا کی ضرورت ہے جب یہ دونوں باتیں ہم کو معلوم
ہوجائیں اُس وقت کھیت میں پانس ڈالنا یعنے جن اجزا کی
اُن میں قلت ہے اُنہیں بمقدار مناسب پہنچانا آسان اور حصول
منفعت یقینی ہے - اشیائے ذیل سے پانس کا کام لیا جاسکتا ہے
ریگ - چکنی مٹی - دریا کی مٹی - چونا - ہڈی - کھریا مٹی - گچ کا کوڑا
مویشی کا فضلہ - مچھلی - کھلی - بوسیدہ پتے - ہری گھانس - کھیت
مکانات اور کارخانہ جات اور شہر کے گلیوں وغیرہ کا کوڑا -

ریگ یعنے بالو کی قدر و قیمت کسانوں اور باغبانوں کو بخوبی
نہیں معلوم ہے - کوئی زور دار زمین ایسی کم نکلے گی جس میں ثلث سے
کم ریگ ہو اور بہتیری زمینیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں ربع ریگ ہے
سخت اور لس دار زمینوں میں یا ایسی زمینوں میں جن میں چکنی

مٹی یا کھر یا مٹی یا مواد نباتی بکثرت ہو تھوڑی سی بالو ملا دینا
بہت مفید ہوتا ہے - باریک ریگ چھوٹے اور نازک درختوں کے
کاشت کے واسطے خصوصاً چھوٹے درختوں کی قلمیں لگانے
کے واسطے نہایت ضرور ہے - چکنی مٹی اگر ریگی یا کنکریلی زمین
یا ایسی زمین میں جس میں کھریا مٹی زیادہ ہو ملا دیجائے تو پانس کا
کام دیتی ہے پر چکنی مٹی اگر بہت گہرا گڑھا کھود کر نکالی گئی ہو تو
ضرور ہے کہ قبل کھیت میں ملانے کے کچھ دنوں دھوپ میں
پڑی رہے - دریائی مٹی یعنے وہ مٹی جو نالاؤں میں سے یا
دریا کے کناروں سے کھود کر لائی جاتی ہے بہت عمدہ اجزائے
سطح زمین و ریگ باریک و نباتات بوسیدہ سے مرکب ہوتی ہے
جو سیلاب یا بارش سے بہہ کر مجتمع ہو جاتی ہے - اپریل یا مئی کے
مہینوں میں اس قسم کی مٹی جس قدر چاہو مل سکتی ہے - کھریا مٹی
یا کسی کھیت میں دریائی مٹی فوراً ملا دیجا سکتی ہے کہ پھولوں کی پرورش
کے واسطے کونڈوں میں یا روشوں میں اور میوہ دار درختوں کی
پرورش کے واسطے باغوں میں ڈالنے کے لئے ضرور ہے کہ
مٹی کھودنے کے بعد چند مہینے تک دھوپ میں پڑی رہے چونا
سخت یا بھاری زمینوں کے واسطے خاص کر کے بہت مفید ہے

نرم زمینوں کے واسطے مفید نہیں ہے۔ مگر آہکی مادہ اس سرزمین
میں اس قدر کم ہے کہ چونا بہ منفعت تمام کھیتوں میں بحساب (۲۰) من
فی بیگہہ ڈالا جا سکتا ہے۔ ترکیب اس کے استعمال کی یہ ہے کہ خالص
چونا کھیت کے اوپر پھیلا دیا جائے اور بعد اس کے کھود کر ہل چلا کر
ملا دیا جائے یا اینکہ چونا اول کسی اور پانس کے ساتھ ملا لیا جائے
اور بعد اس کے کھیت میں ڈالا جائے دریائی مٹی میں اگر چونا
ملا لیا جائے اس طرح پر کہ من بھر چونے کو ایک گز مکعب مٹی
دیجائے تو ریگی زمینوں کے واسطے بہت اچھی پانس تیار ہوتی ہے
جس کسی کھیت میں چونا ڈالا جائے چاہئے کہ پڑتے کے ساتھ ہی
کھود کر ملا دیا جائے۔ ہڈیاں چونے اور روغن سے مرکب ہیں
اور بہت عمدہ پانس ہیں۔ کھریا مٹی اور پرانے مکانات کا کوڑا
سخت چکنی زمینوں میں ملایا جائے تو نفع بخشتا ہے۔

مویشی کا فضلہ یعنی مینگنی گوبر وغیرہ ترکاریوں کی پرورش میں
بہت کام آتا ہے اور گھوڑے کی لید پر اس کو ترجیح ہے اسواسطے
کہ گھوڑے کی لید کو پہلے سڑانا پڑتا ہے اور مویشی کا فضلہ فوراً کام میں
آسکتا ہے تازی لید ڈالی جائے تو چاہئے کہ فوراً کھیت کھود کر
اُسے ملا دیں اگر سڑا کر ڈالی جائے تو اسمیں گھانس اور پیال اور پتے

وغیرہ ملاکر سڑانا چاہئے اور تھوڑی سی تازی مٹی اُس میں ڈالکر سب کو
خوب سا ملاکر موٹی موٹی سی ایک تہ اس کے کھیت پر پھیلا دینی چاہئے
اور بعد اُس کے کھود کر کھیت میں ملا دینا چاہئے اس ترکیب سے
مقدار پانس کی زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ لید کے ملنے سے اس مرکب کے
باقی اجزا میں بھی قوت زیادہ ہو جاتی ہے مگر یاد رہے کہ گوبر اور مینگنی کا
کھیت میں پڑنے سے پیشتر سڑالیا جانا کچھ ضروری امر نہیں ہے -
مچھلی بھی بہت عمدہ پانس ہے اور ہر قسم کی زمین میں کام آتی ہے
مچھلی کو دریا سے نکلنے کے ساتھی کھیت میں ڈال دینا چاہئے -
اَلسی کی کھلی بھی خوب چیز ہے - نمناک ٹیبار زمین میں فی بگیہہ چار من
کے حساب سے ڈالی جائے تو بہت فایدہ بخشتی ہے - کھلی کو کوٹکر
بُورا کر لیتے ہیں اور کھیت پر پھیلا کر مٹی میں ملا دیتے ہیں - یا مثل بیج کے
بکھیر کے اوپر سے دانہ بو دیتے ہیں - بوسیدہ پتوں سے بہت عمدہ
پانس بنتی ہے اس کا مصرف یہ ہے کہ اسے اور قسم کی پانسوں میں
ملاکر ایسے کھیتوں میں ڈالتے ہیں کہ جن میں ریگ یا گل یا کھریا مٹی -
کثرت سے ہو بوسیدہ پتے ریگ کے ساتھ ملانے کیلئے خوب چیز ہیں
اور علی ہذا نازک پودھوں کی پرورش کے واسطے زمین کو نرم اور ہلکا
کرنے کے لئے بھی نہایت مناسب ہیں - پتوں کو جمع کر کے انبار لگا دینا

چاہئے کہ پڑے ہوئے سڑا کریں جلانا کبھی نہیں چاہئے جلانے سے نباتات کے وہ خواص بالکل مفقود ہو جاتے ہیں جن پر پانس کا بننا منحصر ہے۔ گھانس بھی سڑنیکے بعد ریگی زمین کے واسطے بہت مفید ہوتی ہے ہری زراعت اگر عین پھول لینے کے وقت کاٹکر کھیت میں ملا دیجائے تو ریگ یا کھریا مٹی کی زمینوں کو بہت فایدہ پہنچاتی ہے کوئی مغز دار کھیتی خوب گھنی بوئی ہوئی نمو کی حالت میں اچھی طرح کھود کر کھیت میں ملا دیجائے تو زمین کو تقویت بخشتی ہے اگر کھیت مویشی سے چروا دیا جائے تو جو کچھ گوبر یا مینگنی مویشی کی کھیت میں پڑ جاتی ہے اس میں قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

تالاب کی سوار وغیرہ اور دریائے شور کی نباتات سے بھی نہایت زوردار پانس بنتی ہے۔ اس کو کھیت میں کھود کر ملا دیتے ہیں یا پہلے مٹی میں ملا کر کھیت میں ڈالتے ہیں یا بعد بونیکے جب تک کہ نمو کی حالت میں ہوں اس وقت اسے اوپر اوپر بچھا دیتے ہیں آج دریائی نباتات خصوصاً پیاز اور پھول گوبھی اور آلو کے واسطے بہت مفید ہے سڑک اور گلی اور بدررو وغیرہ کا کوڑا اور ہر قسم کی جھاڑن جھیچڑن جو کسی جائے جمع کیجائے اکثر اوقات پانس کے مصرف میں آتی ہے اور بہت قوت دار ہوتی ہے اور ہر قسم کے کھیت میں ڈالی جا سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں کسان اور کاشتکار لوگ زمین کی مرمت اور
درستی میں بہت کم محنت دہی کرتے ہیں ان کو اتنا ہی بس ہے کہ
زمین سے بقدر حاجت پیدا کرلیں سرکاری مالگزاری اگر ادا کر پائے
اور سال بھر کی خوراک نکل آئی تو بہت ہے۔ معمولی تدبیریں تو
البتہ خال خال لوگ عمل میں لاتے ہیں مگر سستی اور تساہل کا برتاؤ
زیادہ ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ تک سب کے
ذہن میں راسخ ہے کہ جتنا کم روپیہ لگایا جاوے بہتر ہے اس
قاعدے پر عمل کرنے والے اپنے خیالِ خام میں سیکڑوں نقصان
اُٹھاتے ہیں مثلاً مویشی کا حال دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ
اکثر ناعاقبت اندیش یہ نہیں سوچتے کہ جس قدر بیل کو سانی اور دانہ
زیادہ ملے گا اُسی قدر وہ کام زیادہ دیں گے اُن کے مویشی
دُبلے لقات دیکھنے میں آتے ہیں ہڈیاں نکلی ہوئیں جلد لٹکی ہوئی
صورت پر مُردنی محنت کیا خاک اُن سے ہوسکیگی۔ زمین کے
تردد کا حال یہ ہے کہ جس قدر کم محنت کیجائے جس قدر پیسا کم

لگایا جائے اسی قدر اُن کے نزدیک نفع زیادہ ہے اگر ایسا نہوتا تو فن زراعت و فلاحت میں کچھ تو ترقی ہوتی - جو گھر گھاٹ کھیتی کا بیر بکرماجیت اور راجہ بھوج کے وقت میں تھا وہی اب تک چلا جاتا ہے زمین کی درستی کا ایک گر پانس یعنی کھاد ہے سو اس کا حال یہ ہے کہ ہزارہا برس سے ایک ہی قسم کی پانس کھیتوں میں پڑا کرتی ہے آج تک وہی پانس ہے اور وہی زمین کوئی نئی ایجاد کسی نے نہیں نکالی حالانکہ سیکڑوں چیزیں ایسی موجود ہیں یا ہوسکتی ہیں جن کی پانس سے زمین کو قوت ہو - ہندوستان میں زیادہ صرف انسان اور حیوان کے فضلہ کا ہے کچھ شک نہیں کہ یہ بہت زوردار پانس ہے مگر ایک غضب ہے یہ کہ وہاں سال میں آٹھ مہینے غریب غربا گوبر کے اُپلے پاتھتے ہیں اور انہیں خشک کر کے ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں اگر یہ نکریں تو بیچارے لکڑی اتنی کہاں سے لائیں ہاں برسات کی فصل میں جس قدر گوبر جمع ہوجاتا ہے وہ البتہ کھیتی کے کام آتا ہے ملک دکن میں بھیڑ بکری کی مینگنی کا زیادہ رواج ہے آدمی کا فضلہ شہروں میں اور قصبوں میں زیادہ جمع کیا جاتا ہے اور کسان اور باغبان اُسے خرید کے پانس کی مصرف میں لاتے ہیں علاوہ ان کے اور بھی چیزیں پانس کے کام میں آتی ہیں -

نبات کو بھی مثل حیوان کے غذا درکار ہے پر نبات بجائے خود
ایک جسم نامی ہے اور نشو و نما کے واسطے بدل ما یتحلل یعنے غذا کا پہنچنا
ضرور ہے اگر زمین میں وہ اجزا موجود نہ ہوں جن کی ضرورت
کسی خاص نبات کو ہے تو لامحالہ اس کی تروتازگی میں کمی واقع
ہوگی قد چھوٹا ہو جائیگا پتے مرجھا جائیں گے پھولنا پھلنا موقوف
ہو جائیگا اور اگر رشتہ غذا قطع کیا جائے تو یقین ہے کہ بالکل
سوکھ جائیگا۔ جو مادہ نبات کو غذا پہنچائے اُسے پانس کہتے ہیں
اعم اس سے کہ وہ نباتی ہو یا حیوانی یا جمادی اس تعریف سے
ظاہر ہے کہ پانس کی تین قسمیں ہیں۔ اول وہ پانس جو نباتات
سے نکلتی ہے اس قسم کی پانس کا یہ فایدہ ہے کہ زمین کو ڈھیلا
کر دیتی ہے اور مسام اس کے کھول دیتی ہے اور مٹی کو ہلکا کر دیتی ہے
دوسرا فایدہ یہ ہے کہ درخت کی جڑ کو غذائے نباتی پہنچاتی ہے۔
اور تیسرا فایدہ یہ ہے کہ نبات جب سڑنے لگتا ہے تو اس میں سے
کچھ مواد جمادی بھی نکلتا ہے اسے درخت کی جڑ بہت جلد اور
بسہولت جذب کر لیتی ہے اگر ہری گھانس کا ٹکر انبار کر دیا جائے
اور پھیلائی نہ جائے تو بہت جلد سڑ جاتی ہے کیونکہ پتوں کا
عرق گرمی سے پکنے لگتا ہے اور پتوں کو گلا دیتا ہے

اگر ہری گھانس یا پتے زمین میں دبا دئے جائیں تب بھی وہ بات
حاصل ہوتی ہے چنانچہ باغوں اور کھیتوں میں سے جب جنگلی گھانس
پات صاف کرکے کسی گڑھے یا خندق میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ
سڑ گل کر اور زمین میں مل ملا کر تھوڑے عرصے میں بہت عمدہ پانس
بنجاتا ہے علی ہذالقیاس اگر ہرے کھیت میں ہل چلا دیا جائے
اور درخت کھیت کے کھیتی میں ملا دئے جائیں تو بھی نفع پانس کا
حاصل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ملکوں میں لوبیا اور کہیں کمی
اور کہیں شلجم اور کہیں سرسوں کے درخت کھیت میں ملا دئے جاتے ہیں
اور ان کے سڑنے کے بعد زمین پھر تیار کی جاتی ہے اور دوسرا
اناج بویا جاتا ہے۔ آلو کھو دلینے کے بعد اگر پتے اُسی کھیت میں
دبا دئے جائیں تو بڑی قوت زمین کو پہنچتی ہے بلکہ اگر نئی کونپلیں
ہمیشہ چن ڈالی جایا کریں تو آلو زیادہ پھلتے ہیں اور علاوہ اس کے
پتے زیادہ دنوں تک سبز رہتے ہیں پھر جب آلو کھودے جائیں
تو اس وقت ان سبز پتوں سے بہت ساری پانس زمین کو ملتی ہے
اور وہ ایسی زوردار ہوتی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ کسی اور پانس کے
ڈالنے سے اتنے بڑے آلو نہیں پھلتے۔ تاکستانوں میں جب انگور
کی بیلیں تراشی جاتی ہیں تو باغبان پتوں کو انہیں درختوں کی

جڑوں میں دبا دیتے ہیں انگور کے واسطے یہ بہت عمدہ پانس ہے
انگلستان میں بعض موٹے قسم کا اناج مثل جئی وغیرہ کے خاص اسی
مصرف کے واسطے کھیت میں بو دیا جاتا ہے اور جب وقت
اُس کے پھولنے کا آتا ہے تو ہل سے اُسی کھیت میں ملا دیا جاتا ہے
بعض نباتات سمندر میں پیدا ہوتے ہیں اور اکثر بہکر کنارے
آ لگتے ہیں یہ بھی زمین کے واسطے اکسیر ہیں علی ہذالقیاس ہمارے
یہاں جھیلوں اور تالابوں میں بہت سی قسم کی نبات مثل سوار وغیرہ
کے پیدا ہوتے ہیں کہ اگر نکالکر کھیت میں ملا دئے جائیں تو
زمین کو ان سے بڑی قوت ہو۔

کسانوں کے کوڑے یعنے گائے بیل کے باندھنے کی جگہ سے
جو روز مرہ کوڑا پرانی ملی دلی پیال اور علف وغیرہ کا نکلتا ہے۔
وہی پانس کے کام آسکتا ہے اگرچہ خشک گھاس پات مشکل سے
سڑتا ہے مگر مویشی کے فضلے کے ساتھ ملا دیا جائے تو جلد سڑ جاتا ہے
اس پانس کے کھیت میں ڈالنے کے بھی اوقات مختلف ہیں
جو کھیتی ایسی ہے کہ اُس کو دفعۃً زور پہنچانا چاہئے اُس میں تو
وہی پانس خوب ہے جس میں پیال وغیرہ خوب سڑ کر مل گئی ہو
اور جو پانس خوب نہ سڑ گل گئی ہو اُس کو ایسے کھیت میں ڈالنا چاہئے

جس میں منظور ہو کہ قوت رفتہ رفتہ پہنچے اور عرصے تک رہے۔
چونے کے کارخانوں میں جہاں تختے وغیرہ چیرے جاتے ہیں
آرے کے تلے الغاروں براوہ نکلتا ہے۔ یہ بھی اگر بہت بہت سا
کھیت میں ڈال دیا جائے تو نامیہ بخشتا ہے ہاں اتنا البتہ ہے کہ
پہلی دوسری فصل میں نفع اس کا کم ہی کم دکھائی دیتا ہے۔
مگر تیسری چوتھی فصل میں بخوبی تمام۔ کبھی لکڑی کے براوے کو تیلی
پانس میں ملا کر اور کبھی چونے کے ساتھ بھی کھیت میں ڈالتے ہیں
ان ترکیبوں سے اثر اس کا جلد تر ہوتا ہے گیہوں کا بھوسہ بھی
بہت کار آمد چیز ہے من ڈیڑھ من فی بیگھہ اگر شلجم کے بیج کے ساتھ
کھیت میں ڈالدیا جائے تو درخت جلد ابھرتا ہے اور شلجم بڑے
اور بھاری پیدا ہوتے ہیں۔ جو وغیرہ کا بھوسہ بھی اسی طرز پر
پانس کے مصرف میں آتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ پیال اور بھوسہ
اور پتہ سے زیادہ قوت تخم میں ہے مگر تخم ایسی قیمتی چیز ہے کہ اسکی
ضایع کرنے میں سراسر نقصان ہی نقصان ہے ہاں ایک صورت
تخم کے پانس بنانیکی ہے کہ جو کھلی کی قسم کی چیز گائے بیل کی
سانی کے کام میں نہیں آتی ہے وہ کھیت میں ڈالکرکے گیہوں
کے واسطے یہ پانس بہت فایدہ مند ہے اور شلجم کے کھیتوں میں

بھی پڑتی ہے۔ آلو کے کھیت میں بغیر آمیزش کے ڈالنا اچھا نہیں ہے
کیونکہ پتے بڑھ جاتے ہیں اور آلو چھوٹا ہو جاتا ہے۔ ناریل کی کھلی
بھی یعنے وہ ثفل جو ناریل کی گری کا تیل نکالنے کے بعد باقی رہ جاتا ہے
بہت اچھی پانس ہے خصوص آلو کے حق میں بہت مفید ہے ۔
ہندوستان میں کسان اور باغبان لوگ تالاب کی مٹی کو بہت زوردار
جانتے ہیں اور کبھی کبھی کمزور زمینوں کو اُس سے قوت دیتے ہیں
وجہ اس کی ظاہر یہ ہے کہ تالابوں میں اور جھیلوں میں سوار کی
قسم کی صد ہا نبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب برسات کی فصل نکلجاتی ہے
اور پانی خشک ہونا شروع ہوتا ہے تو یہ گھانس سڑگل کر زمین میں
مل جاتی ہے علاوہ اس کے مرغان آبی کا گذران جھیلوں میں
بہت ہے اُن کا بھی فضلہ یعنے بیٹ وغیرہ تھوڑا بہت اُس میں
ملا ہوا ہوتا ہے مگر مٹی کو کھود کر ایک جائے سے دوسری جائے
لیجانا ایسا مشکل کام ہے کہ عموماً کسان لوگ اس پانس کے نفع سے
محروم رہتے ہیں شاید بہتر یہ ہو کہ قبل خشک ہو جانے کے سوار وغیرہ
ٹوکروں میں بھر بھر کر کھیتوں میں ڈالا کریں بلکہ اس کے ساتھ
تھوڑا سا یا زیادہ اور کچھ چونا اور کھاری نمک اور ہڈی وغیرہ ملا لیا کریں
تو یقین ہے کہ اور زیادہ فائدہ بخشے ۔

مطالب بالا سے یہ قاعدۂ کلیہ مستنبط ہوتا ہے کہ کل نباتات جب سڑنے لگتے ہیں یا سڑ گل چکتے ہیں تو اُس وقت یہ زندہ نباتات کے کام آتے ہیں اور انہیں قوت دیتے ہیں اور غذا پہنچاتے ہیں مگر کون گھانس اور کون پتا کس کھیت کے واسطے مفید ہے اور کس قدر اور کس وقت ڈالنا چاہئیے یہ باتیں کسان کو تجربے اور امتحان سے دریافت ہو سکتی ہیں قیاسا کوئی نہیں بتا سکتا کہ گیہوں کے واسطے بھوسہ مفید ہے یا آلو کے واسطے سوار۔

نباتات کی قوت دو باتوں کے دریافت ہونے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ ان میں اجزائے ارضی کس قدر ہیں۔ دوم یہ کہ ان میں نٹروجن کس مقدار میں شامل ہے۔ فہرست ذیل اس غرض سے مرتب کی گئی ہے کہ پڑھنے والا معلوم کرلے کہ ایک ٹن یعنے ۲۸ من پانس کے ڈالنے سے کے رطل مادۂ ارضی زمین کو حاصل ہوتا ہے۔

ایک جانب اُن نباتی اشیاء کے نام لکھے گئے ہیں جو بجائے پانس کام میں لائے جاتے ہیں دوسری جانب ہندسے دئیے ہوئے ہیں جن سے مقدار مادۂ جمادی معلوم ہوتی ہے۔

فی ٹن	پونڈ یعنے رطل
گیہوں کی پیال	۷۰ سے ۳۶۰ تک
اوٹ کی پیال	۱۰۰ 〃 ۱۸۰ 〃
گھاس	۱۰۰ 〃 ۳۰۰ 〃
جو کی پیال	۱۰۰ 〃 ۱۳۰ 〃
مٹر کی پیال	۱۰۰ 〃 ۱۱۰ 〃
باقلہ کی پیال	۱۰۰ 〃 ۱۳۰ 〃
جئی کی پیال	۵۰ 〃 ۱۰۰ 〃
آلو کی کوپلیں (خشکیدہ)	۴۰۰ 〃
شلجم کی کوپلیں (خشکیدہ)	۳۷۰ 〃
کھلی	۱۲۰ 〃
سمندر کی سوار	۵۶۰

مگر اتنا یاد رہے کہ مقدار ہی فقط قوت کی دلیل نہیں مثلاً کچھ ضرور نہیں کہ شلجم کی کوپلیں یا باقلہ کی پیال گیہوں کے کھیت کو سب سے زیادہ فایدہ بخشیں اور بھی صفتیں اور خاصیتیں ایسی ہیں جن کا خیال رکھنا چاہیئے چنانچہ نیٹروجن کی زیادتی اور کمی سے بھی زیادتی اور کمی پالش کی قوت کی معلوم ہوتی ہے فہرست ذیل

میں ہندسہ اس حساب سے مندرج ہیں کہ پڑھنے والا انہیں دیکھکر معلوم کرے کہ کس قدر نباتی اجزا سو رطل کونڈہ کے کھاد کے برابر ہے۔ یہاں کونڈہ کے کھاد سے وہ پانس مراد ہے جو مویشی کی لید اور پیشاب اور بچی بچائی پیال اور گھاس وغیرہ سے مل ملاکر تیار ہوتی ہے۔

قسم پانس	پونڈ یعنے رطل
کونڈہ کی کھاد	۱۰۰
گیہوں کی پیال	۱۰ سے ۷۰ تک
اوٹ کی پیال	۱۵۰
جو کی پیال	۱۸۰
مٹر کی پیال	۴۵
گیہوں کا بھوسہ	۵۰
سبز گھاس	۸۰
آلو کی کوپلیں	۶۵
تازی سمندر کی سوار	۸۰
خشکیدہ	۲۰
گیہوں یا مکئی کی بھوسی	۴۶
کھلی	۸

دوسری قسم پانس کی وہ ہے جو حیوانات سے حاصل ہوتی ہے
اس میں حیوانات کا گوشت خون ہڈی سینگھ بال پشم فضلات
سب شامل ہیں۔ مواد حیوانی میں قوت نباتات کی نسبت زیادہ
فقط نباتات کے تخم تو البتہ مقابلہ کرسکتے ہیں باقی کوئی شئے
اُس کے برابر نہیں ہے۔

گوشت بہت کم پانس کے مصرف میں آیا کرتا ہے الاجب
کبھی کوئی گھوڑا یا گائے یا بیل یا کوئی اور جانور مرجائے تو
اُسے زمین میں سڑا کر پانس بنا سکتے ہیں اگرچہ ہمارے ملک میں
بعض مردار خوار قومیں ہیں کہ اسے بھی نہیں چھوڑتی ہیں جیسے
چمار۔ ڈوم۔ کنجر وغیرہ یا دکن میں ڈھیر کی قوم۔ خون بھی کارآمد
چیز ہے اگر مسلخوں میں خون جمع کیا جایا کرے تو کھیتی کے کام
آسکتا ہے اسے راکھ اور چور کئے ہوئے کوئلوں میں ملا کر شلجم یا
گیہوں کے کھیت میں ڈالتے ہیں اور کبھی کھاد میں ملا کر ڈالتے ہیں
مگر ہلکی بھوڑ کھیتوں میں زیادہ مفید ہے۔

انگلستان میں تاجر لوگ مسلخوں کے خون کا ٹھیکا لیا کرتے
ہیں اور اسے بیچا کرتے ہیں۔ فرانس میں خون خشک کرکے فروخت
ہوتا ہے۔ شکر اور قند کے کارخانوں میں کوئلا اور چونے کا

پانی خون میں ملا کر شکر صاف کرنے کے کام آتا ہے چنانچہ ہندوستان میں بھی
شاہجہان پور کے کارخانے میں اس کا خرچ ہے جب شکر صاف ہو چکتی ہے
اور یہ خون میں ملا ہوا کوئلا نکال ڈالا جاتا ہے اُس وقت اُسے کسان لوگ مول لیکر
کھیتوں میں ڈالتے ہیں اس کوئلے میں سو حصوں میں بیس حصہ خون کا ہوتا ہے
چمڑا اس طرح پانس کے کام آتا ہے کہ سریش بنانے والے جب چمڑے کے
ٹکڑوں کو جوش دیکر گلاتے ہیں تو اُسمیں سے بہت سا فضلہ بچتا ہے اس
فضلے کو کھیتوں میں ڈالتے ہیں آلو کے واسطے یہ پانس مفید نہیں ہے
باقی بہت سی چیزوں کو مفید ہے مچھلی کی پانس بہت اچھی ہوتی ہے
مگر تیز اتنی ہوتی ہے کہ بغیر آمیزش کے نہیں ڈالی جا سکتی اس واسطے
تھوڑی سی مچھلی بہت سی مٹی میں ملا کر کھیتوں میں ڈالتے ہیں
ہندوستان میں بھی اس پانس سے پھلوں کے درخت کو قوت دیتے ہیں
مثلاً مچھلی کو سڑا کر مٹی میں ملا کر انگور اور لیچی وغیرہ کی جڑوں میں ڈالتے ہیں
دریا کے قریب جو بلاد واقع ہیں اُن میں مچھلی ارزاں ہوا کرتی ہے اور پانس کے
مصرف کے واسطے خرید کی جا سکتی ہے مچھلی کی طرح کیڑے مکوڑے بھی
زمین کے حق میں مفید ہیں ہزارہا حشرات الارض اس قسم کے خود بخود
ہر کرمٹی میں بجا یا کرتے ہیں اور اُن سے زمین کو قوت پہنچتی ہے زندگی
اُن کی بیکار نہیں جاتی کچھ نہ کچھ نفع اُن کی ذات سے بھی خلق اللہ کو

پہنچتا ہے۔ جانوروں کے سینگ اور بال اور ریشم مفید چیزیں ہیں۔
خون اور گوشت اور مچھلی میں اور اِن چیزوں میں اتنا فرق ہے کہ خون
وغیرہ میں پانی بہت سا مخلوط ہے اور یہ بالکل خشک ہیں مگر چونکہ زمین
میں ملنے کیلئے گھلنا شرط ہے اس واسطے خون اور گوشت اور مچھلی کا
اثر ان سخت اجزائے حیوانی سے جلدتر اور قوی تر ہوتا ہے اگرچہ اُتنے
عرصے تک قایم نہیں رہتا اونی کپڑوں کے پرانے ٹکڑے مٹی میں لت
کرکے آلو شلجم وغیرہ کے کھیتوں میں ڈالے جاتے ہیں مگر پہلے کچھ دنوں
سڑائے جانے کے بعد چین کے ملک میں سر گھٹانے کا بڑا رواج ہے
دسویں دن ہر شخص بال اترواتا ہے اور یہ سارا کوڑا جمع ہو کر کھیتوں میں
ڈالنے کے کام آتا ہے نعلبند اور شانہ گر کی دوکان کا کوڑا بھی جمع ہو کر
بکتا ہے اور مثل پشکلنہ کے مٹی میں سڑا کر کھیتوں میں پڑا کرتا ہے۔

اشیائے مفصلۂ بالا کے زمین کو فائدہ بخشنے کا بھید یہ ہے کہ انکی
ترکیب میں جزو نیٹروجن بہت سا راشامل ہے چنانچہ خشکیدہ خون
اور گوشت اور مچھلی میں سو حصوں میں ساڑھے پندرہ حصہ اور
خشکیدہ جلد اور بال اور ریشم اور شاخ اور سم میں سولہ سے ساڑھے
سترہ حصے تک نیٹروجن موجود ہے مگر پانی کی مقدار ان میں بہت
مختلف ہے خون اور گوشت اور مچھلی میں (۸۰) سے (۹۰) حصے تک

اور بال اور ریشم اور شاخ میں (۱۰) سے پندرہ حصے تک پانی پایا
جاتا ہے اسی وجہ سے یہ چیزیں گوشت وغیرہ کی نسبت بہت دیر میں
سڑا کرتی ہیں اور فائدہ ان کا زمین میں جلد محسوس نہیں ہوتا علاوہ
نیٹروجن کے قدرے قلیل اجزائے ارضی بھی ان مادوں میں
ملے ہوئے ہیں جن کا اثر زمین پر کچھ نہ کچھ ضروری ہوتا ہے
مثلاً خون میں نمک شورہ کے ہے بالوں میں گندھک اور گوشت میں
فاسفرس۔ اب اس قسم کی پانس میں ہڈی اور فضلات کا بیان باقی
رہ گیا۔ ہڈی خشکی میں بال اور شاخ کے مشابہ ہے مگر اجزائے ارضی
اس میں بہت زیادہ ہیں یعنے سو میں ۶۷ حصہ اجزائے ارضی ہیں
اور ۳۳ حصہ اجزائے حیوانی۔ ہڈی کے کھیتوں میں ڈالنے کی کئی
ترکیبیں ہیں ایک یہ ہے کہ ہڈیاں چورہ کیجاتی ہیں اور کسی بڑے
ظرف میں رکھکر ہڈیوں کے ہم وزن پانی اس میں ڈال دیا جاتا ہے
اور ایک شخص بیلچہ سے اسے خوب سا ہلا کر تلے اوپر کر دیتا ہے کہ
ہڈی بخوبی بھیگ جائے اور اسی حالت میں دوسرا شخص سلفیورک ایسڈ
یعنی گندھک کا تیزاب (ساٹھ حصہ) آہستہ ڈال دیتا ہے اور بیلچہ والا
بیلچہ چلائے جاتا ہے اور یعنی سو حصہ ہڈی میں پچاس سے پچھتر
حصہ تک تیزاب سو سے تین حصہ تک پانی میں ملا کر ڈالا جاتا ہے

بہر حال تیزاب کے پڑتے ہی ہڈیاں پکنے لگتی ہیں اور شدت سے
گرم ہو جاتی ہیں اور تھوڑی دیر میں سب گل جاتی ہیں اور اس وقت
انہیں برتن سے نیچے اونڈیل کر تھوڑی دیر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ
ٹھنڈی ہو جائیں اگر کئی من ہڈیاں اکٹھی ہی مرتبہ گلائی جائیں تو
ضرور ہے کہ کئی دن ظرف میں رہنے دیجائیں اور اگر تھوڑی تھوڑی
گلائی جائیں اور برتن سے نکالکر ایک ہی جاے میں ڈھیر کر دی جایا کریں
تو بہت سی اکٹھی ہی ان میں گلائی جاسکتی ہیں۔ ان گلی ہوئی
ہڈیوں کو دھوپ میں پھیلا کر خشک کر لیتے ہیں یا چور کئے ہوئے
کوئلوں میں یا لکڑی کے برادے میں یا انہیں بھربھری مٹی میں
ملاکر خشک کر کے کھیت میں ڈالتے ہیں۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ
ہڈی کو گلاکر اس کے بوجھ کے حساب سے پچاس گنا پانی ملاکر اس سے
کھیت سینچ دیا جاتا ہے۔ ایک نئی ترکیب یہ ہے کہ ہڈیوں کو
چور کر کے پہلے پانی میں بھگو لو اور پھر اس میں دو برابر گھانس کی
راکھ یا پتھر کے کوئلوں کی راکھ یا ریگ خالص میں ملاکر ڈھیر کر دو
چند روز میں ڈھیر گرم ہو جائے گا اور اوپر کی ایک تہ چار یا پانچ
انگل گہری تو البتہ نہیں گلے گی باقی سب ہڈیاں گل جائیں گی
اس ترکیب میں بہت آسانی ہے اور خرچ بھی بہت کم پڑتا ہے

فضلات - غذائے منہضم کا فضلہ بڑی قوت دار چیز ہے -
علم فلاحت کے محققین کا قول ہے کہ سیر بھر غذا ہضم ہونے کے بعد دو سیر کے برابر قوت زمین کو بخشتی ہے ۔ فضلے کی دو قسمیں ہیں - اول رقیق دوم غلیظ - فضلۂ رقیق سے بول یعنی پیشاب مراد ہے غلیظ سے انسان کے براز گھوڑے اور گائے بیل بھیڑ بکری کی لید گوبر مینگنی وغیرہ اور پرند کی بیٹ - پیشاب میں قوت بوجہ ملحیات کے ہوتی ہے - یعنے نمک کی قسم کی چیزیں جو اس میں شریک ہیں - آدمی کے بول میں ہزار میں ۹۳۲ حصے پانی ہوتا ہے اور باقی نمک نوشادر اور چند مرکبات فاسفرس کے اور بعض مرکبات نیٹروجن کے ہوتے ہیں یعنے مثلاً ہزار رطل پیشاب میں ۶۸ رطل خشک اجزا نکل سکتے ہیں جو زمین کے حق میں نہایت مفید ہیں - ایک آدمی سال بھر میں بحساب اوسط ہزار پونڈ بول دفع کرتا ہے جس میں ۶۸ پونڈ یا ۵ پانس کے کام کا ہوتا ہے اگر کسی شہر میں لاکھ آدمی رہتے ہوں تو اُن کے بول سے پندرہ ہزار ایکڑ یعنے قریب قریب چھبیس ہزار بیگھہ زمین میں پانس پڑ سکتی ہے - گائے بیل بھیڑ بکری کے پیشاب میں اور آدمی کے پیشاب میں بڑا فرق ہے آدمی کے پیشاب میں فیصدی چھ حصہ فاسفرس کے مرکبات پائے جاتے ہیں اور

ان جانوروں کے پیشاب میں یہ اجزا بالکل مفقود ہیں - اگر آدمی کا پیشاب جمع کیا جائے اور جب گرمی سے سڑ کر جوش کھانے لگے اس وقت اس میں چونے کا پانی ڈالدیا جائے تو بہت سے خشک اجزا اس کے نیچے بیٹھ جائیں گے خصوصاً وہ چیزیں جن میں فاسفر شریک ہے اس کو خشک کر کے اگر جمع کریں تو بہت عمدہ پانس اسکی بن سکتی ہے گائے بیل کے پیشاب میں پانی کم ہوتا ہے اور بارہ مہینے میں ایک جانور کے پیشاب سے ہزار پونڈ خشک مادہ نکل سکتا ہے مگر انسان حیوان دونوں کا پیشاب عموماً بغیر خشک کئے کھیتوں میں ڈالا جاتا ہے اس کے جمع کرنے کے واسطے مسقف یعنے چھت دار حوض بناتے ہیں اور آدھوں آدھ پانی ملا کر پیشاب کو جمع کرتے ہیں اور جب اس میں جوش ہونے لگتا ہے اس وقت اسے نکال نکال کر کھیتوں میں ڈالتے ہیں یا خشک پانس کو اس سے بھگا کر سڑا لیتے ہیں پیشاب کے جوش کھا چکنے کی علامت یہ ہے کہ اس کے سطح پر کہن یعنے پھین پیدا ہوتا ہے اور بلبلے نکلنے شروع ہوتے ہیں ایک ترکیب اور اس کے خشک کرنے کی یہ ہے کہ پیشاب کو حوض میں جمع کر کے تھوڑا سا گندھک کا تیزاب ملا دیتے ہیں یہ تیزاب اس کے خشک اجزا کو لیکر نیچے بیٹھ جاتا ہے اور اسے ہوا میں

خشک کرنے سے ایک سفوف سا نکل آتا ہے۔ اس سفوف کو
کھیتوں میں پھیلا دیتے ہیں یا نہیں تو آدھوں آدھ گونٹ کی یا نسب
کے ساتھ ملا کر ڈال لیتے ہیں یا نمک اور راکھ کے ساتھ ملا کر یا گلی ہوئی
ہڈیوں میں آمیختہ کر کے کھیت میں ڈال لیتے ہیں اصل اصول پیشاب
کی قوت کا آمونیا ہے جو نائٹروجن اور ہیڈروجن سے بنی ہوئی
شئے ہے اور نوشادر اسی سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ پیشاب میں
اس کی بو تیز ہوا کرتی ہے۔ یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ اگر پیشاب
تازہ کھیت میں ڈالا جائے تو درختوں کو جلا دیتا ہے کیونکہ اس میں
آمونیا جو بڑی حاد اور تیز چیز ہے خالص بلا آمیزش نکلتا ہے اور
درختوں کو نقصان پہنچاتا ہے مگر جب پانی میں ملا کر اسے کچھ دنوں
سڑا لیتے ہیں تو آمونیا اور اجزا کے ساتھ مل جاتا ہے اور تیزی
اس کی دھیمی ہو جاتی ہے اور نباتات کے غذا کی گون کا ہو جاتا ہے
اور ساتھ ہی اس کے زیادہ دنوں بھی اس کا سڑانا اچھا نہیں کیونکہ
اس صورت میں بہت سے اجزائے مفید اس سے نکل جاتے ہیں
اور قوت کم ہو جاتی ہے بلکہ غایت مرتبہ دو یا ڈھائی ہفتے رکھا جائے
تو بس ہے اگر زیادہ دنوں رکھنا منظور ہو تو اس میں کچھ سڑے
ہوئے پتے وغیرہ اجزائے نباتی ملا لینے چاہئیں کہ یہ ان اجزا

مقوی کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ پانس ہلکی بھوڑ زمین میں ٹیار اور سخت
زمین سے زیادہ فائدہ دیتی ہے اور یوں تو عموماً کل رقیق پانس خشک
پانس سے ان معنوں میں بہتر ہوتی ہے کہ اس کے اجزا سڑنے کے
وقت خوب باہم مل جاتے ہیں اور کھیت میں ہر جگہ یکساں اور
برابر زور پہنچاتے ہیں۔ ایک فائدہ پیشاب کی پانس کا اور یہ ہے کہ
بعض قسم کے کیڑوں کو جن سے درختوں کا بڑا زیان ہوتا ہے اس کے
حاد اجزا مار ڈالتے ہیں۔

اب غلیظ فضلات کا بیان باقی رہ گیا۔ ان میں سب سے زیادہ
قوت دار شاید براز ہے اور اُن اقوام کے براز سب سے بہتر پانس ہے
جو گوشت کھایا کرتے ہیں براز کو کھیت میں ڈالنے کی بہت سی
ترکیبیں ہیں ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں خاکروب براز کو
گڑھوں اور کھتوں میں جمع کرتے ہیں اور بعد سڑ جانے کے لوگ
چھکڑوں اور گدھوں پر بار کرکے لیجاتے ہیں اور کھیتوں میں
ڈالتے ہیں جہاں کہیں میونسپالٹی یعنے محکمات صفائی سرکار کی
طرف سے قایم ہیں وہاں اہل صفائی سال سال کا ٹھیکہ شہر کے
غلیظ کا ٹھیکہ داروں کو دیدیتے ہیں اور وہ خاکروبوں سے
کھتوں میں جمع کرواتے ہیں اور ایک سال کا کوڑا دوسرے سال

کسانوں اور باغبانوں کے ہاتھ بیچ لیتے ہیں۔ اس ترکیب میں ایک
نقصان یہ البتہ ہے کہ اس پانس میں بدبو بڑی ہوتی ہے گر شاید
اجزائے غذائی اس صورت میں کم ضایع ہونے پاتے ہیں ہر
انگلستان میں پہلے اسے کچھ پنڈول اور چونے میں ملا کر خشک کر لیتے
یا نہیں تو چورکئے ہوئے کوئلے کے ساتھ یا لکڑی کا برادہ اور پنڈول
اور چونا ملا کر جمع کرتے ہیں چین کے ملک میں چکنی مٹی کے ساتھ
ملا کر اس کی اینٹیں بنا لیتے ہیں اور بازار میں بیچتے ہیں اسے
وہاں ٹافو کہتے ہیں۔ ایران میں غلیظ کو پہلے دھوپ میں خشک
کر کے دوبرابر سوکھی مٹی اس میں ملا لیتے ہیں مگر ان ترکیبوں میں
ایک نقصان یہ معلوم ہوتا ہے کہ گیلی پانس زمین کو نہیں پہنچتی خشک
ہو کر پہنچتی ہے پس اصول کے موافق قوت میں اس کے بہت
کمی ہو جاتی ہے چنانچہ تجربے سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے
اور ہندوستان کے تجربہ کار کاشتکار لوگ ہمیشہ کھتے کی کھاد کو زیادہ
پسند کرتے ہیں قیاس اس کا مقتضی ہے کہ اگر کھیتوں میں بند کرنیکے
وقت ہمارے ملک کے لوگ کھاد پر ہلکی ہلکی تہیں کنکر کی ڈالدیا کریں تو
بہت خوب ہو اور کنکر اگر کٹا ہوا ہو تو اور بہتر ہے کیونکہ کنکر کا بڑا جزو
چونا ہے اور چونا خود بھی نباتات کے حق میں مفید ہے اور علاوہ

اس کے کھاد کی بدبو کم کر دے گا اور اُس کے اجزائے غذائی کو ضایع نہ ہونے دیگا۔ اس قدر احتیاط البتہ ہر حالت میں ضرور ہے کہ کھاد زمین کے اوپر تہ ڈھیر کر دی جائے کیونکہ اس سے اول تو بدبو پھیلتی ہے اور ہوا خراب ہوتی ہے اور دوسرے بہت اجزائے غذائی اُس کے ابخرے بن کے نکل جاتے ہیں۔

غلیظ فضلاتِ حیوانی میں فقط دو قسم کی پانسوں کا بیان باقی رہ گیا۔

(۱) گوبر مینگنی لید وغیرہ (۲) پرندوں کی بیٹ۔

مویشی کے گوبر میں اس قدر زور نہیں ہوتا جس قدر آدمی کے براز و بول وغیرہ میں ہوتا ہے مادہ مقوی اس میں کم اور مادۂ بے مصرف زیادہ شریک ہے اس پر بھی کھیتی کو اس سے بڑا نفع حاصل ہوتا ہے اور مادۂ بے مصرف اس کا اور کچھ نہیں تو زمین کے قوام ہی درست کرنے کے کام آتا ہے اس قسم کے پانس میں بھی امتیاز ہے مویشی کے گوبر سے گھوڑے کی لید میں زیادہ طاقت ہے اور گھوڑے کی لید سے بھیڑ بکری کی مینگنی میں زیادہ زور ہے گوبر اور لید وغیرہ کے جمع کرنے میں اُس قاعدہ کا لحاظ ضرور ہے جس کا کھاد کے بیان میں ذکر ہو چکا یعنے اگر منظور

ہو کہ اس کے اجزائے مقوی اور زور دار ضایع نہ ہو جائیں تو اسے
ڈھنکے ہوئے کھتوں میں جمع کرنا چاہیے اور جہاں تک ہوسکے اسے
گیلا رکھنا چاہیے یعنی احتیاط کرنی چاہیے کہ اصلی نمی اس کی نہ جاتی رہے
اور اگر بالفرض گھانس پھونس مٹی وغیرہ کے مل جانے سے خشک بھی
ہو جائے تو مناسب ہے کہ کھتے کو بند کرنے کے قبل پانی ڈالکر تر کر لیں
اور جب اسے کام میں لانے کا وقت آوے تو فوراً کھتے میں سے
نکالکر کھیت میں پھیلا دیں یا ہل کے ذریعے سے ملا دیں باہر نکالکر
انبار نہ کر دیں کہ اس سے پانس کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور اس بیان سے
شاید یہ امر بھی پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ ہل سے
جوت کر پانس کو کھیت میں ملا دینا پھیلا دینے سے بہتر ہے کیونکہ
پھیلا دینے میں مینہ کا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ پانس کو بھگو کر سارے
کھیت میں تقسیم کر دے پس خواہ مخواہ بہت سے اجزائے مقوی
اس کے اڑ جائیں گے اور زور کم ہو جائے گا اور یوں تو تھوڑے
بہت اجزائے مقوی ہر ترکیب میں ضایع ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک
بڑا جز آمونیا جس کا بیان پہلے بھی ہو چکا ہے مشکل سے ٹھہرتا ہے
بعض علمائے فلاحت نے ایک نسخہ اس جز کے قایم کر دینے کا
نکالا ہے (۵۶) سیر سلفیٹ اف ایرن یعنی گندھک کے تیزاب

اور لوہے کا ایک خاص مرکب جو بازار میں مل سکتا ہے اسے کوئی
دس من پانی میں گھولکر کچھ لکڑی کا برادہ اُس میں بھگوئے اور اس
پانی کو پانس جمع کرنیکے مقاموں میں چھڑک دے اس تدبیر سے
یہ نفع ہوگا کہ پانس کا زور نہ گھٹے گا اور جو فائدہ بہت سی پانس ڈالنے
اب حاصل نہیں ہوتا اس عمل کے بعد تھوڑی سی پانس سے حاصل
ہونے لگے گا۔ ہندوستان کے کاشتکار بیان کرتے ہیں کہ ہاتھی کی
لید کام کی نہیں ہوتی۔ یہ امر راقم کی سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ از روئے
قاعدہ کیمیاوی اس کی کوئی وجہ موجہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ شاید
ہاتھی کی لید اچھی طرح سڑ لیجائے تو بہت زور دار پانس بنے ایک
وجہ اس کے ناپسند ہونیکی غالباً یہ ہے کہ ہاتھی کم یاب جانور ہے
فقط امیر اُمرا کی ڈیوڑھی پر بندھا کرتا ہے اور غربا کو اُس کی لید ملنی
دشوار ہے اور اگر ملے بھی تو بایں وجہ کہ لید اُس کی بہ نسبت گوبر کے
غیر منہضم ہوتی ہے شاید فایدہ اُس کا زمین میں جلد ظاہر نہیں ہوتا
اور کاشتکار اُسے بیکار تصور کر لیتا ہے بہر حال یہ مسئلہ امتحان طلب ہے
کیونکہ اگر تجربہ اس کا فایدہ ثابت ہو جائے تو اُمرا اسے اپنے باغات
کے مصرف میں لا سکتے ہیں تا کہ ایک شئے جو اب ضایع ہوتی ہے
انسان کے کام آنے لگے سلیقہ اسی کا نام ہے کہ آدمی کسی چیز کو

حتی الوسع ضایع نہ ہوتے وے علم فلاحت میں فی زمانناس قدر ترقی زیادہ تر اسی قاعدے کے برتاؤ سے ہوئی ہے۔

گوبر اور لید وغیرہ کے بچانے کی ایک ترکیب اور بھی کتابوں میں لکھی ہے یعنے سو حصہ تازہ مادہ میں دو حصہ چونا لا کر جمع کرنا اس سے بھی امونیاوی اجزا اُس کے ضایع ہونے سے بچ جاتے ہیں پر بڑا گُر ہر قسم کی حیوانی بانس کے جمع کرنے کا یہ ہے کہ کھلی نہ رہے اس فایدہ کے حاصل کرنے کا طریقہ لارنس صاحب نے اپنے کتاب میں خوب لکھا ہے میں اس ترکیب کو علی گڈھ سائنٹیفک سوسائٹی کے ترجمہ رسالہ علم فلاحت کے صفحہ ۷۵ سے نقل کرتا ہوں یقین ہے کہ اگر ہمارے ملک کے کسان اس پر عمل کریں تو بڑا فایدہ حاصل ہوگا۔ یہ وہ اُمور ہیں کہ بغیر تجربہ آدمی ان کے منافع پر مطلع نہیں ہوتا۔

۸ خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ کھیت کی حیثیت کے موافق ایسے موقعوں کے تین مقام یا زیادہ تین سے پسند کئے جاویں کہ اُس کھیت کے رستوں کے اطراف و جوانب میں کاشت شدہ زمین کے قریب ہوویں بعد اُس کے وہ مقام دو فٹ گہرے کھود کر اُن کے اندر چار انچہ مٹی پھیلا دیجائے جو اُن کی تری کو جذب کرے اور بعد اُس کے کھاد کو برابر پھیلا کر خوب پانوں سے روندیں یہاں تک کہ جب قریب ایک فٹ زمین کے

اور پشتہ بندھ جاوے تو اُس پشتہ کو اس خیال سے چھوڑیں کہ وہ سوکھکر تلے کو بیٹھے اور بعد اُس کے برابر تہیں اس پر چڑھاتے جاویں اس طرح پر کہ وہ بتدریج گول ہوتا جاوے اور جبکہ وہ مخروطہ کے مشابہ ہوجاوے تو قریب ایک شل نمک کی دوگاڑی کھات پر چھڑکنا چاہئے اور یہ خوب یاد رہے کہ دور قاعدہ مخروط کا اتنا کھودا جاوے جتنا کہ بر موجود ہو جس کا مخروط بنانا چاہتے ہیں اُس سے زیادہ نہووے اور جب یہ ایک پشتہ پورا ہو چکے تو ایک دو روز کے فاصلے سے مٹی کا لیو اُس پر چڑھایا جاوے کیونکہ مٹی ہوا کو گذرنے نہیں دیتی جس سے کھات کے اجزا کی تفریق ہوجاتی ہے البتہ اگر کچھ تفریق اجزا کی ہوتی بھی ہے تو صرف اُسی قدر کہ ذرا بہت امونیا کو پشتے کے اندر کی زمین جذب کرسکے اس لئے کہ پشتوں کے آس پاس امونیا کا نشان پایا نہیں جاتا ہے۔ انتہی

پرند کی بیٹ۔ کبوتر کی بیٹ ہمارے ملک میں لوگ کبھی کبھی پھولوں کے چمنوں میں ڈالا کرتے ہیں مگر چونکہ یہ شئے کہیں اس قدر دستیاب نہیں ہوتی کہ بڑے بڑے باغوں کے کام آئے یا کھیتوں میں ڈالیجائے اس واسطے کاشتکاری میں اس کا خرچ نہیں ہوتا۔ امریکہ اور افریقہ میں دریائے شور کے کنارے اور جزایر غیر آباد میں غرض جہاں کہیں

حضرت انسان کا گذر کم تھا ہزارہا لاکھ ہا بلکہ کروڑ ہا مرغانِ آبی بسیرا کرتے تھے اور اُن کی بیٹ جمع ہوتی تھی سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں برس سے یہ ذخیرہ جمع ہوتا چلا آتا تھا یہاں تک کہ اہل یورپ کا قدم وہاں پہنچا۔ ان کو اس کی قدر معلوم ہوئی شاید وہاں کے اصلی باشندوں نے یہی راہ بتائی کیونکہ بخوبی ثابت ہے کہ امریکا میں ولایت پیرو کے لوگ اس پانس کی قدر و قیمت سے واقف تھے اور زراعت میں اسے صرف کرتے تھے۔ بہرحال اہل یورپ نے اسے کھود کھود کر نکالنا شروع کیا۔ دامن کوہ اور گھاٹیوں اور میدانوں کو اس سے پٹا ہوا پایا ہزارہا لاکھ ہا من کھود کھود کر جہازوں پر بار کرکے یورپ بھیجا گیا اور اب بھی بھیجا جاتا ہے۔ اس کی بڑی تجارت ہوگئی اور بڑی قیمت سے بکنے لگا اب چونکہ اُن مقاموں میں آبادی زیادہ پھیل گئی ہے اور بیٹ کی تلاش اور کھود کھاد کثرت سے ہوتی ہے اس واسطے وہ مرغانِ آبی بھی کمتر وہاں آتے ہیں اور نئی بیٹ کم جمع ہوتی ہے چنانچہ اب سابق کی نسبت قیمت اس پانس کی فرنگستان میں بہت گراں ہے۔ لوگوں کو تو یہ گمان تھا کہ شاید کچھ دنوں میں اس کی تجارت ہی موقوف ہو جائیگی اور اس کا باب ہی بند ہو جائے گا مگر بارے ایک اور ذخیرہ اتفاقاً ہاتھ لگ گیا ہے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک امریکا میں جابجا اس کی کانیں جمع ہیں یعنے بعض مقاموں میں ہزارہا برس کی بیٹ زمین میں دبی ہوئی پڑی ہے اور اس کے مٹی جمع ہو گئی ہے درخت نکل آئے ہیں بظاہر اُس کا کچھ پتا ٹھکانا نہیں نظر آتا مگر عمیق کھودنے سے ہاتھ آتی ہے۔

اس بیٹ کو ملک پیرو کے لوگ گیانو کہتے ہیں اور فرنگستان میں بھی اسی نام سے مشہور ہے اس کی ترکیب میں آمونیا اور چند ملحیات اور فاسفرس اور ریگ وغیرہ شریک ہے اِن سب میں بڑا مقوی جز آمونیا ہے گیانو کا اثر ہڈی کے اثر سے بہت مشابہ ہے مگر ایں وجہ کہ اس میں آمونیا تیار موجود ہے اور ہڈی میں گلنے کے وقت بنتا ہے گیانو کا اثر جلد تر ہوتا ہے اور زور اس کا فوراً کھیت میں محسوس ہوتا ہے

مواد حیوانی کی مختلف قوتیں دریافت کرنے کی غرض سے ایک فہرست تیار کی گئی ہے جس میں مقدار نیٹروجن کے حساب سے ہر شئے کی قیمت کا حساب کیا گیا ہے۔

گوبر کی کھاد	۱۰۰
گوبر	۱۲۵
لید	۶۳

گائے کا پیشاب	۹۱
گھوڑے کا پیشاب	۱۶
گوبر اور پیشاب ملا ہوا	۹۸
لید اور پیشاب ملا ہوا	۵۴
مینگنی اور پیشاب ملا ہوا	۳۶
گوشت خشکین	۳
کبوتر کی بیٹ	۵
خون تازہ	۱۵
خون خشکین	۴
پرندے کے پر	۳
گائے کا پشم	۳
شاخ یعنے سینگھ کے ٹکڑے	۴
پشمینہ	۲½

اس فہرست کے یہ معنی ہیں کہ جس قدر نیٹروجن کے باعتبار سو حصہ گونڈے کی کھاد اثر کرے گی اسی قدر اثر مثلاً (۱۲۵) حصہ گوبر (۴۳) حصہ لید (۱۵) حصہ خون ۲½ حصہ پشمینہ کے ٹکڑوں سے کھیت میں ڈالنے سے ہوگا مگر اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ سوا ئی نیٹروجن کے اور بھی

اجزا ان چیزوں کی ترکیب میں شریک ہیں جن کا اثر زمین پر ہوتا ہے
عموماً یہ قاعدہ بخوبی ملحوظ رہے کہ بہت قسم کی پانسوں کو ملا کر ڈالنا
بہتر ہے اور ایک ہی قسم کی پانس مدت تک ایک کھیت میں نہیں ڈالنی
چاہیئے نفع نہیں بخشتی اور کسان کی محنت ضایع ہوتی ہے۔

بیانِ بالا سے ظاہر ہے کہ مواد حیوانی اور مواد نباتی میں بڑا
تفاوت ہے۔ اول تو مواد حیوانی میں نیٹروجن بدارج زیادہ ہے
اور اس کے سبب سے قوت بھی اس میں مواد نباتی کی نسبت
بہت زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ مواد حیوانی میں بہت جلد تعفن
شروع ہوجاتا ہے اور سڑنے کی حالت میں امونیا تیار ہوتا ہے
جو بڑا گُر پانس کی قوت کا ہے کیونکہ تجربہ معلوم ہوا ہے کہ اگر احتیاط
نہ کیجائے اور مواد حیوانی بہت عرصے تک سڑا کرے اور کھلا پڑا رہے
یہاں تک کہ سارا امونیا اس کا نکل جائے تو اس کھادمیں قوت
بہت کم باقی رہتی ہے۔

اب یہ پوچھنا چاہیئے کہ مواد حیوانی میں نیٹروجن اس قدر
کہاں سے آتی ہے آخر جانور نباتات ہی کو کھاتے ہیں اور اسی سے
اُن کا گوشت پوست بنتا ہے اور زندگی ہوتی ہے پھر جو چیز نباتات
میں نہیں ہے یا اگر ہے تو نہایت قلیل وہ حیوانات میں کیونکر اس

افراط سے پیدا ہو جاتی ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ معدہ میں طبخ کھانے سے نباتی غذائیں نٹروجن پیدا کر لاتی ہیں اور قوت ان کی بڑھ جاتی ہے اس مقدمہ کے سمجھنے کے لئے اُصول مندرجہ پر لحاظ کرنا چاہئے۔

حیوان کی زندگی دو فعل پر منحصر ہے تنفس و ہضم غذا۔ غذا طبخ معدہ میں آنکر طبخ کھاتی ہے اور پرورندہ اجزا اس کے نکل کر خون میں شریک ہو جاتے ہیں ششش اس میلے خون کو جس میں اجزائے مذکور ملے ہوئے ہیں صاف کرتا ہے اور اس میں آکسیجن ملاتا ہے اور کاربن اُس سے جدا کر کے موہنہ کی راہ باہر نکال دیتا ہے۔

غذا بدل ما تحلل ہے اس کا مصرف یہ ہے کہ جس قدر مادہ بدن سے نکل جایا کرے اُسی قدر یہ بدن کو پہنچا دیا کرے جس طرح چراغ میں جب تیل کم ہوتا ہے تو پھر اور تیل ڈال دیتے ہیں جس قدر غذا آدمی کھاتا ہے وہ سب کی سب مختلف صورتوں سے نکل جایا کرتی ہے سب سے پہلے کاربن ششش سے نکلتی ہے جوان آدمی دن رات میں (۵) اونس سے (۹) اونس تک نکالتا ہے اور اگر مشقت زیادہ کرے تو ۱۳ سے ۱۵ اونس تک کاربن نکلتی ہے فرض کرو کہ کوئی جوان شخص چوبیس گھنٹہ کے اندر ڈیڑھ رطل روٹی اور ایک رطل

یعنی آدھ سیر گوشت کھائے اور یہ بھی فرض کرو کہ وہ شخص دن رات
میں ۸ اونس کاربن سانس کے ساتھ نکالتا ہے تو حساب سے
چوبیس گھنٹے کے عرصے میں۔

کاربن	نیٹروجن	
۴۵۰۰ گرین	۵۰۰ گرین	اُس کے بدن کو پہونچی اور
۳۵۰۰ گرین	برائے نام	اُس کے بدن سے نکل گئی پس
۱۰۰۰ گرین	۵۰۰ گرین	اُس کے بدن میں باقی رہی اس سے ظاہر ہے کہ

فعل تنفس غذا میں سے بہت سی کاربن نکال دیتا ہے مگر نیٹروجن باقی رہ جاتی ہے پس اگرچہ غذا میں ۹ حصے کاربن
اور نیٹروجن ایک ہی حصہ شریک ہے۔ مگر بعد ہضم کاربن اور نیٹروجن میں
دو اور ایک کی نسبت رہ جاتی ہے اسی نیٹروجن سے گوشت پوست
حیوان کا بنتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ گو غذا میں نیٹروجن بہت قلیل ہے
پر بدن میں جا کر بہت سی جمع ہو جاتی ہے اور جب اپنا فعل کر چکتی ہے تو
فضلے کے ساتھ نکل جاتی ہے چنانچہ اسی سبب سے حیوانات کا فضلہ
زمین کے حق میں بہت مفید ہوتا ہے اور اس میں نیٹروجن کا بڑا ذخیرہ
ہوتا ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تمام نمکی اجزائے غذا اپنی غذا
بہ ہضم میں رہ جاتے ہیں اور فضلے کے ساتھ نکلتے ہیں چنانچہ فضلے
میں غذا کی نسبت یہ دونوں چیزیں زیادہ ہوتی ہیں با امتحان معلوم ہوا ہے

کہ علف میں کاربن اور اجزائے ملحی (۶) اور ایک کی نسبت رکھتے ہیں
مگر گھوڑے کی لید میں ان دونوں میں دو اور ایک کی نسبت ہے
یعنی لید میں اجزائے ملحی بدارج زیادہ ہیں مویشی کی غذا وزن میں
بہت زیادہ ہوتی ہے اس واسطے اُس کے فضلے میں اس قدر
نیٹروجن اور ملحیات نہیں ہوتے جس قدر آدمی کے فضلے میں خصوصاً
اگر مویشی کا پیشاب گوبر کے ساتھ نہ ملا لیا جائے اور کاشتکار اسکو عمداً
ضایع ہو جانے دے تو قوت اور بھی گھٹ جاتی ہے علاوہ اس کے
چھوٹے جانوروں کے فضلے میں بھی بہ نسبت جوان جانوروں کے
نیٹروجن کم ہوتی ہے کیونکہ جانور جب تک جوان نہیں ہوتا اور بدن
اُس کا نمو میں ہوتا ہے اُس وقت تک بہت سی نیٹروجن گیس اُسکے
گوشت اور عضلات اور خون وغیرہ کے بنانے میں صرف ہوتی رہتی ہے
فضلے کے ساتھ نکلنے نہیں پاتی اس واسطے جوان جانورون کی
کھاد زیادہ ترکیب کے واسطے فائدہ مند ہوتی ہے۔
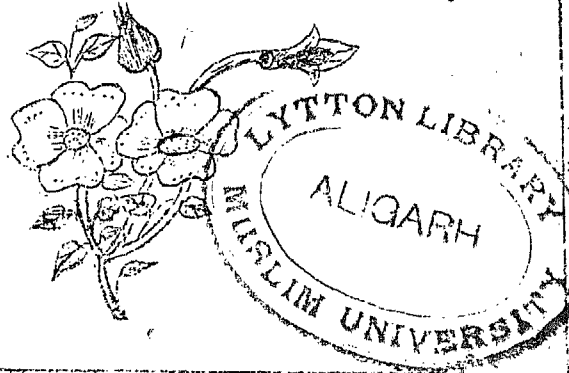
اس ملک میں ایک درخت خودرو پیدا ہوتا ہے جسے لوگ کیتکی کہتے ہیں
کیونکہ صورت میں یہ درخت کیتکی کے درخت سے مشابہت رکھتا ہے
انگریزی زبان میں اسے الیو یعنی الیوا بولتے ہیں ملک امریکا
میں اس کی پیدایش بہت ہے اور ہندوستان میں بھی جا بجا
ہوتا ہے مگر خودرو کہیں اس کی کھیتی نہیں ہوتی اور وہاں ہاتھی
چنگھاڑ کے نام سے مشہور ہے پتے اس کے کیتکی اور کیوڑے
کے پتوں سے بہت مشابہ ہیں اور بہت کارآمد ہیں مثلاً اس کے
ریشہ کی رسیاں نہایت مضبوط اور استوار بٹی جاتی ہیں اور
کاغذ بنانے کے بھی کام آتا ہے سرکاری محابس میں سوائے
رسی کے کپڑا بھی اس کے ریشے سے بنا جاتا ہے - جنوبی امریکا
میں جہاں اس درخت کی بڑی کھیتی ہوتی ہے لوگ اس سے
ایک قسم کا عرق نکالتے ہیں جو خواص میں قریب قریب سیندھی کے

ہے اس درخت کا قاعدہ یہ ہے کہ آٹھ دس برس کے عرصہ
میں جب یہ اپنے شباب کو پہنچتا ہے اُس وقت اُس کی جڑ کے
اندر سے کئی گز کا ایک موسلا پھوٹتا ہے اُس میں پھول بھی لگتا ہے
امریکا کے کاشتکار تاک میں رہتے ہیں موسلا ابھرنے نہیں پاتا کہ وہ
اُس کے سر کو چھری سے تراش کر اندر سے خولدار کر دیتے ہیں اس جوف
میں عرق اس قدر جمع ہونا شروع ہوتا ہے کہ دن میں کئی مرتبہ اُسے
خالی کرنے کی نوبت آتی ہے اگر درخت زور دار ہوا تو دو تین مہینے
تک روزانہ پانچ چھ سیر بلکہ زیادہ عرق دیتا ہے یہ عرق اگر تازہ پیا جائے
تو شیرین اور خوشگوار اور سکر سے خالی ہوتا ہے مگر دھوپ کھانے سے
اس میں غلیان آجاتا ہے اور سکر پیدا کر لاتا ہے اور ایک قسم کی بو بھی
دینے لگتا ہے جسے لوگ گوشت کی بو سے مشابہ بتاتے ہیں اگرچہ
امریکا میں ہزارہا من عرق نکالا جاتا ہے اور سیندھی بنائی جاتی ہے
بلکہ بھٹی میں کھینچکر شراب بھی اس کی نکالی جاتی ہے مگر آجتک کسی نے
اس عرق سے شکر بنانے کا قصد نہیں کیا - بنگالے میں نیرہ یعنی
عرق کھجور کی ہزارہا من شکر تیار ہوتی بلکہ وہاں گنّے کی شکر کا بہت
کم رواج ہے مگر افسوس ہے کہ ملک دکن میں اب تک سوائے سیندھی
بنانے کے نیرہ سے اور کوئی کام نہیں لیا جاتا سیندھی سے شکر بنانے

ترکیب اور اُس کا نفع وضرر انشاء اللہ آیندہ کسی پرچے میں بیان کیا جائے گا عجب نہیں کہ اگر محنت کیجائے تو مثل سیندھی کے اس درخت کے عرق سے بھی شکر بن سکے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک جزو اعظم اس عرق کا شکر ہے اگر ملکِ دکن میں کچھ صاحبِ ہمت وحوصلہ لوگ اس کام کی طرف متوجہ ہوں تو یقین ہے کہ نیرہ کی شکر کا رواج ہو جائے اور منفعتِ دنیا وعقبیٰ دونو اُن کو حاصل ہو اور عجب نہیں ہے کہ کیتکی کے عرق سے بھی شکر بنانے کی کوئی ایجاد نکل آئے ۔

خط موسومہ مسٹر بیک متعلق نیشنل کانگرس
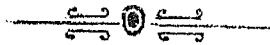
خبر انعقاد مجلس موسومہ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن بمخالفت انڈین نیشنل کانگرس سے نیاز مند کو نہایت مسرت ہوئی عرصۂ دراز سے میری رائے تھی کہ اس قسم کی کارروائی کا وقت آگیا ہے۔ جب مسٹر بک یہاں تشریف فرماتے تو مجھ سے اُن سے اس بارہ میں گفتگو آئی تھی اور میں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ایک کنسرویٹو مجلس کے قیام کی بڑی سخت ضرورت ہے جس میں تمام وہ باشندگان ملک (ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی) شریک ہوسکیں جو ان خود خواندہ محبانِ وطن کی مضرت انگیز کوششوں کو نظرِ یاس سے دیکھتے ہیں اور موجودہ نظام سیاسی میں انقلاب ہرگز پسند نہیں کرتے۔ بلکہ جو مقاصد اُس وقت ہمارے مدِ نظر تھے اُن کی وسعت محض مخالفت کانگرس سے متجاوز تھی کیونکہ مقصود اصلی یہ تھا کہ عام طور پر مذہبی و سیاسی امور میں کنسرویٹو خیالات کی اشاعت ہو اور جو نقایص اور خام خیالیاں ہندوستان میں جمہوری حکومت قایم ہونے سے ممکن ہیں اور جو خطرات پیدا ہونے والے ہیں اُن کا علانیہ اظہار کیا جائے اس تحریک کی تائید اور اُس کو جامۂ عمل پہنانا بجز آپ جیسے لائق رہنما کے اور کسی سے ممکن نہ تھا۔

میں اس مسئلہ میں دل سے آپ کی تائید کرتا ہوں اور مقاصد مجلس کے حصول میں جو خدمات میرے لائق سمجھی جائیں اس کی بجا آوری کے لئے حاضر ہوں اور امیدوار ہوں کہ میرا نام بھی آرا کین مجلس میں مندرج ہو اور اسی کے ساتھ ہی اپنے خیالات جو آپ کے اصول سے باستثنائے بعض امور بالکل متفق ہیں پیش خدمت کرتا ہوں۔

میرے نزدیک یہ امر اولیات میں داخل ہے کہ انگلستان کی حکومت ہندوستان میں اس غرض و نمایتہ سے خداوند عالم کی قدرت کاملہ نے قایم کی ہے کہ ہم لوگوں میں از سر نو علم اور تہذیب کو شیوع ہو اور اس واسطے ہم پر اپنے ہی فائدہ کی نظر سے ہر حال میں تائید قوت برطانیہ واجب ہے ہندوستان کے لئے وہ مبارک ایام کہ جب ہم خود اختیار حکومت کی ماتحتی میں رہتے ہوں ہم میں خود مختاری کا حوصلہ ہو اور ساتھ ہی اس کے اپنے ملک کی فوجی حفاظت کرنے پر بھی قادر ہوں اگرچہ ناممکن نہیں ہیں تاہم وہ دن اسقدر مدت طویل کا محتاج ہے کہ فی الحال اس کے خیال سے گریز ہی کرنا چاہئے اور یہ اچھی طرح یقین رکھنا چاہئے کہ اسی موجودہ حکومت کے زیر سایہ ہماری آیندہ کئی پشتیں گزریں گی۔ ہمارے خود خواندہ محبان وطن کو بھی یہ مسلم ہے کہ ہندوستان میں حکومت انگریزی قایم رکھنا چاہئے لیکن اسی زبان سے وہ گویا اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ قانونی انگریزی کارروائیاں اور سلطنت کی خیر خواہی دونوں ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں ان کا بیان ہے

کہ ہم طریقۂ حکومت کی تبدیلی چاہتے ہیں نہ کہ حاکم کی اور ہم اُن کے طرز حکومت پر معترض ہیں
نہ کہ حاکموں کی ذات پر لیکن وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم لوگ امریکہ یا انگلستان کی
سرزمین کے باشندے نہیں ہیں یہاں اگر عوام کی نظر میں حکومت کا ذرا سا بھی ضعف
ثابت ہو گیا گو وہ کیسا ہی خفیف کیوں نہ ہو تو اُس مفید اثر کو جو انگلستان کی
سلطنت سے ہندوستان کو پہنچ رہا ہے سخت صدمہ پہنچے گا ہندوستان میں اگر
ایرلینڈ کی سی صورت کسی جگہ پیش ہو جائے تو حکومت ایک دن بلکہ ایک ساعت
بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ ہندوستان کی حکومت کے واسطے کسی پارنلؔ کا وجود
اُسی قدر خطرناک ہو گا جس قدر غدر ۵۷ء کا معاملہ خطرناک تھا تاہم ہندوستان اور
انگلستان میں یہ فرق ہے اور ان دونوں ملکوں کی سیاسی حالت اس قسم کی واقع
ہوئی ہے کہ انگلستان نہ فقط معاملہ ایرلینڈ کو جھیل رہا ہے بلکہ پارنل اور اُس کے
ساتھیوں کو اپنی پارلیمنٹ میں بہ حیثیت نائبِ رعایا کے جگہ دے رکھی ہے اگر ہندوستان
میں کوئی گلیڈسٹون پیدا ہو تو حکومت کو اُس کا قلع و قمع بلا درنگ فوراً واجب ہو جائے
اور کوئی شخص اس کارروائی پر معترض نہ ہو گا حالانکہ انگلستان میں گلیڈسٹون ایک
نہایت معزز شخص ہے اور منجملہ نہایت اعلیٰ اور معززین زمانہ کے تسلیم کیا جاتا ہے
(اگرچہ اندنوں کسی قدر بدنام ہے) اگر آئین و قوانین ہندوستان بلا لحاظ خواہشات
و ضروریات اہل ملک بنائے جاتے ہوتے اور اگر ہمارے حکام بالادست اپنے
ذاتی فائدوں کی نظر سے ہمارے کل حقوق پامال کرتے ہوتے اور اگر انگلستان کی

له آئرلینڈ کا مشہور اور پرجوش مقرر۔

عظیم قوت فوجی اس کام میں صرف ہوتی کہ ہم کو پیس ڈالے اور ہمارا آٹا بنا کر اہل انگلستان
کا پیٹ بھرے تو اس صورت میں البتہ ہم کو شکایت کی گنجایش ہوتی لیکن فی الواقع
ایسی کارروائیاں کبھی نہیں ہوتی ہیں جب امپیریل گورنمنٹ کوئی جدید قانون
وضع کرنا چاہتی ہے تو اہالیانِ ملک کے خواہشات و ضروریات اس کاملیت
اور قابلِ اطمینان طور سے استصواب کرتی ہے کہ کسی پنچایتی حکومت سے جس کے ہمارے
برائے نام محبانِ وطن تمنا کرتے ہیں ناممکن ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اس وقت
بھی پورے حقوقِ پنچایتی حکومت کے حاصل ہیں بحذف و استثناء اُن خرابیوں
کے جو پنچایتی حکومت کو لازم ہیں ہاں یہ البتہ موقعِ شکایت ہو تو ہو کہ گورنمنٹ ہم کو
اجازت نہیں دیتی کہ ہم پولیٹیکل جوڑ توڑ کو اپنا پیشہ بناویں اور اس قسم کی کارسازیوں
کی خرابیاں اپنے اور اپنے ملک میں پھیلاویں۔ جس طریقہ سے ہمارے فرضی محبانِ
وطن اپنے شکایتوں کے دفتر کھولتے ہیں اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا
وہ لوگ تمام اپنے تمدنی نقائص کو دور کر چکے ہیں اور اس کام سے فراغت پاکر
اُنہیں ہاتھوں سے ایک ایسا زبردست پولیٹیکل قصرِ معلی تیار کرنا چاہتے ہیں جو جنابِ
عدن کی شان و شوکت کی خبر دے لیکن دیکھنا چاہئے کہ اس معاملہ میں اصلیت
کہاں تک ہے۔ اصل یہ ہے کہ گورنمنٹ نے جس کو آج ہم طریقہ حکومت سکھانے
کمر باندھے تیار ہوئے ہیں تھوڑا ہی زمانہ گزرا کہ ملکی لوگوں کے علی رغم انف اور باوجود
اُن کے سخت ممانعت کے محض ازراہِ انسانیت و حسنِ نیت بعض ایسے

دستوراتِ قدیم کو مٹایا اور موقوف کرایا جو اقوام ہند کے واسطے باعثِ شرم و تحقیر تھے
اور حال میں بھی جب گورنمنٹ نے کچھ اور دستورات بیہودہ کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ
دنیا سے حک کرنا چاہا تو ہمارے محبانِ وطن نے نہایت غصہ اور حقارت کیسا تھ
اُس کی مداخلت سے اختلاف کیا -

جن لوگوں کو مختلف اقوامِ ہند سے سابقہ پڑا ہے اور حکومت کی شان سے
واقف ہیں اُن سے پوچھنا چاہئے کہ ملک کی ترقی اور سرسبزی کے لحاظ سے
اگر ممبرانِ کونسل کو اختیار دیا جائے کہ جس وقت چاہیں کونسل کے جلسے میں کھڑے
ہو کر لفٹنٹ گورنر پنجاب یا گورنر بمبئی سے اُن کے فرائضِ منصبی کے متعلق کسی امر
میں بازپرس کریں تو کیا اثر پیدا کرے گا - وہ فوراً ظاہر کریں گے کہ اگر اس قسم کا حق
کبھی عطا کیا گیا تو جو عزت اور شوکت حکومتِ وقت کی عام رعایا کے دلوں میں
جانشین ہے اور جو استحکامِ سلطنت کے لئے زبردست پشتیبان ہے وہ ایک
آن کی آن میں رعایا کے دلوں سے محو ہو جائے گی مسلمانوں کو جن میں اب تک
حکومت کی بو کچھ نہ کچھ باقی ہے اور اُس کے لوازمات سے واقف ہیں اس خیال کی
قدر کرنا چاہئے کہ حکومت کو رعایا کے دلوں میں اپنی شوکت اور عظمت باقی رکھنے
کی کس قدر ضرورت ہے -

ننگوں لچوں کا کوئی شمار نہیں مگر وہ لوگ جو صاحبِ معاش ہیں اور جو
طائفۃ الملوکی کی حالت سے نقصان اُٹھانیکا احتمال رکھتے ہیں ایسے لوگوں کو

بخوبی سمجھنا چاہئے کہ حکومت کا زور اور قوت قایم رکھنا اور رعایا کے دلوں میں
اُس کا رعب اور دبدبہ باقی رکھنا کس قدر ضروری ہے درانحالیکہ ناسمجھ انگریزوں کا
منہ چڑانے والے جو آنکھیں بند کرکے شتر بے مہار کی طرح شورش و فتنہ کے میدان
میں تگاپو کرنے میں حکومت کے اُن ضروری اجزا کو بالکل مٹایا چاہتے ہیں میں
اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ انڈین نیشنل کانگرس
سے مخصوص مسلمانوں ہی کو خطرہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالمگیر خطرہ ہے جس میں
ہندو مسلمان سب شامل ہیں کانگرس سے جو کچھ خطرہ ہے وہ یہ نہیں ہے کہ
کانگرس کیا کرے گی بلکہ خطرہ زیادہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ دولت میں کس کس
شئے کو خاک میں ملائیگی ہم اہل مشرق صلح پسند ہیں ہماری ترقی سست ہے
اور ہماری ترقی تہذیب بھی آہستہ آہستہ ہوئی ہے یہ کیفیت ہماری آب و ہوا اور
طبیعت کا اقتضا ہے اور غالباً یہ سست ترقی ہمارے لئے مفید ہے کیونکہ ہم
اُس کے بدولت اُن سیاسی و تمدنی طوفانوں سے جو اکثر محرور المزاج قوموں پر آفت
لایا کئے ہیں محفوظ رہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ کانگرس کا کیا مقصد ہے فی الواقع وہ ایک انجمن ہے
جو اس اطمینان کی حالت کو بے چینی میں بدلنا چاہتا ہے اور محض تغیر کو
مقصود بالذات سمجھکر تغیر کا خواہاں ہے اُس کی تعلیم ہے کہ لوگ موجودہ حالت سے
بیزار ہوکر ایک موہوم فکر میں مبتلا ہوں جس کی حقیقت خود موئیدین کانگرس

اس وقت تک ٹھیک ٹھیک ذہن نشین نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے خود
خواندہ محبانِ وطن اس معاملہ میں محض اپنے انگریز حکمرانوں کی تقلید کرنا چاہتے
ہیں اور کچھ نہیں جس طرح بعض ہمارے شوقین جوان دُمدار کوٹ و پتلون
پہنکر جس کی سلائی بھی ٹھیک نہیں ہوتی اپنی نئی قطع پر نازاں ہوتے ہیں اور
اگر یورپین ملاقاتی لوگ اپنے جلسوں میں (باوجود تبدیل ہیئت) شریک نکریں
تو آزردہ خاطر ہوتے ہیں اُسی صورت سے ہمارے انگریزی نوخیز آئرش
ہوم رول اور انگریزی ریڈکل فرقہ کی بولیاں سیکھ کر طوطے کی طرح اس کو رٹنا شروع
کرتے ہیں اور اس پر تعجب کرتے ہیں کہ ان پر زور پر بھی اہل انگلستان کیوں ہم کو
بلا کر پارلیمنٹ میں جگہ نہیں دیتی تاکہ ہم وہاں بیٹھکر خوب حکومت موجودہ کا
خاک اُڑائیں اور اُس کی قوت کو توڑ کر یہاں بھی پارٹی گورنمنٹ کی شان پیدا کریں
میں بہت خوشی سے دیکھتا ہوں کہ عموماً ہمارے ہم ملت اس جامۂ
خس پوش میں دیدہ و دانستہ گرنے سے احتراز کرتے ہیں بعض جو بدراہ ہو کر ادھر
چلے ہیں وہ بوجہ نوجوانی اور ناتجربہ کاری کے معذور ہیں ان کی ضعیف الاعتقادی
کی یہ ایک کافی دلیل ہے کہ مخالفین کانگرس کے جوابات سننے پر بعوض دلائل و
براہین فقط الفاظ ناشایستہ سے جواب دینے پر اکتفا کرتے ہیں کہ جس سے ہر شخص
اندازہ کرسکتا ہے کہ اُن کے دعاوے کیسے کمزور اور ان کا خیال کیسا ضعیف ہے
کیونکہ دستور ہے کہ جس کے دلائل قوی نہیں ہوتے وہ ایسے ہی آلات

ناشایستہ سے کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہے۔

اس موقع پر میں اہل کانگریس کے طرز خیال کی ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ کانگرس والے اخبارات مسٹر کرافورڈ کمشنر پونہ کی ماخوذی پر کس عجلت سے اظہار مسرت کرنے لگے۔ انتہائی بد تہذیبی کے علاوہ یہ حرکت کس قدر نامعقول ہے کہ کوئی کسی بھلے آدمی کی مصیبت پر بغلیں بجائے اور شماتت کرے۔ مہذب لوگوں کا اخلاق اس کا متقاضی ہے کہ ایسے موقع پر زبان بند کرنی چاہیئے۔ ہم کو اُس گورنمنٹ کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہئے جو اپنے سرکاری عہدوں کی عزت و حرمت کے تحفظ کی غرض سے کسی ایک اعلیٰ عہدہ دار کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے پر مجبور ہو جائے جیسا مسٹر کرافورڈ کے ساتھ کرنا پڑا یہ معاملہ تہنیت کا نہیں ہے بلکہ تعزیت کا ہے مسٹر کرافورڈ پر ہنوز جرم ثابت نہیں ہوا اور ہر خیر خواہ ملک و حکومت کی یہی خواہش اور یہی دُعا ہوگی کہ وہ بَری ہو جائیں اگر کوئی مسٹر کرافورڈ کا سا لائق اور کارگزار عہدہ دار دس ہزار مرتبہ بھی گنہگار ٹھہرے تو بھی وہ ہزار مرتبہ اُن یا وہ گووں سے بہتر ہے جو امن و آمان ملک کو کانگرس کے دام میں آنکر برہم کیا چاہتے ہیں۔

جس گورنمنٹ کی ماتحتی میں ایک ایسا عظیم الشان ملک ہو جیسا کہ ہندوستان ہے جس کے باشندے متحد القوم نہیں ہیں بلکہ بہتیرے مختلف قوموں اور فرقوں پر

شامل ہیں اور بے انتہا مختلف اور باہم متبائن طبع اور اغراض اور حقوق رکھتے ہیں وہ گورنمنٹ بچوں کا کھیل نہیں ہے اور اُس کا انتظام مدرسہ کے ملاؤں اور کچہری کے منشیوں وانشاالہم سے نہیں ہوتا اس کشتی کی ملاحی کیواسطے بڑے تجربہ کار مدبر درکار ہیں جن کے پشتیبان ایسے مسلح اور تربیت یافتہ اور آزمودہ کار سپاہ ہوں جو ملک اور بادشاہ کے لئے جان دینے میں دریغ نہ کریں جو لوگ ہندوستان کے حاکموں کو طرز حکومت تعلیم کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کو چاہئے کہ زرہ بکتر پہنکر توپوں کے زبان آتش فشاں سے گفتگو کریں جس وقت خدانخواستہ روس کی سپاہ ہماری سرحد پر کھڑی ہوگی اور توپوں کی بھرمار سے دنیا تیرہ وتار کرے گی اس وقت کیا یہ نوخیز دلدادگان کانگرس ہماری جان ومال کی حفاظت میں اپنا سر دینے کو مستعد ہوں گے کیا یہ اُن کی یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی اُس وقت ہمارے کام آئے گی اور ہم کو اُس روز سیاہ کے دیکھنے سے بچائیگی جس سے خدا کے حکم سے اور انگلینڈ کی مدد سے ہم نے خلاصی پائی ہے

کانگرس کی تنقید بغیر اغراض کانگرس کے تنقید کے محال ہے۔ ہر فکر کی تحسین یا نفرین اُس کے نتائج اور آثار کو دیکھکر کیجاتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ میں اُس کے بانیوں کو نظر عزت سے دیکھتا ہوں کیونکہ وہ روشن دماغ لوگ ہیں اور جو کچھ اُن کی نظر میں مستحسن معلوم ہوتا ہے اُس کو وہ ازراہ خیر خواہی اگر حیطۂ عمل آور ہونے ہیں ملک میں ضرور کہوں گا کہ کوئی شخص کانگرس کے منظور شدہ تجویزات کو مثلاً قانون

اسلحہ مصارف فوج تسخیر برھما وغیرہ کو نہیں پڑہ سکتا بغیر اس کے کہ وہ اُن کی
تدابیر مُلکی کو بازیچۂ اطفال سمجھے اور تعجب کرے کہ ان مسائل سیاسی پر
ان کے ایسے پوچ خیالات ہیں جس کسی عہدہ دار سرکاری سے پوچھا جائے
بلکہ جس کسی شخص سے جو طریقۂ انتظامِ پولیس و قیامِ امن و امان سے واقف ہے
وہ یہی کہیگا کہ کانگرس کی رائے دربابِ قانونِ اسلحہ بالکل اُصول انتظام
کے خلاف ہے۔ اُس رائے کی اگر تعمیل ہو تو خود اُس قانون
سے جس قدر آزردگی لوگوں کے دلوں میں پہنچی ہو اُس سے
ہزار درجہ زیادہ آزردگی پھیلیگی۔ والنٹیر ہونیکی رائے بیشک خیرخواہی
کی دلیل ہے لیکن اس کارروائی میں اس قدر کھلی ہولی قباحتیں ہیں
جن کے دور ہونے میں سخت تامل ہے اگر ہمارے فصیح اللسان سپیکر جو کانگرس
میں کھڑے ہوکر جولانی طبع دکھلاتے ہیں تھوڑی دیر تک غور کریں اور بجائے انگریزی گورنمنٹ
کے اپنے تئیں حکمران تصور کریں اور اس بات کا فیصلہ کریں کہ اجنبی گورنمنٹ
کیونکر مفتوحہ ممالک کے ساتھ ایسے معاملوں میں برتاؤ کرسکتی ہے تو یہ مسئلہ
اہل کانگرس کو فوراً حل ہوجائے کسی شخص کی کارروائی کی اچھائی یا بُرائی
اُسیوقت اچھی طرح ذہن نشین ہوتی ہے جب جانچنے والا اپنے آپ کو اُسکی
جگہ تصور کرکے اُس کے قول وفعل کا اندازہ کرے اگر اس اُصول پر ہندوستان
کے حاکم اور محکوم دونوں عامل ہوں تو بہت سی پنچایتی مجلسوں اور نیشنل کانگرسوں

سے بہت زیادہ ملک کو سودمند ہو۔

کانگرس کی عقلمندی ظاہر کرنے کیلئے صرف اُس کے مطالبات کا بیان کردینا کافی ہے لفاظی سے معرا کرکے جو دیکھا جاتا ہے تو یہہ لوگ مفصلۂ ذیل اُمور کے خواہاں پائے جاتے ہیں

(۱) کونسل میں قومی وکلا کا مقرر ہونا اُن کو حکام سے باز پرس کا اختیار ملنا

(۲) رعایا کی منظوری سے ٹکس جاری ہونا۔

(۳) کل عہدوں پر ملکی لوگوں کو تقرر کا استحقاق ہونا۔

(۴) صلح یا جنگ باستصواب رائے اہل ملک۔

اُس کے سوا اور بھی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔لیکن اُن کی چھوٹی اور بڑی سب خواہشوں کے پردہ میں یہ اُصول مضمر ہے کہ گورنمنٹ کو مجبور کرکے اپنے مقاصد حاصل کئے جائیں اور یہ واضح ہے کہ جس چیز کا نام اُنھوں نے اپنی زبان میں باقاعدہ طریقہ سے مجبور کرنا رکھا ہے وہ معمولی زبان میں ترجمہ ہونے سے یہ معنی دیتا ہے کہ رعایا برانگیختہ کیجائے اور حکومت کو دبا کر اُس سے اپنا مطلب نکالا جائے

کونسل کی ترمیم کے بارہ میں میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ممکن ہے کہ گورنمنٹ ایک حدتک کونسل موجودہ حالت میں کچھ ترمیم کرے اور چند ارکین کا انتخاب اُس طور پر کرے جیسا کہ اہل کانگرس کا منشا ہے۔

لیکن بذات خاص مجھکو یقین نہیں ہے کہ موجودہ کونسل کی تبدیلی سے کچھ

فائدہ ہوگا میں نہیں جانتا کہ آیا ہندوستان میں انتخاب کا قاعدہ ٹھیک
طور سے کیونکر چل سکتا ہے کسی کانگرس والے نے کوئی طریقہ اس وقت تک
ایسا نہیں بتایا ہے جس پر اعتراض نہ وارد ہوتا ہو ہندوستانی اُمیدوار کا کونسل
وغیرہ میں جگہ پانیکی درخواست بغل میں مارے ہوئے محلہ محلہ اور گاؤں گاؤں
پھرنا اور اظہار لیاقت کیلئے جابجا اسپیچیں دینا اور اپنے فرضی موکلوں سے وعدہ
وعید کرنا کہ ہم کو کونسل کا رکن بناؤ دیکھو ہم تمہارے واسطے کیا کیا کرالاتے ہیں
وہلہ اول میں ایسا مضحکہ خیز مسخرہ پن معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت اُس کے
دوسرے پہلو پر غور کرنے کے واسطے مشکل سے قرار لیتی ہے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ بقول مہاراجہ صاحب بنارس اس طریقہ پر کلوار
اور موچی تو البتہ دستیاب ہوسکتے ہیں اور اُن کو اس جدید
طریقۂ انتخاب کا اچھا گورکھ دھندا مل جائیگا اور خوب بازاری لوگوں کو
دکھا دکھا کر اُس سے کھیلا کریں گے مگر یہ فرمائیے کہ ایسے ممبروں سے ملک کو کیا فائدہ
ہوگا یا کونسل کی اُن کی ذاتِ بابرکات سے کس قدر عزت افزائی ہوگی سچے
اور واقعی وکلائے قوم یہ لوگ تو ہو نہیں سکتے کیونکہ ہمارے بی اے اور ایم اے
ہرگز قوم کے نزدیک مقبول نہیں ہیں اور قوم کے وکیل نہیں ہوسکتے اگر فرض بھی
کرلیا جائے کہ ہندوستان کے لوگ ایک قوم ہیں۔ وہ صرف ایک خاص فرقہ
یعنی انگریزی تعلیم یافتہ فرقے کے سفیر ہوسکتے ہیں جو از روئے مردم شماری

اس بحرِ ذخار میں بمنزلہ ایک قطرہ ہیں۔ علاوہ بریں یہ لوگ اکثر غریب اور ادنیٰ طبقہ کے ہیں گو تیزی اور چالاکی اُن میں بہت ہو۔ یہ اس قسم کے لوگوں میں مشکل سے شریک ہو سکتے ہیں جن کے ساتھ معاشرت اور صحبت گرم کرنے کو مہاراجہ بنارس کے مرتبہ کے لوگ بے عزتی نہ سمجھیں ان ڈگری یافتہ لوگوں کے نسبت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر چھوٹی عمر سے امتحان دینے کی فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اپنے ملک کے حالات و عادات و رسوم سے بالکل اجنبی رہ جاتے ہیں بلکہ ان سے زیادہ واقفیت اُن یوروپین لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو یہاں آ کر مدت تک ہمارے ملک میں سرکاری مشاغل میں مصروف رہتے ہیں اور روز اُن کو ملکی لوگوں سے معاملہ پڑتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان حضرات کو انگلستان اور چین وغیرہ کے جغرافیہ اور حالات سے زیادہ واقفیت ہے بہ نسبت اپنے ملک کے میں افسوس سے کہتا ہوں کہ یہ الزام کسی قدر صحیح پایا جاتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ انگریزی تعلیم پائے ہوئے لوگ اپنے ملک کے غیر انگریزی داں لوگوں کو اپنے سے متنفر کر دیتے ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ شاید ہماری کوششوں نے اس وقت تک وہ طریقۂ تعلیم انگریزی کا نہیں ایجاد کیا ہے جس سے انگریزی تعلیم بھی ہو اور اصالت و قومیت بھی باقی رہے یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ اخلاق و تہذیب کی بھی تعلیم ہو مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم کو کانگرس میں اسپیچیں دینے سے فرصت کہاں ہے کہ ہم قومی تعلیم کے مسئلہ کو حل کریں

لیکن اگر یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ انتخاب صحیح طور پر ہو اور وکلا بھی اچھے ملیں
ہم کو بجز اس کے کہ اور چند پیچیدہ سپیچیں سنیں یا فضول بحث مباحثہ میں کونسل کی اوقات
صرف ہو اور کیا فائدہ ہوگا اگر نا بیین رعایا کی جماعت چھوٹی ہو تو اُن کے وجود سے
کونسل کی حالت موجودہ میں کوئی فرق نہ ہوگا اور اگر یہ جماعت بڑی ہوئی تو اُس کی
مخالفانہ کارروائی سے سوائے شر کے کوئی خیر کی اُمید نہیں کیجا سکتی کیونکہ گورنمنٹ
کے ہاتھ پاؤں ضعیف ہو جائیں گے اور اگر مخالفوں کی جماعت نصف سے
زیادہ ہو تو پھر انگریزی گورنمنٹ کی حیثیت اس ملک کے ساتھ محض ایک حفاظتی
حیثیت کی رہ جائیگی اور جیسا کہ ایک حاکم قوم کو تابع ملک سے خراج وصول کرنیکا
اقتدار ہوتا ہے اُس قدر اقتدار بھی گورنمنٹ کو ہندوستان پر باقی نہ رہے گا۔

اگر مخالف پارٹی کے ساتھ بعض یوروپین ارکان بھی شریک ہو جائیں تو
بعوض سلجھنے کے معاملہ اور زیادہ اولجھاؤ میں پڑ جائے گا اور نتائج اس کے دور
دور تک پہنچیں گے۔ میں ملک کے مداخل کی مد کو ملکی لوگوں کے ہاتھ میں
دینے کے بارہ میں جب سے گورنمنٹ کو فاقہ دیتا ہمارے اختیار میں ہو جائے
اپنی رائے کو طول دینا نہیں چاہتا اگر ہمارے یونیورسٹیوں کی تیس برس کی
تعلیم سے آج تک ایک یا دو ایسے مالی اُمور کے ماہر پیدا ہوئے ہوتے جنھوں نے
سرکار کو آمدنی اور خرچ کے برابر کرنے کا کوئی ٹھیک طریقہ بتایا ہوتا تو البتہ ہم کو گنجایش
تھی کہ ہم سرکار سے درخواست کریں کہ آمدنی و خرچ کا انتظام ہماری صلاح سے

کیا جائے مگر افسوس ہے کہ یہاں زمانۂ حال میں اس وقت تک کوئی ٹوڈرمل پیدا نہیں ہوا۔ اہل کانگرس نے آج تک کوئی ثبوت نہیں پیش کیا ہے جس سے اُمید کی جائے کہ اگر ہم لوگوں کو موقع دیا جائے تو ہم آمد و خرچ کے متعلق موجودہ منتظمین سے بہتر انتظام کر سکیں گے۔

سول سروس کے مسئلہ پر بڑے زور شور سے بحث ہو چکی ہے اور اچھی طرح سے اُس کی چھان بین ہوئی ہے اور آخری فیصلہ اس وقت زیر ملاحظہ گورنمنٹ ہے فوجی اقتدارات کی نسبت کانگرس اپنے دلی اغراض صاف صاف پیش نہیں کرتی بلکہ دوسرے مقاصد و اغراض میں لپیٹ کر کہتی ہے۔ بہر حال اس بابت اُن کے حالات اس قدر وقعت نہیں رکھتے کہ اُن کی طرف کسی قسم کی توجہ کیجائے۔ یہ بات کہ گورنمنٹ قبل جنگ ہماری رائے لیلیا کرے کہ جنگ مناسب ہے یا نامناسب ایسی بات ہے کہ اسے صرف ہی بنگالی محب وطن جنکو انجمن صُلح کل کے مواعظ نقل کرکے مدرسہ کے بچوں سے اور وہ بھی بنگالی مدرسہ کے بچوں سے واہ واہ کی صدا سننا منظور ہو البتہ اپنی زبان سے نکال سکتے ہیں اور نکالتے ہوں گے۔ کوئی ذیشعور آدمی تو کاہیکو کبھی کہے گا یا اُس کی طرف التفات کرے گا۔

جس قدر کانگرس کے خیالات ہیں ان سب پر بہت مختصر طور پر نظر کردی گئی ہے کانگرس کے قاصد من جا بجا ملک میں گھوم رہے ہیں

اور اس قسم کی تعلیم دیتے ہیں جس سے موجودہ انتظامی حالت کی مخالفت میں برافروختگی پیدا ہو اور آئندہ کیلئے عجیب تہلکہ انگیز طوفان بے تمیزی کا بیج بو رہے ہیں اور اُن کے فضول اُمیدوں اور ناجائز خواہشوں کے پیدا کرنیسے لوگوں کے خیالات پریشان ہو رہے ہیں

اگر اس طوفانِ بدانجام کو روکنا ہے تو آپ کی پٹریاٹک ایسوسی ایشن کو نہایت مستعدی سے کام کرنا ہوگا اور آپ کا کام اپنے ہی ملک میں زیادہ ہے اور کام بھی جلدی اور مستعدی سے کرنیکا ہے آپنے جہاں ہندوستان کے اصلی حالات سے بذریعۂ تحریروں کے باشندگانِ انگلستان کو وقتاً فوقتاً مطلع کرنیکا ارادہ کیا ہے تو وہاں اسی کیساتھ آپ کی انجمن کو یہ بھی مناسب ہے کہ بذریعۂ اخبارات و تقاریر کے لوگوں کے چشمِ باطن سے اس پردہ کے اُٹھانے میں کوشش کرے جس سے اہل کانگرس اُن کو اندھا بنا رہے ہیں اور ہمارے فریب زدہ اہل ملک کو ایسے تیرہ غار میں گرنیسے بچائے جہاں سے اُن لوگوں کی کبھی رہائی نہ ہوگی جو اس سراب کے پیچھے دوڑے جاتے ہیں جس کو اہل کانگرس نے آزادی اور خود حکومتی کے نام سے نامزد کیا ہے۔

اس معاملہ میں یہ امر البتہ افسوسناک ہوا ہے کہ آپ کی بعض تقریروں سے لوگوں نے یہ مطلب اخذ کیا کہ گویا نیشنل کانگرس کے اغراض و مقاصد کے متعلق مسلمانوں اور ہندوؤں کو دو مخالف گروہ قرار دئے جاتے ہیں ہندیگان

اکر تاکہ آپ جیسے لایق اور تجربہ کار آدمی نے ملاحظہ نہ کیا ہو کہ کیا از روے واقعہ
اور کیا از روے تدبیر یہ خیال غلط بنیاد پر مبنی ہے اگر انصافاً دیکھا جائے تو
دونوں قوم کے اغراض متحد اور ناقابل تفریق ہیں
بے اطمینانی و بے چینی کی اشاعت جیسی کہ ایک قوم کیلئے مضر ہے
ویسی ہی دوسری قوم کیلئے بھی مضر ہے اور اس لئے دونوں کو مناسب ہے کہ
متحد ہو کر اور ایک جان دو قالب بنکر اس تحریک کی مخالفت میں عام صدا
بلند کریں جو چند خود غرض لوگوں نے قایم کی ہے اور اُن کے مقلد اور پیرو
اُس قبیل کے پیدا ہو گئے ہیں جو اپنے صایب راے اور لایق التفات ہونے پر فقط یہ
دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ وہ انگریزوں کی تقلید بہت کرتے ہیں اور انگلستان کے پرشور گروہ
کے ہتکھنڈے اُنھوں نے سیکھ لئے ہیں اور ان کی یہاں مشق کرنا چاہتے ہیں
اور بعض اہل یورپ کے شل تغیرات و تبدلات کے ہر دم ہوس ظاہر کرتے ہیں
آپ کا کام یہ ہے کہ خلایق کے طبایع کو اس طرح کی تعلیم دیجئے کہ جس سے غلامانہ
نہیں بلکہ مردانہ طور پر گورنمنٹ سے اتحاد و ہمدردی پیدا ہو اور رہنے چلنے
ملک کا جہاں اس قدر مختلف قوموں اور مذہبوں کا مجمع ہے درست انتظام
کرنے میں جو آفتیں گورنمنٹ کو پیش آتی ہیں اُنکو لوگ سمجھیں اور اُس کی قدر کرنی
سکھا و یقین ہے کہ اگر بعوض اس کے کہ ہم گورنمنٹ کے ہر فعل کو سوے ظن اور
بدگمانی سے دیکھا کریں جیسا کہ اہل کانگرس کی تعلیم ہے ہم اچھے فعل کو اچھا

سمجھا کریں اور گورنمنٹ کی حسنِ نیت کو حسن نیت سمجھا کریں تو جس طور پر ہم ترقی کر رہے ہیں اُس کی رفتار دس گونہ زیادہ ہو جائے۔

اگر ہمارے نوخیز انگریزی تعلیم یافتہ اظہار لیاقت کیلئے کسی موقع کی جستجو کرتے ہیں تو آپ کا اور آپ کی ایسوسی ایشن کا کام ہوگا کہ اُن کو راہِ مستقیم کی ہدایت کریں تاکہ وہ اُن کاموں کی طرف متوجہ ہوں جو اُن کے اور اُن کے ملک کے لئے مفید ہیں ابھی بہت سے میدان خالی ہیں جس میں حب الوطنی اپنا جوہر دکھا سکتی ہے بہت سے ضروری تمدنی اور تجارتی مسایل اصلاح طلب اور قابل ترمیم پڑے ہوئے ہیں جس پر ہمارے نوجوانانِ قوم توجہ اور طبع آزمائی کر سکتے ہیں اور اُس سے مفید نتائج نکال سکتے ہیں اُس قوم کو معطل بیٹھنا کب روا ہے جسکو ابھی ایسے مرحلے طے کرنے باقی ہیں جیسے قومی تعلیم کا قایم کرنا۔ اخلاقی اور مذہبی تعلیم مدرسوں میں جاری کرنا قدیم دستکاریوں کی از سرنو ترقی اور اُن کے سوا دوسری بہت سی باتیں جن میں غیر قوم کی گورنمنٹ خود پیشقدمی نہیں کر سکتی لیکن اگر ان تحریکات میں خود ہمارے اہلِ وطن اپنی پوری قوت صرف کریں تو یقیناً نہایت قیمتی مدد دے سکتے ہیں۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے اس خدمت کو اپنے ذمہ لیا ہے جس قدر سچے بہی خواہِ ملک ہیں کیا ہندوستانی اور کیا انگریز سب آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونگے جو لوگ انگلستان اور ہندوستان کے دشمنوں کو دشمن سمجھتے

ہیں اور جو اُس قوم کو اپنا عدو جانتے ہیں جنکی زبان پر لفظ آزادی اور ہر دم
جاری ہیں اور دل میں بغاوت اور لوٹ مار کو ایمان بنائے ہوئے ہیں وہ آپکے
شریک ہوں گے آپ کے معاون کل روسا اور سرداران ملک اور اُن کے
وزرا و اعیان ریاست اور تمام مذہبی جماعتیں ہوں گی ۔

ہمارے بڑے زمیندار اور خاندانی بزرگوار جو اپنی خاندانی عزت کو عزیز
رکھتے ہیں اور کل وہ لوگ جن کو طائفۂ الملاو کی سے نقصان کا ڈر ہے سب کے
سب آپ کے ساتھ ہوں گے اور نہ آپ کو سرمایہ کی کچھ کمی ہو گی کیونکہ جو
اپنی بہبودی کے لئے آپ کے گرد جمع ہوں گے وہ اپنے پاس سے صرف زر
کیلئے بھی حاضر ہوں گے بلکہ وقت پر اپنے ملک اور شاہنشاہ کیواسطے اپنی
جانوں سے بھی دریغ نہ کریں گے ۔ اس خط کی طوالت کی معافی چاہتا ہوں

خطبہ افتتاحی

جو اجلاس چہاردہم محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس میں بمقام رامپور ۱۹۰۰ء میں پڑھا گیا

حضرات! آپ پر بخوبی روشن ہے کہ اس سالانہ جلسہ میں تین بڑی غرضیں ملحوظ رکھی گئیں ہیں اول غرض یہ ہے کہ مختلف مقاموں کے تربیت یافتہ مسلمان سال میں ایک بار ایک جا پر مجتمع ہوں اور یکجائی کے زمانہ میں روزانہ ملاقات و اختلاط سے باہمی ربط و محبت زیادہ ہو قومی مصالح و اغراض کی نسبت ایک دوسرے کی رائے پر مطلع ہوں اور اُن کے حصول کے لئے بالاتفاق سعی و کوشش کرنیکا مادہ قوم میں پیدا ہو۔

دوسری غرض یہ ہے کہ مختلف اضلاع کے لوگ اپنی مقامی ضرورتوں کو ایک دوسرے پر ظاہر کرسکیں اور مقامی تعلیم کی نسبت باہمی مشورہ سے نئی نئی تدبیریں اور نئی تجویزیں اختراع کرسکیں۔

تیسری اور سب میں عمدہ غرض جو گویا اصل علتِ غائی اس جلسہ کی ہے وہ یہ ہے کہ سرداران و بزرگانِ قوم کو موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی قوم کی صلاح و فلاح خصوصاً اُن کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی نسبت جس پر ہر قسم کی صلاح و فلاح کا

دارومدار ہے بالاتفاق سعی وکوشش کرسکیں اور بہ غلبہ آراء تجاویز وتدابیر قرار دیسکیں خصوصاً مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے استحکام واصلاح وترقی کی جانب متوجہ ہوں جہاں بنیاد اس قومی کام کی عمدہ اور مسلم اصول پر ڈالی جاچکی ہے اور ایک درجہ تک کامیابی بھی حاصل ہوچکی ہے۔

سید صاحب مرحوم کی حیات میں جو اس کانفرنس کے اصل بانی تھے اس کے پانچ اجلاس علیگڈھ میں ہوئے اور پانچ اجلاس دوسرے مختلف مقاموں میں یعنی لکھنؤ۔ لاہور۔ الہ آباد۔ دہلی۔ شاہجہانپور اور میرٹھ میں ۱۸۹۸ء خالی گیا کہیں اجلاس نہیں ہوا۔ سید صاحب کی وفات کے بعد نواب محسن الملک بہادر کی خاص کوششوں سے ۱۸۹۸ء کا اجلاس لاہور میں اور ۱۸۹۹ء یعنی سال گذشتہ کا اجلاس کلکتہ میں ہوا اور دونوں اجلاس نہایت کامیابی کے ساتھ انجام پائے۔

۱۸۸۸ء تک کانفرنس ایک مجمع محض اصلاح ومشورہ کے واسطے تھا کوئی عملی کارروائی اُس کے ذمہ نہ تھی ۱۸۸۹ء سے یہ نقص مٹ گیا اور عملی کارروائی کی بنا لاہور کے جلسہ میں اس تجویز کی منظوری سے ڈالی گئی کہ مختلف شہروں میں کمیٹیاں قائم ہوں اور اُن کا یہ کام ہو کہ وہ غریب طلبہ کی مدد کیواسطے چندہ جمع کریں اس مختصر تاریخی تذکرہ کے بعد کانفرنس کے مقاصد کی طرف میں آپ کی گراں بہا توجہ کا خواستگار ہوں۔

غرض اول و دوم کی نسبت اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ ایک وقت وہ
تھا کہ فقط میلوں ٹھیلوں میں لوگ جمع ہوا کرتے تھے اور اکثر وقت اُن کا لغویات
میں صرف ہوا کرتا تھا۔ کبھی بازاروں کی سیر دکانوں کی دیکھ بھال۔ کبھی ناچ
رنگ میں محویت کبھی گھوڑ دوڑ کا تماشہ تھا۔ کسی طرف بندر یا ریچھ کا ناچ کسی طرف
بھانمتی کا کھیل یا بازیگروں کے کرتب نظر آتے تھے تماشائیوں کا روپیہ پیسہ بہت
صرف ہوتا تھا دل لگی بہت ہوتی تھی اور اندرونی تجارت کو ترقی ہوتی تھی
مگر کوئی اس قسم کا جلسہ کہیں مقرر نہ تھا جہاں وقتاً فوقتاً سر آوردہ لوگ جمع ہوں
قومی رفاہ کا کام قومی اصلاح کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی اور نہ اس قماش کے لوگ
اس قدر بُعد مسافت سے کہیں جمع ہوتے تھے جس طرح کے بزرگوار لوگ آج اس
مجمع میں تشریف رکھتے ہیں یہ مرحوم و مغفور سر سید احمد خاں اور اُن کے رفیقوں
کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ چودہ پندرہ سال سے ہر سال کسی نہ کسی بڑے مقام
میں تمام ہندوستان کے منتخب افراد جمع ہوتے ہیں بہتیرے نادیدہ دوستوں کے
ارمان پورے ہوتے ہیں ایک دوسرے کی ملاقات سے خوشی حاصل کرتے ہیں
باہمی ربط و اتفاق کا سلسلہ مضبوط ہوتا ہے زیادہ تر تعلیم کے مسئلہ پر گفتگو ہوتی ہے
ہر شخص اپنے بچوں کی یا اپنے قصبہ کے بچوں کی تعلیمی مشکلات کو اپنے دوستوں
ملاقاتیوں سے بیان کرتا ہے اور کارآمد صلاحیں اور مشورے حاصل کرتا ہے
جس سے دور یا نزدیک کچھ نہ کچھ نتیجہ نکل ہی آتا ہے ملاحظہ کر لیجئے کہ اس وقت

یہاں کتنے ہی افراد ہر صنف و درجہ کے موجود ہیں جن کا اس شہر میں وارد ہونا بغیر جلسۂ قومی کے نہایت ہی موہوم اور غیر متوقع تھا۔

سال گزشتہ کے جلسہ نے مشرقی بنگالہ کے مسلمانوں میں تعلیمی جوش زیادہ کر دیا اور مسلمانوں کے بہت سے عمدہ افراد میں جو ایک دوسرے سے ناواقف اور ناآشنا تھے اس جلسہ سے ملاقات کرائی اور ربط و اتحاد پیدا کر دیا۔

تیسری غرض اعلیٰ قسم کی اشاعت کی اس وقت علی گڈھ کالج سے متعلق ہے اور میرے نزدیک زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے یہی غرض سب میں عمدہ ہے اور اسی کے حصول میں ہم کو زیادہ تعجیل کی ضرورت ہے مقامی ضرورتوں کے رفع کرنے کیلئے ہر صوبہ اور ہر ضلع میں سرکار کی فیاضی سے مدارس ہر قسم کے موجود ہیں اگرچہ یہ ذرایع تعلیم رعایا کی مقامی کوششیں مقامی حد تک محدود ہیں اور سرکاری فیاضی ہماری قومی ضرورتوں تک ہرگز دسترس نہیں رکھ سکتی ہے بغیر اس کے کہ مسلمان بالاتفاق کوشش کریں کبھی کوئی ایسا قومی دار العلوم قایم نہیں ہو سکتا جہاں زمانہ کے موافق اعلیٰ تعلیم کے ذریعے مہیا کئے جائیں اور جس کا فیض تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر عام ہو

یوں کہنے کو تو تعلیم کے فوائد سے ہم سب واقف ہیں اور ایک بالکل حرف ناآشنا شخص بھی عالم کی عزت اور علم کی قدر کرتا ہے اور اپنی اولاد کا جاہل رہنے کی نسبت بلکہ پڑھ لینا بہتر سمجھتا ہے اور عموماً خواندہ لوگ تعلیم کے پیش پا افتادہ

وہ مسائل سے کم و بیش واقف ہیں یا اپنے آپ کو واقف سمجھتے ہیں تاہم اس قدر
کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ عام طور پر اور علی الاطراد اپنی اولاد کو دروازے پر میانجی
کے پاس بٹھا دینا یا اسکول میں نام لکھا دینا اُن کے ادائے حقوق کی حد تک کافی
ووافی سمجھا جاتا ہے اور ایک بڑی ذمہ داری سے اُس کا بار دوسروں پر ڈال کر
سبکدوشی حاصل ہو جاتی ہے مگر کلام اس میں ہے کہ آیا ہم فی الواقع تعلیم کی حقیقت
واقف ہیں اور اپنی اولاد کی تعلیم میں اُس واقفیت سے پورا کام لیکر اپنے فرائض
درست طور پر ادا کرتے ہیں اُصولِ قانون کا ایک کلیہ یہ ہے کہ کوئی مجرم عدم
واقفیت قانون فوجداری کا عذر پیش کرکے سزائے جرم سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا
یہ دراصل قانون قدرت کا تتبع ہے قانون قدرت سے بیخبر ہونا آدمی کو اُس کے
خلاف ورزی کی پاداش سے نہیں بچاتا جو آگ سے کھیلتا ہے وہ جل ہی جاتا ہے
کوئی حیلہ اور عذر کام نہیں آتا کیا ہم اپنی اولاد کی تعلیم میں بیخبری اور لاعلمی کا
حیلہ کرسکتے ہیں۔ بیشک لاعلمی اور بےخبری کا عذر ہم پیش کرسکتے ہیں مگر کیا یہ
عذر ہمارے کام بھی آتا ہے کیا اس سے ہماری اولاد کی حالت درست ہو جاتی
ہے اُن کی دنیا و آخرت سدھر جاتی ہے ہرگز نہیں بےخبری کا عذر کرکے
ہم کتنا ہی اپنا دل خوش کرلیں مگر بے تربیت رہنے کے نتائج ہماری اولاد کو بھگتنے
پس کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر شخص جو اپنی اولاد کے حقوق کو
تسلیم کرتا ہے اور اُن کی بھلائی چاہتا ہے اول بطور خود تحقیق کرلے کہ تعلیم

کس کا نام ہے اور کس قسم کی تعلیم کی ہم کو ضرورت ہے۔ کیونکہ زمانہ کے تغیرات
کے ساتھ تعلیم کے بھی اغراض اور طریقے بدلتے رہتے ہیں ایک وقت وہ تھا
کہ تکبندی اور قافیہ سنجی سے امرا کے درباروں میں رسائی ہوتی تھی اور روزی کا
ٹھکانا لگتا تھا یا خطاطی اور خوشنویسی کی قدر تھی لوگ قطعے لکھکر اپنا پیٹ پالتے
تھے ایک ایک قطعہ کی قیمت امرا سینکڑوں بلکہ ہزاروں تک دیتے تھے اب
نہ کوئی غزلوں و قصیدوں کو پوچھتا ہے نہ قطعوں کی قدر ہے ایک زمانہ میں
دفتر فارسی تھا۔ فارسی کی قدر تھی خط خطوط فارسی میں لکھے جاتے تھے چغتائی
سلاطین حکمران تھے صاحبانِ مذاق فارسی کے ساتھ ترکی بھی سیکھتے تھے اور
فارسی کی انشا پردازی میں بہت زور لگاتے تھے۔ علما جن کو شوق تھا وہ
عربی علوم سیکھتے تھے مدتوں طالب علمی کرتے تھے خیرآباد۔ سندیلہ۔ گوپامئو۔
بلگرام۔ بہار۔ وغیرہ قصبات اس زمانہ میں ایک طور سے یونیورسٹیوں کا
کام دیتے تھے دور دور سے طالب علم آتے تھے اور برسوں تحصیل علوم میں
مشغول رہتے تھے کہیں معقولات کا بحث و مباحثہ تھا کہیں منقولات کا
درس تھا کہیں علوم ادبیہ کا چرچا تھا کسی طرف متکلمین کا زور تھا اب وہ دنیا
ہی ہمارے لئے بالکل بدل گئی اب نہ غزل گوئی سے کام چلتا ہے نہ خوشنویسی
سے روٹی ملتی ہے ارسطو و شیخ ابو علی سینا کی طبعیات و تحریر بھی محقق
و طوسی کی ہیئت از کار رفتہ ہے خیام کا جبر و مقابلہ کام نہیں آتا جا برکی کیمیا کو

کوئی نہیں پوچھتا ابن رشد کے فلسفہ سے کسی کو بحث نہیں نہ فارابی کی حکمت
کسی کو کام ہے اب ان مباحث میں کوئی وقت صرف کرتا ہے تو فقط تاریخی
حیثیت سے ان پر نظر ڈالتا ہے اور بطور یادگار ان کو درج کتاب کرتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہم خواب غفلت میں ایک مدت سے پڑے سوتے ہیں
اور زمانہ ہمارے سر پر بیدار ہے ہم کو اور ہماری تمام قوم کو ایک مدت سے سکون
ہے اور زمین ہمارے قدموں کے تلے ہر وقت متحرک ہے ہمارے انحطاط
کی بنیاد اسی وقت سے مضبوط اور ہمارے صلاح و فلاح کی عمارت اسی زمانے
رو بخرابی ہے جب سے کہ ہم نے پارینہ علوم اور قدما کی تصانیف پر قناعت
کر کے طریقۂ تحقیق و ابداع و ایجاد و اختراع چھوڑ دیا بزرگوں کی عادات و اخلاق
ترک کئے کسب معیشت کی عادت نہ رہی دنیا کی تجارت جو ایک وقت ہمارے
ہاتھ میں تھی اس کو اپنی غفلت سے کھو بیٹھے زمانہ کے ساتھ نہ چلے دوسری
قومیں ہم سے منزلوں پیش قدمی کر گئیں اور ہم اپنی پرانی لکیر پیٹتے رہ گئے
نہ ہم میں راستی و راستبازی رہی نہ ہمت و مردانگی رہی نہ کوئی علم رہا نہ کوئی فن رہا
غرض ہم تمام ان صفات سے جن کی بدولت قوم رفعت و عزت و قوت
و اقتدار حاصل کرتی ہے ہم خالی و عاری ہو گئے اور زوال ہمارے لئے ایک
امر لازمی بن گیا جو کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ حکومت و سلطنت کے جانے سے ہماری
یہ حالت ہوئی اس کا خیال بے اصل اور اس کا قیاس قیاس مع الفارق ہے

حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے زوالِ علم واستیلائے ذمائم اخلاق زوالِ دولت کا سبب ہوا اور ان مصائب و نوائب کا بیج کل پرسوں کا نہیں بلکہ بہت کا بویا ہوا ہے مگر بعد خرابی بصرہ ہم کچھ اس خوابِ غفلت سے چونکے ہیں اور اپنے صلاح کار کی تدبیریں سوچ رہے ہیں جس کا یہ کانفرنس ایک نمونہ ہے۔
اب ہم کو کچھ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ دنیا کی ترقی میں ہم بھی کسی قدر حصہ و نصیب حاصل کریں کھوئی ہوئی دولتِ علمی کو پھر ڈھونڈیں ہمارے خوابِ غفلت کے زمانہ میں جو ترقیاں ہو گئی ہیں اُن سے ہم بھی متمتع ہوں اگرچہ ہم میں ایسے بھی بزرگوار ہیں جو اب بھی قدیم علوم ہی کو علوم سمجھتے ہیں اور علم میں ترقی ہونے کے قائل نہیں ہیں مگر یہ جہل مرکب عام نہیں ہے واقعات کے سخت و زبردست آزیانے نے عموماً یہ خیالِ خام ہمارے دلوں سے نکال دیا ہے اور اب ہم اس زمانہ کی ضرورتوں کے موافق عمل کرنے پر آمادہ ہو چلے ہیں اور یورپ کے جدید علوم و طریقۂ تمدن کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔
حضرات! غنیمت جانئے کہ جب ہماری حکومت پر ہمارے اپنے کرداروں سے زوال آیا اور دولت و مملکت جس کے سنبھالنے کی قوت ہم میں باقی نہ رہی تھی ہمارے قبضہ سے نکل گئی تو خداوند عالم نے ہمارے حال پر رحم فرمایا اور ہم کو مرہٹوں یا افغانوں کا مطیع نہ بنایا کسی اور وحشی یا جابر قوم کو ہم پر مسلط فرمایا ہم کو ایسی ایک صالح قوم کے حوالہ کیا جو علم و ہنر متانت

وفطانت کے اعتبار سے جدید دنیا کی دوسری قوموں میں سر برآوردہ اور
انصاف پسندی و آزادی میں مستثنیٰ اور پیش قدم ہے ہمارے لئے حاکموں نے
امن وامان قایم کیا جس کو ہم مدت سے بھول گئے تھے ضعیف کو قوی کے
ہاتھ سے بچایا ہر ذی حق کا حق تسلیم کیا اور ہمارے حفظ حقوق کے راستے علی قدر
طاقت بشری مضبوط کئے ساری راہیں نقل و حرکت کی صاف کر ڈالیں اور تمام
ولایات و معمورات دنیا کو جو ہم سے ہزاروں فرسنگ کے فاصلہ پر تھے ہمارے نزدیک
کر دیا اور ہمارے واسطے طی الارض کا مسئلہ حل کر دیا ہر مذہب و ملت کو آزاد
چھوڑ دیا نہ مندر پر محصول لگایا نہ مسجد پر ٹیکس باندھا نہ تقلید کو روکا نہ اجتہاد سے
تعرض کیا فقط روکا تو دل آزاری یا مداخلت بیجا کو روکا جو ایک حکیمانہ سلطنت کا
شعار ہے علوم کے دروازے ہمارے لئے کھول دئے اور تحصیل علوم کو آسان
کر دیا علوم بھی وہ علوم ہم تک پہنچائے جن کے آگے ارسطو و افلاطون و شیخ رئیس
و ابن ہیثم طفل مکتب ہیں اور صدیوں کے بعد ہم کو پھر از سر نو یہ بیش بہا سبق
پڑھایا کہ علم و فلسفہ مثل جمادات کے نہیں ہے کہ جس میں نمو و حرکت نہ ہو بلکہ انسان
کی فکر غیر متناہی ترقی کر سکتی ہے اور یہ ترقی سوائے ہماری اپنی کاہلی و پست ہمتی
اور تعصب اور جہل مرکب کے اور کسی حد سے محدود نہیں ہے اور نہ کوئی سد سکندری
اس کے آگے حائل ہے۔

اِن احسانوں پر بھی اگر ہم میں سے چند رعایا گاہ گاہ نارضامندی کا

صدا بلند کرتے ہیں یا اخباروں میں شکایتیں چھاپتے ہیں تو اس کا سبب معلوم
کرنا بہت آسان ہے جس کو ہر صاحبِ فکرِ سلیم ادنیٰ تامل سے خود سمجھ جائے گا
یعنی یہ کہ اگر ملک میں اس درجہ کا امن وامان نہ ہوتا اگر ہر زبردست اپنے
زیردستوں کو ستا سکتا اگر راجہ زمیندار رئیس ہمیشہ لڑا جھگڑا کرتے تو کسی فردِ بشر کو
بھی فرصت باریک بینی و عیب چینی کی نہ ملتی شکایتوں کا اصل سبب یہ ہے
کہ اس حکومت میں جو کوئی ظلم کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے کوئی مجرم اپنی شرافت
یا امارت کی ٹٹی کی آڑ میں پناہ نہیں لے سکتا مسلمان ہندو کو دبا نہیں سکتا۔
شیعہ سنی پر زیادتی نہیں کرسکتا نہ سنی شیعہ پر دست درازی کرنے پاتا ہے انسان کا
یہ ایک طبیعی مسئلہ ہے کہ جب یہ ذاتِ شریف اپنی نفسانی خواہشوں کو پورا
نہیں کرسکتے یا اُن کے ناجائز جلبِ منافع میں کوئی عائق یا مانع پیدا ہو جاتا
تو وہ ضرور دست پاچہ ہوتے ہیں اور اُن اسباب پر اپنی بھڑاس نکالتے ہیں
جن سے اُن کو ناکامی نصیب ہوئی اس کے علاوہ ہم کو اس حکومت میں آزادی
حاصل ہے ہم اپنے دل کے پھپھولے توڑ سکتے ہیں بھلا افغانستان میں تو کوئی [illegible]
کسی حکم پر اعتراض کرسکے یا اس میں سرکار کے خلاف کوئی آرٹیکل لکھے یا [illegible]
صحبتوں میں بھی کوئی کلمہ شکایت کا زبان پر لا سکے اور یہ جسارت ان کی [illegible]
قوم گوارا کرتی ہے مفتوح قوموں کا ذکر نہیں ہے مفتوح قوموں پر ان کی سیاست
اس سے بدرجہا سخت تھی۔ ہاں ہمارے ہندوستان میں انگلش [illegible]

اجازت مل جائے کہ ان لوگوں پر جن کو وہ اہل بدعت کہتے ہیں جب چاہیں
حد جاری کریں اگر اہل بدعت کو اختیار ہو کہ وہابیت کے جرم میں لوگوں کو
اپنی رائے کے موافق سزا دیا کریں اگر شیعہ سنیوں کی دل آزاری کے مجاز
کر دئے جائیں اور سنی شیعوں کے ستانے کے مختار بنا دئے جائیں اگر زمیندار
بلا خوف نیلام مالگزاری سرکاری ہضم کر جانے کا موقع پاتے رہیں اگر یار لوگ
مرضی کے موافق خدمات سرکاری آپس میں تقسیم کر سکیں اگر مہاجن یا ساہوکار
سے قرض لی ہوئی رقم زبردست لوگ ڈانٹ ڈپٹ کر ہضم کر جا سکیں تو
شاید البتہ خاص خاص فرقوں کو جن کی آواز پبلک کے کانوں تک پہنچ
سکتی ہے آسایش ملے گی اور وہ پھر زبانِ شکایت نہ کھولیں گے اصل یہ ہے
کہ شکایت و نارضامندی کی سچی بنیاد اور حقیقی علت جیسا کہ میں ابھی عرض
کر چکا ہوں یہ ہے کہ قانون نے زبردست اور زیردست کو مساوی کر دیا ہے
اور خودسرانہ زندگی کی بنیاد مٹا دی ہے بعض دیسی ریاستوں میں جہاں
قانون اکثر فقط توڑنے کے لئے بنا کرتا ہے اور صاحبِ اقتدار اور حاکم رئیس
لوگ جب چاہیں قانون سے اپنے آپ کو یا اپنے متوسلوں کو مستثنی کرا لے
سکتے ہیں یہ شکایت سننے میں نہیں آتی مگر وائے برحال اُن لوگوں کے جو
حاکم رئیس صاحبِ اقتدار نہیں ہیں وائے برحال غریب رعایا کے جو بے زبان
ہیں اور جن کی صدائے داد [illegible] حاکم وقت کے کانوں تک پہنچنے نہیں پاتی

حضرات! میں یہاں گورنمنٹ کی طرف سے وکیل بن کے نہیں آیا ہوں
میں فقط حرف حق منہ سے نکالنا چاہتا ہوں گو بفحوائے الحق مُرٌّ کلمہ حق کسی کو
تلخ ہی کیوں نہ معلوم ہو اور یہ حرف حق گورنمنٹ کی خیرخواہی سے نہیں کہتا بلکہ
اپنی اور اپنی قوم کی خیرخواہی سے کہتا ہوں اُن لوگوں کے ساتھ بالکل متفق الرائے
ہوں جو اگر کہتے نہیں تو دل ہی دل میں سمجھتے ہیں کہ غیر قوم کی اطاعت کرنا خوب
نہیں اپنی قوم کی حکومت بہتر ہے مگر اُس کے ساتھ ہی میں چاہتا ہوں اور آپ
سب حضرات چاہتے ہوں گے کہ ہمارا ملک پھلے اور پھولے امن و امان قائم رہے
عالم کی علمی ترقیوں میں ہم شریک ہو سکیں شخصی آزادی ہر فرد بشر کو حاصل رہے
تجارت کو ترقی ہو۔ زراعت میں توسیع ہو۔ آبادی بڑھے رعایا کو قحط سالی کے صدمے سے
بچانے کی فکریں ہوں امراض وبائی کی مقاومت کیجائے۔ سڑکیں صاف رہگذر
محفوظ و مامون رہیں۔ ملک کی دولت کیا بالائے سطح زمین اور کیا زیر سطح زمین ظاہر
کی جائے اور اُس سے ملک اور اہل ملک متمتع ہوں۔ غرض تمام برکات ایک مضبوط
و باقوت اور حکیمانہ حکومت کی ہم کو حاصل رہیں۔

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ وہ کونسی حکومت ہے جو ان برکات کا
سرچشمہ ہے اگر خدانخواستہ دفعۃً کل حاکمانِ وقت کا دست شفقت ملک پر سے
اُٹھ جائے تو آپ خوب خیال فرما سکتے ہیں کہ مآل کار کیا ہوگا ایک مدت تک
ملک مثل دیگ کے جوش کھایا کرے گا ہر قسم کا سوءِ عمل ہر طرح کی بدمعاشی ہر نوع کا

مفسدہ اہل کرا و پر آرے گا شہر ویران رعایا تباہ ہوتی رہے گی تاوقتیکہ کوئی جابر قوم باہر سے بخیالِ ترکتازی یا بفکر ملک گیری فوج کشی کرے اور ظالم و مظلوم زبردست زیردست دونوں کو یکساں اپنی تلواروں کے گھاٹ پانی پلائے نتیجہ ان سب کا یہ ہوگا کہ سوڈیڑھ سو برس کی کاوش سے جو ترقیاں بتدریج اس وقت تک ہوتی آئی ہیں سب ایک چشم زدن میں خاک ہو جائیں گی یہ فراغت یہ اسباب ترقی یہ مواضع تحصیل دولت یہ شخصی و مذہبی آزادی جواب حاصل ہے پھر کبھی ہم کو حاصل نہ ہوگی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر شایستہ گورنمنٹ میں رعایا کا حق نکتہ چینی مسلم گنا جاتا ہے اور ہم رعایائے ہندوستان بھی ہرگز اس حق سے محروم نہیں ہیں مگر گورنمنٹ کی تدابیر اور تجاویز کی نقادی دو طرح سے ہو سکتی ہے ایک مدعیانہ اور ایک نیازمندانہ۔ مدعیانہ نکتہ چینی جو ہر فعل کو گورنمنٹ کی بدنیتی پر محمول کرتی ہے اور آسمانی مصائب کو بھی حکومت کی طرف منسوب کرتی ہے کسی عاقل کے نزدیک جائز نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی ذی اور با اقتدار گورنمنٹ اس قسم کی نکتہ چینی کو رضامندی کی نگاہ سے دیکھ سکتی ہے یہ مادۂ فاسدہ مثل مادۂ امراضِ وبائی کے ہے جس کا قلع و قمع اول ہی سے واجب ہے تاکہ بڑھ کر ملک کو مصائب میں مبتلا نہ کرے اگر اس قسم کی مدعیانہ تحریر و تقریر جائز رکھی جائے اور یہ زہر ملک میں پھیلتا جائے تو اس کا فاسد اثر خود غریب رعایا ہی کے لئے قاتل نکلے گا حاکموں کا تو شاید بال بھی بیکا نہ ہوگا۔

باقی رہی نیاز مندانہ نکتہ چینی وہ اس عہدِ حکومت میں ہمارے حقوق قانونی میں داخل ہے اگر ہم چاہیں تو اُس سے ہر وقت فائدہ اُٹھا سکتے ہیں مگر تدابیر ملک داری میں صائب رائے دینا۔ ملک و رعیت کے نفع و نقصان کو درست طور پر سمجھنا بقول ایرانیان "خانہ خالہ نیست" اس کے واسطے تو علم اور تجربہ درکار ہے یہ وہ مسائل نہیں ہیں کہ ہر اسکول کالڑکا کھڑا ہو جائے اور ان تجاویز مملکت میں جس کو بڑے بڑے صاحب علم و تجربہ کار مدتوں غور و تامل کرکے جاری کرتے ہیں رائے زنی شروع کرے اور ہم سے توقع کیجائے کہ ہم بھی اُس کی روانی تقریر پر تالیاں بجائیں اور واہ واہ کی صدا بلند کریں۔

اول ہم کو لازم ہے کہ ہم علم حاصل کریں اور پرانی لکیر پیٹنا چھوڑ دیں اور وہ تدابیر اپنے لئے سوچیں جن سے ہم جدید علوم اور جدید طریقہ تمدن کو سمجھ سکیں اور اپنی ضرورتوں کے موافق اُن سے کام لے سکیں سیاسی معاملات اور انتظامی تدابیر کی نسبت رائے دینے کی قابلیت پیدا کریں حکومتِ وقت کی مشکلات کو سمجھیں اور ہمدردی و وفاداری کے ساتھ اُن پر نظر ڈالیں مختصر ایسی روش اختیار کریں کہ حکومت ہماری رائے کو وقعت کی نظر سے دیکھے اور ہم کو اُمورِ ملکی و مالی میں مشورہ دینے کا اہل سمجھے جو منصب ہم کو کسی وقت اور کسی صدی میں حاصل نہ تھا کوئی حکومت اُس کے اجزا کیسے ہی عاقل کیوں نہ ہوں عیب سے خالی نہیں کیونکہ انسان کی عقل بہر حالت محدود ہے۔ مگر جب حکومت کے ترقی و تنزل کا دار و مدار ایسے

مدبرین وزرا کی جماعت کثیر ہے جو علم و دانش و تجربہ سے آراستہ و پیراستہ ہیں اُن میں اُمید کیجا سکتی ہے کہ خطا کم ہو گی اور ہر کام غور و فکر و استقلال کے ساتھ کیا جاتا ہو گا ایسی حکومت کی تجاویز و تدابیر میں جو کوئی رائے زنی کرے اُس کو بھی ضرور ہے کہ غور و فکر کے ساتھ رائے قائم کرے اور علم و تجربہ سے کام لے سفیہانہ اعتراض اور خود غرضانہ رائے زنی کو کام میں نہ لائے ایک چھوٹی سی نظیر اس کی یہ ہے کہ "ہائیڈروفوبیا" یعنی دیوانے کتوں کے کاٹے ہوؤں کے علاج کے لئے جو شفاخانہ کھولا گیا ہے اُس پر ہندوستان کے بعض مقامی انجمنوں نے اعتراض کیا اور ایک عرضداشت ولایت سے دادابھائی نوروزجی کی طرف سے بھی اخبار میں شایع ہوئی اور بنائے اعتراض یہ ہے کہ اس علاج میں حیوانات پر بیرحمی کی جاتی ہے میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا مگر اس قدر پوچھنا بے موقع نہو گا کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں اُنھوں نے اپنے ملک کے بیلوں اور ٹٹوؤں اور گھوڑوں پر جو خود اُن کے ہی قوم کے لوگ روزانہ ظلم کرتے ہیں اُس کے دفعیہ کی کیا فکر کی ہے اور اُس کے روکنے کی کیا تدبیر سوچی ہے مسٹر دادابھائی نوروزجی کو تو انگلستان کی ایک خاص جماعت کی تائید حاصل کرنیکی ضرورت تھی مگر ہم لوگ یہاں ہندوستان میں کس منہ سے یہ اعتراض کرسکتے ہیں جو بالمرہ ہندو اور مسلمانوں کو اپنی بارکش مویشی پر ظلم کرتے دیکھتے ہیں۔

علومِ جدیدہ کی نسبت بھی بعض پرانے فیشن کے لوگ جو کبھی اپنے گھروں سے

باہر نہیں نکلتے ہیں لا انسلمہ کا کلمہ زبان پر لائیں گے مگر ہم کو اُن سے بحث نہیں ہے
میں یقین کرتا ہوں کہ اکثر وہ حضرات جن کو اس کانفرنس کے اغراض سے دلچسپی ہے
اس امر کو بطور اُصول موضوعہ و علوم متعارفہ مان لیں گے کہ اگر ہم مسلمانوں کو اپنی
قوم کی صلاح اپنی دولت کی ترقی بلکہ اپنے نام ونشان کا بقا مدنظر ہے اور ہم اپنے
آپ کو صفحۂ ہستی سے مثل حرفِ غلط محو کر دینا پسند نہیں کرتے ہیں تو ہم کو ضرور ہے
کہ ہم یورپ کی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم حاصل کریں آج کل بغیر علم موجودات
عالم کے کوئی کام دنیا کا پورا نہیں ہو سکتا صنعت۔ حرفت۔ تجارت۔ نوکری
طبابت۔ وکالت سپہ گری کسی فن میں بغیر جدید علوم کی مدد کے ہم ترقی نہیں
کر سکتے اور یہ علوم ہم کو بغیر انگریزی کی میانجی گری کے سر دست حاصل نہیں ہو سکتے
پس ہمارا فرض ہے کہ ہم انگریزی زبان کو اچھی طرح حاصل کریں تاکہ مغربی علوم کے
خزانہ کی کنجی ہمارے ہاتھ آئے۔

اس وقت پھر اس بحث کو چھیڑنا کہ موجودہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فائدہ
ہم کو ملسکتا ہے یا نہیں محض تحصیل حاصل ہے۔ بارہا کانفرنس کے جلسوں میں اور
اُس کے باہر بھی اس مسئلہ پر گفتگو ہو چکی ہے اور جو لوگ اس طریقۂ تعلیم کے بڑے
طرفدار ہیں وہ خود معترف ہیں کہ یونیورسٹیوں کی مجوزہ تعلیم بہت کچھ اصلاح
کے لائق ہے اور اس تعلیم سے اخلاق پر اور نفس انسانی کے اعلیٰ جذبات پر وہ اثر
نہیں پڑتا جو عمدہ تعلیم کا جزو اعظم ہے اور نہ خود السنۂ علوم مغربی پر سوائے ایک

سطحی اطلاع کے زیادہ عبور حاصل ہوتا ہے الّا ماشاء اللہ موجودہ تعلیم سے اس وقت تک
توکوئی بڑا عالم یا مدبر یا حکیم مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا اور نہ ہونے کی اُمید ہے۔ نہ سر
سالارجنگ مرحوم اور نہ سر سید احمد خاں مغفور اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے کیونکہ اس
تعلیم کا دار و مدار امتحانوں پر ہے اور امتحانوں کی بھرمار سے بالاضطرار نہ کہ بالاختیار بہت سے
منافذ علمی روشنی کے ہمارے لئے مسدود ہو جایا کرتے ہیں اور ایک بڑا نا قابلِ برداشت
عیب اُس تعلیم میں یہ ہے۔ کہ اپنے مذہبی عقائد و مسائل اور اپنی ملت کی مقدس
تاریخ سے ہمارے نوجوان گویا بالکل اجنبی رہ جاتے ہیں اگرچہ اسلام میں نہ کلیسہ ہے
نہ رہبانیت ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ انصافاً اس قسم کی حکومت سے
جیسی سلطنتِ برطانیہ ہے۔ ہم توقع نہیں کرسکتے کہ کسی خاص قوم یا فرقہ کے لئے
کسی مذہب یا ملت کو سرکاری طور پر سرکاری مدارس میں جاری کرے۔ دوسرے
تعلیمی اصلاحوں کی بھی کوئی قریب توقع نہیں ہے اور اگر بفرضنا اصلاح کی بھی جائے
تو کیا معلوم ہے کہ ہماری مرضی کے موافق ہی ہوگی ہم اپنی قومی ضرورتیں خود بہتر
جانتے ہیں۔ سرکار سے فقط اصلاح مربیانہ اور امدادِ فیاضانہ ملتی رہے تو کافی ہے۔

نفسِ انسانی مثل ایک لوح کے ہے پیدائش کے وقت اُس کے دیباچہ پر فقط
چند نقوش اُس کی قوم اور اُس کے آباو اجداد کے نقش کئے ہوئے موجود ہوتے ہیں
باقی لوح پر آدمی خود اپنے کردار رفتار و گفتار کا کارنامہ لکھتا ہے اور اس لوح میں
یہ خاصیت ہے کہ قبیح اعمال سے اس پر زنگ لگتا اور نیک افعال سے جلا ہوتی ہے

اور ہر دھبہ زنگ یا جلا کا مثل طوطیا کے سرائت کرتا ہے اور ہر فعل وہر عمل حسن ہو یا قبیح اپنی جنس کو قوت بخشتا ہے اور نفس میں اپنی ہمجنس استعداد کو ترقی دیتا ہے صداقت وحمیت۔ صداقت وحمیت کو بڑھاتی ہے اور نیک خوئی کی استعداد کو ترقی دیتی ہے دروغ گوئی اور بیحیائی دروغ گوئی اور بیحیائی کو زیادہ کرتی ہے اور زشتی وبدی کی قابلیت کو قوت بخشتی ہے تعلیم وتربیت کا یہ کام ہے کہ نفس کی اس خاصیت سے فائدہ اٹھائے اور طفولیت سے انسان میں نیکی ونکوئی کی استعداد پیدا کرنے کی کوشش کرے کیونکہ لوح جب بالکل زنگ آلود ہو گئی اس وقت معلم کے بنائے کچھ نہیں بنتی۔ اسیطرح سے وہ قوتیں نفس انسانی کی جن کو فہم وادراک سے تعلق ہے وہ بھی محتاج تربیت ہیں اور اُن میں بھی ترقی وانحطاط مشق ومزاولت سے وابستہ ہے اور یہی حال اُن ظاہری قوتوں کا ہے جو بدن سے علاقہ رکھتی ہیں پس تعلیم وہی درست ہے جو ان سب قوتوں کو زیر نظر رکھے اور سب کو اعتدال کے ساتھ ترقی دیتی رہے۔

یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی ہے اِلّا جب کہ تمام اسباب اُس کے جمع ہوں معلم علم واخلاق سے آراستہ ہوں صحبت درست ہو تلامذہ کم سنی سے ہاتھ میں لئے جائیں اور اُستاد اور نگران کار والدین سے زیادہ اُن کے حال پر متوجہ رہیں اور نہ فقط درس وتدریس کے اوقات میں بلکہ کھیل کود۔ مہلت وفرصت کے زمانہ میں بھی وہی اسباب مہیا کریں جن سے اِن تمام اغراض کے حاصل ہونے میں مدد ملے۔ اخلاق درست

ہوں۔ خود شناسی اور خدا شناسی کا مادہ پیدا ہو اوامر و نواہی عقلی و شرعی کی وقعت دل میں جاگزین ہو نفس کی سیاست اور نفسانی خواہشوں کی مقاومت کی قوت کو ترقی ہو ہمت زیادہ ہو حوصلہ بڑھے تحصیلِ کمال کی طرف طبیعت مائل ہو پلید خیالات ناپاک افعال نجس خطرات سے تنفر زیادہ ہو۔

بھلا آپ ہی فرمائیے کہ دس روپیہ کے میانجی اور بیس روپیہ کے بابو صاحب ان نکتوں کو کیا جانیں اور یہ باتیں کہاں سے لائیں۔

ہمارے لڑکوں کو نہ گھر کی صحبتیں مساعد نہ ہمسایہ معاون نہ مدارس پُراثر نہ مدرس باخبر۔ ہم اگر اپنی تربیت کی فکر آپ ہی نہ کریں تو کام ہمارا کیونکر نبے اور مقصود ہمارا کیونکر ہاتھ آئے؟

ایک صاحب بآوازِ بلند فرما رہے ہیں کہ اس عہد میں کسبِ معیشت بطریقِ مشروع ناممکن ہے اس واسطے متمول لوگوں سے کہو کہ خمس و زکوٰۃ نکالا کریں تاکہ ہم لوگوں کی پرورش ہو۔

اے بندۂ خدا اگر ہم کسبِ معیشت نہ کریں گے تو دولتمند کہاں سے پیدا ہوں گے اور رہی سہی دولت کیونکر باقی رہے گی اور اگر دست نگری اور دریوزہ گری کی حیا ہم میں نہ رہی تو حمیتِ قومی کہاں ٹھہر سکتی ہے اور وہ قوم کیونکر زندہ رہ سکتی ہے جس نے حیا و حمیت کو خیرباد کہدیا ہو۔ آفرین ہے ہمت مردانہ پر اہل ندوۃ العلما کی جنھوں نے اسی قسم کے اغراض حاصل کرنیکی کوشش شروع کی ہے اور آفرین ہے

اُن بزرگواروں کی فیاضی پر جنھوں نے دل و جان سے اس کام میں مدد دی ہے
ہمارے اغراض اُن کے اغراض متحد ہیں اور ہم اُن کی کوششوں کے ساتھ
پوری ہمدردی کرتے ہیں۔ اگر فرق ہے تو تھوڑا سا فرق ہے۔ دونوں کا ہدفِ مراد
اور منزلِ مقصود ایک ہی ہے فقط یہ بزرگوار ایک راستہ اختیار کرتے ہیں ہم دوسرے
راستہ سے اُسی منزل تک پہنچا چاہتے ہیں۔ خداوند عالم دونوں کو کامیاب کرے
اور دونوں کے مقاصدِ دلی بر لائے کسی کو کیا معلوم کہ زمانہ کی ضرورتوں کو کون
بہتر سمجھتا ہے اور کس کی تدبیر صائب اور مقتضائے وقت کے موافق ہے۔

اس سال عیسوی کے اوائل میں مجھے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تھا اور وہاں
میرے پرانے لایق و فایق دوست پرنسپل لا مارٹینیر کالج مسٹر سائکس کی عنایت و
مہمان نوازی سے کالج کی سیر کا موقع مِلا تھا کوٹھی کی وسعت عمارت کی شان و
شوکت و مضبوطی و استحکام اُس کے کمروں اور دالانوں کی تقسیم لڑکوں کے رہنے
سہنے کا انتظام اُستادوں کی بود و باش کا بندوبست، عملہ و بیوتات، باورچیخانہ
حوض۔ حمام۔ عبادت گاہ ایک سے ایک اعلیٰ اور عمدہ نظر آئے کالج کا صحن بہت
وسیع و پُر فضا ہے دونوں جانب کالج کی زمین دور تک چلی گئی ہے جس میں خوبصورت
خوبصورت درخت قرینہ سے نصب ہیں ایک طرف پھولوں کا باغ ہے۔
جدھر کالج کی زمین محدود ہے اُدھر تیرنے کی مشق کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا
تالاب بنا ہوا ہے اُس سے ہٹ کر گومتی ندی بہتی ہے۔ القصہ عمارت ایسی

وسیع اور باشوکت اور حوالی اس درجہ پر فضا و دلربا ہے کہ خود بخود انسان کا وہاں دل لگے اور جس کسی نے وہاں رہکر تعلیم پائی ہو تمام عمر اپنے مدرسہ کو فخر کے ساتھ یاد کرتا ہے۔

اسی وضع اور اسی نام کا ایک مدرسہ کلکتہ میں اور ایک فرانس میں موجود ہے اور تینوں عمارتوں کا بانی ایک ہی شخص جنرل کلاڈ مارٹن ہے جس نے نہ فقط اپنے خرچ سے یہ عمارتیں تعمیر کرا دیں بلکہ دوام کیلئے اُن کے اخراجات کا بندوبست بذریعہ وقف و وصیت چھوڑ گیا۔ لامارٹنیر کالج کے ذکر سے میری یہ غرض ہے کہ ہم کو دور جانا ضرور نہیں۔ ہمارے ہمسایہ ہی میں ایک نظیر اس کی موجود ہے کہ ایک ذاتِ واحد کس قدر پائندہ اور فائدہ مند خدمت اپنی قوم کی کرسکتا ہے۔ دوسری غرض میری یہ ہے کہ عمارت کی شان و شوکت حوالی مکان کی صفائی اور سہانا پن جو اس کالج میں دیکھا گیا اور جو اس سے بدرجہا زیادہ اکسفرڈ اور کیمبرج کے کالجوں میں دیکھا گیا ہے بے علت و بے سبب نہیں ہیں ایسی درسگاہوں میں جن کا اثر قوم پر ڈالنا مقصود ہے ایک مادہ مقناطیسی کا پیدا ہونا ضرور ہے جو اہلِ علم و طلبۂ علم کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس مادۂ مقناطیسی کے نسخہ میں حسنِ مقام اور حسنِ حوالی اور حسنِ عمارت جزوِ اعظم ہے دوسرا ایک بڑا جزو یہ ہے کہ اہلِ علم اور اہلِ تہذیب اور اہلِ مذاق کی صحبت جمع ہو تاکہ وہ مقام خود بخود طلبہ علم کا مرجع اور تمام عمدہ قومی جذبات کا مرکز بن جائے جس طرح کہ اسکندر اعظم کے خلفا میں سے بطلیموس پادشاہِ مصر کی فیاضی نے اسکندریہ کی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی اور ایک عظیم کتب خانہ جمع کیا اور سرمایہ فراوان اساتذہ

و تلامذہ کے وظیفہ کے لئے مہیا کر دیا اور اس دارالعلوم کو وہ فروغ دیا کہ زمانۂ قدیم میں اثینیہ کے انحطاط کے بعد علم و حکمت کا سب سے بڑا اور نام برآوردہ مرکز اسکندریہ ہی شمار کیا جاتا تھا۔

صرف و نحو معنی و بیان و بدیع، شعر شاعری فلسفہ و حکمت، ہیئت و ہندسہ طب، موسیقی، ان سب فنون کے پروفیسر و معلم وہاں موجود ہو گئے تھے خصوصاً فلسفہ و طب و ریاضیات کو یہاں بے انتہا ترقی ہوئی۔ جالینوس اسی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اقلیدس نے یہیں اپنے مقالات مدون کئے بطلیموس یہاں مدرس رہا اور یہیں کتاب المجسطی تصنیف کی۔ فلسفۂ اشراقی نے یہاں نئی رونق پائی اور آخر کو ایک تازہ مذہب فلسفی اسکندریہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جس کا اثر عرب و ایران کے فلسفی افکار پر بہت کچھ اب تک محسوس ہے۔ اکثر کے مقالات یہاں تدوین پائے غرض کم و بیش بارہ سو برس تک فیض اس دارالعلوم کا جاری رہا۔

حضرات! ھم رجال و نحن رجال ہم اگر ہمت کریں اور استقلال کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول میں سعی کریں تو کیا ایک ہمارے ہی نامۂ اعمال میں حرف ظفر و کامگاری تحریر نہیں ہوا ہے؟ کیا حرمان کے شایاں ایک ہم ہی قرار پائے ہیں؟ بڑی چیز سعی و کوشش ہے سعی و کوشش کے برکات خصوصاً سعی و کوشش جب خلوص نیت کے ساتھ توام ہو اور اغراض نفسانی اس میں شامل نہ ہوں حصول مطلوب سے بھی قدر و قیمت میں برتر و بالاتر ہے کیونکہ

حصول مطلوب کے بعد پھر نفس کو بالطبع سکون ہو جاتا ہے اور انسان کی روحانی ترقی کو سکون سے تنفر ہے اور ہمت و حوصلہ قناعت کا منافی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کاموں کیلئے مادۂ قابل ضرور ہے۔ قابلیت نہ ہو تو کوئی قوم کوئی کام دینی و دنیوی انجام نہیں دے سکتی ہے

عام ہے اس کے تو الطاف شہیدی سب پر	تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

حافظ فرماتے ہیں کہ

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست	ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

خود ہم میں قابلیت و استعداد درکار ہے ورنہ فیضان الٰہی ایک دریائے ناپیدا کنار ہے جس کے آب حیات سے ہر طالب صادق سیراب ہوتا ہے اور کوئی پیاسا محروم نہیں پھرتا۔

افسوس ہے کہ علی گڈھ کالج میں یہ تمام صفات جمع نہیں ہیں مگر روئے ہم رفتہ کچھ بوباس ان سب کی پائی جاتی ہے نہ کوئی کلاڈ مارٹن سید صاحب مرحوم کو ملا کہ قوم کے واسطے اس کا خزانہ خالی کر لیتے۔ نہ قوم نے ان کی ایسی مدد کی کہ وہ اپنے تمام تعلیمی خیالات اور منصوبوں کو پورا کرسکتے مگر اس میں شک نہیں کہ یہ سب منصوبے ان کے دل میں تھے اور خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کی روح پر رحمت کرے کہ ایک حد تک ان منصوبوں کو اس جاں نثار قوم نے پورا بھی کر دکھایا مگر مرحوم و مغفور کا حال ہمیشہ اس شعر کا مصداق رہا ہے

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے	بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آج علی گڈھ جاکر ملاحظہ کیجئے تو اس شعر کا مضمون آپ پر واضح ہوجائے گا۔ علیگڈھ کالج کے دو رخ ہیں ایک رخ تو اس کا کامیابی سے مالامال ہے طلبہ کی فراوانی، تعلیم کی خوبی، قومیت کا جوش، اُستادوں کی شفقت، حکام کی ہمدردی بہی خواہوں کا اجماع یہ تمام صفتیں موجود ہیں۔ دوسرے رخ پر نظر ڈالئے تو مسجد ادھوری میوزیم ناتمام کسی کی چھت نہیں پٹی۔ کہیں دیوار نہیں اٹھی ایک طلبہ کی بود و باش کا مکان جو دفع الوقت کے خیال سے بنا تھا اب تک اُسی ابتدائی حالت میں پڑا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کا سا شفیق اور لایق اُستاد جو مدرسہ کی خدمت میں دلدادہ اور پرجوش تھا ہم سے الگ ہوگیا اور ہمارے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہے کہ ہم سرکار سے پھر اُس کو واپس طلب کریں۔ چھوٹے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے ایک علیحدہ مکان بنانیکی تجویز منظور ہوچکی ہے مگر قسمت کہاں کہ مکان بنایا جائے مگر روئے ہم رفتہ جیسا کہ میں اوپر عرض کرچکا ہوں جو کچھ کہ سید صاحب چھوڑ گئے ہیں وہ بھی غنیمت اور بسا غنیمت ہے اور کسی مدرسہ و کالج میں نہ تو یہ طرز تعلیم ہے نہ صحبت ہے نہ اساتذہ و تلامذ میں اس قدر ہمدردی و اختلاط ہے نہ کہیں انگریزی کی تعلیمی عمدگی کے ساتھ مذہبی ارکان پر اس قدر زور دیا جاتا ہے۔

اگرچہ کالج کی عمر ابھی بہت کم ہے گویا زمانہ طفولیت ہی سمجھنا چاہئے مگر اس تھوڑی عمر میں وہ سخت اور ناگہانی مصیبتیں اُٹھا چکا ہے۔ اول تو سید صاحب

کی وفات اور اُن کی بعد کی نزاعیں اور اُس کی تھوڑی ہی مہلت کے اندر مسٹر بیک کا انتقال۔ وہ مسٹر بیک جن کی ہمدردی اور جانفشانی نے سید صاحب کو بھی بھلا دیا تھا اور جس نے سارا کاروبار کالج کے انتظام کا جسے سید صاحب لاوارث چھوڑ گئے تھے اپنے سر پر اٹھا لیا تھا وہ مسٹر بیک جو اپنی قلیل آمدنی میں سے اس اسلامی کالج کی برابر مدد کرتے رہے اور جنھوں نے ایک اسلامی کالج اور مسلمانوں کے قومی مصالح کی کمک و اعانت میں بے انتہا محنت و مشقت برداشت کرکے اپنی جانِ عزیز تلف کر دی مگر الحمد للہ کہ ان مصیبتوں کے وقت سید صاحب کے ایک قدیم دوست اور قوم کے ایک جید خیر خواہ نواب محسن الملک بہادر نے یہ بار اُٹھانا قبول کیا اور بڑے طوفانی دریا سے کالج کا بیڑا پار لگا دیا اور کالج کے انتظام میں کیا مالی اور کیا تعلیمی بے انتہا ترقی کرکے دکھا دیا کہ اب بھی ہم مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو سید صاحب کے کام اور سید صاحب کے نام کو قایم رکھنے کی لیاقت و قدرت رکھتے ہیں۔

مگر نواب محسن الملک بہادر جن کی دوستی کا مجھکو بھی فخر حاصل ہے مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں یہ عرض کروں کہ ان کی تدبیریں اور کوششیں بھی بے سود ہوتیں اگر مارین صاحب نے کالج سے علحدہ ہونیکا ارادہ فسخ نہ کیا ہوتا اور اپنا استعفا واپس نہ لیا ہوتا۔ حق یہ ہے کہ کالج کی موجودہ کامیابی میں دونوں صاحبوں کا حصہ مساوی ہے اور ہم پر اور ہماری قوم پر دونوں صاحبوں کا احسان برابر ہے۔

یہاں پر بے موقع نہ ہوگا کہ میں ایک مختصر سرگزشت کالج کی جو جناب سید صاحب مرحوم کی وفات کے زمانہ سے اس وقت تک کے حالات پر مشتمل ہو آپ کی خدمات میں عرض کروں تاکہ آپ کو موجودہ حالت پر اس مدرسہ کی کماحقہ آگاہی حاصل ہو اور آپ ہماری ضرورتوں کا پورا موازنہ کرسکیں اور خود بھی کمک و اعانت میں دریغ نہ کریں اور قوم اور دولتمندانِ قوم سے ہماری پُرزور و پُرتاثیر سفارش کرسکیں

ابتدائی کیفیت سے اس مدرسہ کی آپ سب حضرات آگاہ ہیں۔ آپ سب صاحب جانتے ہیں کہ سید صاحب مرحوم اور اُن کے اعوان و انصار نے کس قدر محنت کس قدر جانکاہی سے اس مدرسہ کی بنا ڈالی اور اس مدرسہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کی حالت کی اصلاح میں کوشش شروع کی۔

جب سے یہ مدرسہ قائم ہوا ۱۸۹۵ء میں طلباء کی تعداد سب سے زیادہ یعنی (۳۵۰) بورڈر یعنی مقیم طلبہ اور (۲۳۰) ڈے اسکالر یعنی باہر کے جملہ (۵۸۰) طلبہ تھے منجملہ اُن کے (۱۷۵) کالج میں اور (۴۰۸) اسکول میں تھے ۱۸۹۸ء میں سید صاحب کی وفات کے وقت صرف (۲۲۹) بورڈر اور (۹۴) ڈے اسکالر کل (۳۲۳) رہ گئے تھے مگر ۱۸۹۹ء میں پھر ترقی پاکر تعداد بورڈروں کی (۲۹۴) تک پہنچی اور ڈے اسکالروں کی (۹۸) تک جملہ (۴۹۲) جن میں سے (۱۸۰) کالج میں شریک ہیں اور (۳۱۲) اسکول کلاسوں میں تعلیم پاتے ہیں اور لا کلاس میں (۳۲) طالب علم ہیں اس طرح کل تعداد غرۂ دسمبر ۱۹۰۰ء کو (۵۲۴) تھی اگرچہ کل تعداد اب بھی ۱۸۹۵ء سے کم ہے مگر بورڈروں

کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے یہاں تک کہ بہ افسوس بیان کیا جاتا ہے کہ بوجہ عدم گنجایش بود و باش نئی درخواستیں مجبوری نامنظور کیجاتی ہیں۔

کالج کی مالی حالت بھی کسی قدر جناب سید صاحب کی وفات کے وقت خطرناک تھی قریب لاکھ روپیہ کے قرض کا بار تھا جس میں سے نقد رقم قرض خواہوں کو دینے کی پچاس ہزار سے زیادہ تھی۔ سید صاحب مغفور کے بعد ان کی یادگار قائم کرنے کیلئے ایک چندہ کھولا گیا جس کی آمدنی میں سے یہ رقم ادا کردی گئی اور اب ستر ہزار اس فنڈ میں نقد موجود ہیں علاوہ اس کے چودہ ہزار کالج اسٹاف کی تنخواہوں وغیرہ کے لئے بطور رزروفنڈ یعنی سرمایہ محفوظہ جمع ہیں۔

حضرات! مدرستہ العلوم علی گڈھ کی یہ کیفیت ہے جو اس وقت بالاجمال بیان کی گئی میں نے اپنی فہم ناقص اور اپنے ذاتی تجربوں کے موافق ایک اندازہ قوم کی تعلیمی ضرورتوں کا بھی آپ کی خدمات میں عرض کردیا اگر آپ کی رائے صائب میں بھی یہ ضرورتیں مسلم ہیں، اگر آپ بھی قبول فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں پر فرض عین اور عین فرض ہے کہ ہم اپنی اولاد میں زمانہ کے گوناگوں حوادثات اور وقت کی بوقلموں نیرنگیوں کی برداشت کی قوت پیدا کریں اگر آپ بھی اس ناچیز کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ میدان سعی میں پسپا ہونا نامردی اور فقط نفسانی تعصبات کی بنا پر ممکن الحصول برکتوں سے اپنے آپ کو محروم رکھنا جہالت اور اپنی افزایش دولت و علم و ثروت و جاہ میں جان نہ لڑانا

حماقت اور دست نگری اور دریوزہ گری پر قناعت کرنا بیحیائی ہے تو یقیناً
آپ اس امر کو بھی تسلیم فرمائیں گے کہ مدرسۃ العلوم علی گڈھ کی پوری اعانت کرنا
اور اُس کے حدود نفع رسانی کو وسعت دینا ہم مسلمانوں پر فرض ہے اگر اس فرض
کو اب بھی کوئی نہیں مانتا ہے اور اگر اب بھی کوئی اس مدرسہ کی فائدہ مندی میں
شک کرتا ہے۔ اگر کوئی اب بھی علوم جدید سے بے بہرہ رہنا اور اپنی پُرانی
لکیر پر چلے چلنا قوم کی بہتری کیلئے کافی سمجھتا ہے تو اُس سے کہئے کہ جاکر ان
اسلامی سلطنتوں کو دیکھ لے جو اس وقت تک انہیں خام خیالیوں میں مبتلا ہیں
الجزائر کو دیکھئے جہاں سے حرکت کر کے طارق اور موسیٰ بن نصیر نے اندلس کو
فتح کیا تھا تونس کو دیکھئے جو ایک وقت میں مسلمانوں کی حکومت کا بڑا رکن
رکین تھا اور جہاں کی جہاز رانی دنیا میں مشہور تھی۔ مراکش کا حال پوچھئے
جس کی یوسف بن تاشفین نے بنا ڈالی جو مرابطہ کا پہلا بادشاہ تھا اور جس کو
سلطان ابو یوسف عبد المومن کے پوتے نے تمام کیا اور شمالی افریقہ کا پایۂ تخت
قرار دیا۔ اب تمام الجزائر فرانس کے قبضہ میں ہے۔ تونس پر بھی نیم قبضہ فرانس کا ہے
اور قریب ہے کہ مراکش کا انجام بھی وہی ہو۔ اگرچہ اُس پر اہل اسپین کو بھی بہت
کچھ دعویٰ ہے وہی اسپین یا اندلس جس کو اسی ملک کے مسلمانوں نے ایک وقت فتح کیا تھا مصر سے اسوقت
تک ترکوں کی حکومت نکال دی گئی ہوتی اور طوائف الملوکی کی نوبت آ گئی ہوتی
اور تمام دولت برباد ہو گئی ہوتی اگر ہماری سرکار نے وہاں کا انتظام اپنے اختیار

میں نہ لے لیا ہوتا۔ ایران کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ انہیں پرانے خیالات اور جاہلانہ تعصبات سے وہاں کی ترقی رکی ہوئی ہے اور سارے امور کا دارومدار یورپ کی قوتوں پر ہے۔

خود ایران کی حیثیت اس زمانہ میں ہندوستانی ریاستوں سے کچھ زیادہ نہیں ہے بلکہ ہندوستانی ریاستیں زیادہ امن و اماں کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر رہی ہیں اور کم و بیش ترقی کرتی جاتی ہیں اس لئے حضرات آپ سے پھر عرض کرتا ہوں اور جب تک ممکن ہوگا عرض کرنے سے باز نہ رہوں گا کہ وقت ہاتھ سے نکلا جاتا ہے حالت قوم کی روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے ہمت مردانہ کیجئے اور قوم کا بیڑا پار لگا دیجئے اس وقت دل و جان سے اعانت کیجئے گا تو بہت مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور قوم کی اعانت اس وقت یہی ہے کہ اس کے افراد کی تعلیمی حالت درست کیجئے اور علوم جدیدہ کی برکتوں سے اُن کو بہرہ مند فرمائیے۔ قوم اور بزرگانِ قوم سے ہم جس اعانت کے خواستگار ہیں اُس کے دو درجے ہیں اور یہ درجے بمنزلۂ دو زینوں کے ہیں جن سے ہم قوم کو ضعف و اضمحلال کی پستی سے قوت و ابہت کی بلندی پر پہنچانے کی اُمید کرتے ہیں۔

ہم قوم سے اُمیدوار ہیں کہ اول تو مدرسۃ العلوم کے دوام کی فکر کرے تاکہ بنیاد اس کی مستحکم ہو جائے اور حوادث زمانہ سے بہ قدر طاقت بشری مامون

ومحفوظ کر دیا جائے اور اُس کے بعد اس قدر اور ہمت کرے کہ اسی مدرسہ کو وسعت دیکر قریب زمانہ میں ہم ایک یونیورسٹی (جس کو عرب آج کل مدرسہ کلیہ کہتے ہیں) مسلمانوں کیلئے قایم کرسکیں جس میں مثل قدیم مدارس کلیہ قرطبہ و بغداد و سمرقند کے اگر تمام اسلامی بلاد دنیا سے نہیں تو خیر تمام ہندوستان کے اقطاع و صوبہ جات کے طلبہ آنکر تحصیل علم کرسکیں اور جو رفتہ رفتہ ہند کی اسلامی دنیا کے علمی و اخلاقی جذبات وخیالات کا ایک مرکز عظیم بن جائے کیا عجب ہے کہ پھر اس مدرسہ کی بدولت ہمارے ہاں ایک نیا ابن رشد یا بو علی سینا پیدا ہو جو فلسفہ جدید کے شکوک کو حل کرتا رہے نئے متکلمین نئی قسم کے استدلالوں سے زمانۂ حال کے الحاد کو ساکت کریں۔ ہمارے طب میں نئی طبیعات و علم حیات و علم کیمیا و نباتات کی مدد سے ایک نیا ابوزکریا رازی یا نیا ابن زہر نئی نئی تحقیقیں کرے نئے نئے علاج نکالے۔ ایک نیا ابن موسیٰ نئے نئے حیل پیدا کرے نئے نئے آلات اختراع کرے۔ ایک نیا طوسی نئے نئے سیارے اور نادیدہ اقمار ہم کو دکھائے اور اُن کی گردش کے حدود بتائے۔ کیا میں جو عرض کر رہا ہوں اس کو کوئی خیال خام کہہ سکتا ہے؟ آپ ابھی سُن چکے ہیں کہ تعصب وجہالت و ناعاقبت اندیشی کی بدولت مغرب اقصیٰ و شمالی افریقہ کی اسلامی حکومتوں کی کیا حالت ہو رہی ہے مگر اب اس کے برعکس جاپان کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے۔ جاپان نے ان تعصبات اور از کار رفتہ خیالات کو ترک کرنے کی بدولت (۲۰) برس کے عرصہ میں کیا ترقی نہیں کی؟ جو قوم کہ نزدیک زمانہ میں مغربی

علوم و مغربی اقوام سے بالکل متنفر تھی اور یورپ کی سرآوردہ اقوام کے آگے کسی شمار و قطار میں نہ تھی، اب جدید علوم اور جدید خیالات سے فائدہ اٹھا کر مغربی سلطنتوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے اور قوت میں مغربی سلطنتوں کے ہم پلہ شمار کی جاتی ہے اُن کی تجارت، اُن کی صناعی، اُن کی علمی و تمدنی ترقی کسی سے کم نہیں ہے روز بروز ملک و قوم کی وقعت و عزت میں زیادتی ہوتی جاتی ہے علوم جدیدہ اُن کے ہاں علی العموم رائج ہیں اور اُن سے کام لیا جاتا ہے تعلیم ہر طرف شایع ہے یورپ کی جدید صنعت و حرفت کی ہر شاخ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اُسے اپنے مصرف میں لاتے ہیں دو ڈاکٹر جاپانی ایسے اپنے فن میں مخترع اور مجتہد اب موجود ہیں جن کا نام یورپ میں مشہور ہے اس نظیر سے صاف ظاہر ہے کہ ہم کو کبھی اپنی ترقی سے مایوس نہ ہونا چاہئیے۔ ایسی مایوسی گویا خداوند عالم کے رحم و کرم سے مایوسی ہے اور وہ فقط ناشکری ہی نہیں بلکہ نافرمانی ہے۔

یونیورسٹی کیلئے چند چیزیں لابدی ہیں۔ اول تو مکانات کی توسیع ضروری ہے دوسرے نفس تعلیم کے حدود کو بھی وسیع کرنا چاہئیے اس وقت علی گڈھ کالج میں منجملہ علوم نظری کے فقط فلسفہ و ریاضیات بڑے امتحانوں کیلئے کافی سمجھا گیا ہے یہ بجائے خود بھی ایک بڑا نقص ہے اور جب یونیورسٹی قایم کرنیکا خیال کیا جائے تو اُس وقت اور بھی زیادہ ضرور ہوگا کہ مختلف علوم کے درس کا سامان مہیا کیا جائے اور ہر علم کیلئے اُس کا ایسا ماہر مدرس مقرر ہو جس کے نام سے شایقین علم اُس کے درس میں

شریک ہونیکی آرزو کریں۔

تیسرے ایک جماعت ٹیوٹر لوگوں کی ضرور ہے جو مثل اکسفرڈ و کیمبرج کے طلبہ کے خانگی معلم و دوست و ناصح کا کام دیں ہر ایک فن کے واسطے ایک علیحدہ ٹیوٹر ضرور ہے

چوتھے آلات و ادوات علمیہ کا مہیا کرنا لازم ہے جس کے حدود میں کتابخانہ بھی شامل ہے ابتدا میں شاید سوائے علی گڈھ کالج کے کوئی دوسرا کالج اس یونیورسٹی سے متعلق نہ ہو مگر تجویز کی کامیابی پر یقین ہے کہ تعداد کالجوں کی بڑھتی جائیگی کیونکہ اس قسم کی تعلیم سے ہر صاحبِ عقل اپنی اولاد کو متمتع کرنا چاہے گا۔ علاوہ بریں ایک کالج کا ترقی کر کے یونیورسٹی بننا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں دور جانا کیا ضرور ہے خود ڈبلن یونیورسٹی جس میں میرے دوست مرحوم مولوی میر اولاد حسین ایک عمر مشرقی زبانوں کے پروفیسر رہے۔ اُس کی بنیاد فقط ایک کالج ہے قرطبہ اور بغداد کے مشہور و معروف مدارس کو بھی یہی فخر ایک زمانہ میں حاصل تھا۔

یورپ میں اس کی اور بھی نظیریں موجود ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب اس قسم کا کوئی درس گاہ ترقی کرتا ہے تو ایک حد سے گزرنیکے بعد خود بخود یونیورسٹی کی حیثیت پیدا کرتا ہے اور اس قدر ترقی کے اسباب مہیا کرنا بالکل قوم کے ہاتھ ہے اگر ہم ایسی ترقی کر دکھائیں تو ہرگز ہماری فیاض سرکار ہم کو سند یونیورسٹی عنایت کرنے میں دریغ نہ کرے گی۔ اب آپ خود خیال فرماسکتے ہیں کہ اس سب کا مایحتاج

مہیا کرنے کیلئے کس قدر زر کثیر درکار ہے مگر میں ایک دوسرے جلسہ میں اس کانفرنس کے جس کی میر مجلسی کی عزت مجھے دی گئی تھی عرض کر چکا ہوں کہ قوم کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر قوم چاہے تو ایک ہی وہلہ میں اس قدر سرمایہ جمع کر دے کہ دوام کیلئے یونیورسٹی کا خرچ نکل آئے۔ فقط ایک زبردست محرک درکار ہے جو قوم کو اس طرف متوجہ کرے اور اس سے کام لے بعض غیر قوم کے بزرگواروں نے جو ہماری کوششوں کو بنظر رضا و عنایت ملاحظہ فرماتے ہیں اور ہمارے ساتھ پوری ہمدردی کرتے ہیں اور ہماری تعلیمی ضرورتوں کو تسلیم کرتے ہیں اور جن کی رائے میرے نزدیک نہایت درجہ وقعت اور تعظیم کے شایاں ہے اس تجویز پر نکتہ چینی کی ہے کہ کسی خاص مذہب کی قید کے ساتھ کوئی یونیورسٹی قایم ہونا مفید نہ ہوگا۔ یونیورسٹی کا دائرہ افادہ وسیع ہونا چاہئے کسی ملت و مذہب کی خصوصیت نہ ہونی چاہئے ورنہ خیالات محدود اور تعصبات غالب ہو جائینگے جن سے بچنا ترقی علم کیلئے لازمی اور لابدی ہے میں اس اعتراض کو ایک حد تک تسلیم کرتا ہوں۔

سید صاحب مرحوم نے اسی لئے علی گڈھ کالج کا دروازہ ہر ملت و مذہب کے لئے کشادہ رکھا تھا اور اب بھی کشادہ ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ آیندہ کشادہ نہ رہے

میری ذاتی رائے ہمیشہ سے یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ جو ایک ملک کے رہنے والے ایک پادشاہ کی رعیت ایک قانون کے پابند ہیں اُن میں اتحاد و اتفاق

رہنا چاہیئے اور برادرانہ برتاؤ ہونا چاہئے گو ملت و مذہب علیٰحدہ ہو۔ نظر حقیقت بین کے آگے ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی سب راہِ حق کے جویا ہیں فقط عقائد اور طرق مختلف ہیں۔ دیکھئے قرطبہ کی اسلامی یونیورسٹی میں نصرانی طالب علم کس قدر موجود تھے۔ پس اگر ہماری یونیورسٹی کا دروازہ بھی ہر ملت و مذہب کے واسطے کشادہ رہے تو میری رائے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایک نوع سے خود مسلمان طلبہ کے حق میں مفید ہوگا کیونکہ انصافاً ہمارے ہندو بھائی محنت و مشقت میں اور طالبِ علمی کی نفس کشی میں ہم سے بہت پیش قدم ہیں اور ہم کو ان کی صحبت سے غبطہ کا فائدہ پہنچ سکتا ہے فقط دقت اس قدر ہے کہ ہم اپنے کالج اور یونیورسٹی میں یہ خصوصیت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ طلبہ دن رات اُس میں مقیم رہیں اور اُن کی روزانہ زندگی پر اساتذہ کی صحبت اور باہمی معاشرت کا اثر پڑتا رہے اور اس میں ہمارے ہندو بھائی شریک نہیں ہو سکتے اور تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ خارجی طلبہ کا اثر رزڈنٹ یعنی مقیم طلبہ پر برا پڑتا ہے۔ اس ایک قباحت کے علاوہ اور کوئی خیال مانع نہیں ہے اور اگر اسی پر کامیابی یونیورسٹی کی منحصر ہے تو یقیناً ہماری تجویز کے اعوان و انصار اُس کے قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے باقی رہی ہماری مذہبی تعلیم جس کو ہم کسی عنوان پر چھوڑ نہیں سکتے اُس کا بندوبست مسلمانوں کے واسطے جیسا کہ اب کیا جاتا ہے بہت کچھ اضافہ کے ساتھ اُس وقت کیا جائیگا اور دینیات مثل کلام و تفسیر و حدیث و فقہ و اصول

وغیرہ کیلئے ایک فیکلٹی علیحدہ ہو گی جس سے فقط مسلمان ہی فائدہ اٹھائیں گے ہمیں ایسا غیر مذہب والا طالب علم کوئی کا ہے کو شریک ہو گا اور یوں اگر کوئی اپنے شوق سے شریک ہونا چاہے تو کوئی مانع بھی نہ ہو گا۔ البتہ اس فیکلٹی کے اغراض حاصل کرنے کیلئے ہم کو لازم ہو گا کہ ہم ضرورت کے موافق پروفیسر اور معاون تعداد مناسب میں مقرر کر لیں اور اس شاخ کیلئے بھی مثل دوسری شاخوں کے وظائف ترغیبی یا فیلوشپ یا دونوں تجویز کریں بغیر اس شاخ کے پورے طور پر قائم ہوئے مسلمانو کو ہرگز تشفی نہ ہو گی اور نہ یونیورسٹی کا اثر پورا مسلمانوں پر پڑے گا۔ مختصر ہم یونیورسٹی سے اپنی دو نہایت مہتم بالشان غرضیں پوری کرایا چاہتے ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان لڑکا اپنے مذہبی عقائد و مسائل سے ناواقف نہ رہے اور اپنے بزرگانِ دین کی تہذیب و اخلاق سے عاری نہ ہو اور اُس کے ساتھ ہی مغربی علوم پر جامعیت کے ساتھ عبور حاصل کرے اور مغربی خیالات سے پوری طور پر متمتع ہو۔ دوسری غرض یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی ایک ایسا مرکز علوم و فنون بن جائے کہ اُس کا اثر صالح تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑتا رہے اور اُن کے خیالات کی اُن کی طرز معیشت کی اور سب سے زیادہ اُن کی لٹریچر کی اصلاح کرے۔ آپ بےخبر نہیں ہیں کہ علی گڈھ نے اور تہذیب الاخلاق نے تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے لٹریچر پر کیا اثر ڈالا تھا۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ جتنی اُردو زبان کی کتابیں اس بیس پچیس سال کے عرصہ میں تصنیف ہوئی

ہیں اُن میں سے وہی قابلِ اعتنا نکلیں گی جن پر علی گڈھ کے طریقۂ تحریر کا اثر پڑا ہے ورنہ بہت سی ناولیں اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے اکثر یا تو مادہ سے خالی ہیں یا اُس بیہودہ اور غیر مہذب رنگ میں رنگی ہوئی ہیں جسکی ہماری پبلک بعض خاص خاص سوسائٹیوں کے پلید اور چرک آلود اثر سے عادی ہو رہی تھی۔ عاقل کیلئے اشارہ کافی ہے اگر فسانۂ عجائب سے لیکر اس وقت کی اُن ناولوں تک جو اپنے مصنفین کے نزدیک بہت مہذب طور پر لکھی گئی ہیں غور سے نظر ڈالی جائے اور خاصکر اس نکتہ کی طرف توجہ کیجائے کہ اُن میں عورتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا گیا ہے تو آپ پر حقیقت کھل جائے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ اُن میں یورپ کے بدترین اور ذلیل ترین ناولوں کی تقلید کیگئی ہے اور اُس کا نام تہذیب رکھا گیا ہے باقی باتیں وہی قائم ہیں جو پچھلے وقتوں سے وراثتہً اُن کو ملی ہیں ہم کو پورا یقین ہے کہ اگر یونیورسٹی قائم ہوگئی تو بہت جلد یہ دھبہ ہمارے موجودہ لٹریچر سے مٹ جائیگا اور قابلِ قدر کتابوں کی تعداد بڑھتی جائیگی اور مصنفین کے تفکرات و تخیلات میں اصلاح ہو جائے گی۔

ہم کو جس امر پر سب سے زیادہ اصرار ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح ہماری اولاد زمانہ تعلیم میں ان پلید صحبتوں سے بچے جو ہمارے موجودہ طریقۂ معاشرت کا لازمہ ہیں کوئی کم گھر ایسا ہوگا جہاں لڑکے کم سنی کے زمانہ میں لونڈی باندیوں کی صحبت

نوکر چاکروں کے اختلاط ہمسایہ اور محلہ کے رذیل اور آوارہ ہم عمروں کی یکجائی
مکان اور حوالی مکان کی گندگی سے محفوظ رہ سکتے ہوں کیا آپ ایک لحظہ کیلئے
بھی خیال کر سکتے ہیں کہ اِن سب مراتب کا اثر طبیعت اور اخلاق پر نہیں پڑتا
کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کی کان میں پڑی ہوئی یا آنکھوں دیکھی ہوئی
باتیں کبھی فراموش ہوتی ہیں اور ان کا اندیشہ ناک اثر اُس عمر کی سریع الانفعال
طبائع پر کالنقش فی الحجر نہیں ہوتا اور اُن کی تاثیر سے خیالات ناپاک اور
معاشرت گندہ اور چرک نہیں ہوتی۔

دودھ اور خربزہ کو اطباء سریع الاستحالہ کہتے ہیں یعنی بہت جلد خلط غالب
کی طرف مستحیل ہو جاتا ہے وہ ہی حالت بچوں کی ہے جو رنگ غالب ہو اُس میں
مل جاتے ہیں اور پھر تمام عمر وہ رنگ نہ دھوئے دھلتا ہے نہ چھڑائے چھٹتا ہے
اگرچہ ازروئے عقلِ سلیم و ازروئے شرعِ شریف والدین ذمہ دار ہیں مگر انصافاً و
ایماناً فرمائیے کہ کتنے صاحبِ اولاد ہم میں ایسے ہیں جو اس ذمہ داری کی واجبی
وقعت اور درست اندازہ کرتے ہوں ہمارے ہاں اولاد کی حد بلوغ تک سب سے
زیادہ ذمہ داری والدین کے نزدیک یہ گنی جاتی ہے کہ چھٹی چھلہ بسم اللہ ختنہ
منگنی۔ شادی۔ دھوم دھام سے ہو اور اُس میں زر کثیر صرف کیا جائے آپ کو
شاید تعجب ہوگا کہ بعض شہروں میں کلمہ "کار خیر" کا مدلول عوام و خواص کے محاورہ
میں لڑکیوں کی شادی قرار پا گیا ہے جب کوئی "کار خیر" کا ذکر کرتا ہے تو سامع

کسی کی لڑکی کی شادی ہی سے اس کو تعبیر دیتا ہے تعلیم کی ذمہ داری بہت
ہی سرسری خیال کی جاتی ہے یہاں تک کہ عام طور پر متمول لوگوں کو بھی اُستاد کی
تنخواہ یا مدرسہ کی فیس ادا کرنے میں لیت و لعل ہوا کرتا ہے بعض امیروں کا نام میں
لے سکتا ہوں جن سے مدرسہ کی فیس تو درکنار بورڈنگ کا خرچ وصول ہونے میں
دقت ہوتی ہے۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو اپنی اولاد کے ناشایستہ کرداروں سے
دیدہ و دانستہ اغماض کرتے ہیں اور جو صاحب اولاد اپنی ذمہ داری کو سمجھتے
بھی ہیں اور اُس سے عہدہ برآ ہونیکی کوشش کرتے ہیں اُن کو بھی دنیا کے مشاغل
اور تحصیل معاش کے جھگڑے کب فرصت دیتے ہیں کہ وہ اس طرف دل سے
متوجہ ہوں اور معتد بہ وقت اپنا اس کام میں صرف کریں غرض صاف صاف
یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی مسلمان کو منظور ہو کہ اپنی اولاد کو زیور علم و اخلاق سے
مزین کرے تو اُس کو ضرور ہے کہ وہ اُسے کسی علی گڈھ جیسے تعلیم گاہ میں کم سنی کے
زمانہ سے داخل کردے اور اُن کے اخراجات کا جو بمقابلہ فوائد بہت ہی کم ہیں
متکفل رہے۔ بلکہ میں ایمانًا کہہ سکتا ہوں کہ ہر دولتمند مسلمان پر فرض ہے کہ ایک یا دو
یا زیادہ غریب مسلمانوں کی تعلیم کیواسطے بھی اسی مدرستہ العلوم میں وظائف مقرر کرے
خداوند عالم ضرور اس کار خیر کی برکت اُس کی اولاد کے آگے لائیگا اور اس نیکی کی جزا
اُس کو دنیا و عاقبت میں عطا فرمائیگا۔

میرے نزدیک ہم مسلمانوں میں کوئی گروہ اس قدر تعظیم و تکریم کا مستحق نہیں جسقدر

علما کا گروہ ہے جو اپنے علم و فضل و تقویٰ کی برکتوں سے ہم اہل دنیا کو مستفیض کرتے ہیں اور دینِ اسلام کو ہمارے لئے زندہ رکھتے ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے اور اُن کی برکتوں سے ہم کو ہمیشہ مستفیض کرے مگر جنابِ من ہر شخص فقیہ و محدث نہیں ہو سکتا اور نہ ہر شخص صلاحیت فقاہت و اجتہاد و ارشاد کی رکھتا ہے دین کا استحکام اصلاحِ معاش کے ساتھ وابستہ ہے کوئی قوم جو اپنی دنیا کی اصلاح سے کنارہ کرے اور افزونی معاش کی تدابیر سے دست کش ہو اُس کے دین میں بھی بہت جلد رخنہ پڑ جائیگا اور دین و دنیا دونوں ہاتھ سے جاتی رہیں گی ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے عقائد درست رکھے اور اوامر و نواہی پر مطلع ہو اور اپنے مذہب کی عبادات و معاملات کے ضروری مسائل سے آگاہ ہو باقی اُمور گروہِ علما پر محول ہیں ہم دنیا داروں کو وقتاً فوقتاً اُن سے ہدایت مل سکتی ہے آپ یاد رکھئے کہ ہم مسلمان کبھی اپنی دینی دولت کو تلف نہ ہونے دیں گے اس کیلئے ہم کو نہ ترغیب کی ضرورت ہے نہ انجمنوں کی حاجت ہے اسلام کو اگر خوف ہے تو زیادہ تر اس کا خوف ہے کہ ہم خوابِ غفلت میں مبتلا ہیں اور دنیاوی برکات زمانہ کے ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں اور ہم اپنی کاہلی اور نامردی سے منہ دیکھتے رہ جائیں اور حق تو یہ ہے کہ ہم اگر اپنی نافہمی سے دنیا کو ترک کیا چاہیں تو دنیا ہم کو کب ترک کرتی ہے اور جب دنیا ہم کو ترک نہیں کرتی تو ہم کیوں اپنے دنیاوی اصلاح میں علم و دانش سے مدد نہ لیں اور کیوں ایسے ضروری کاموں میں اپنی ساری قوت

صرف نہ کریں اور جاہلانہ طور پر دنیا داری کرنیکے عوض ہم کیوں نہ عاقلانہ طریقہ اختیار کریں۔

حضرات! ہم مسلمانوں میں آج کل ایک نیا مرض شایع ہوگیا ہے جسکو اسلاف پرستی کہتے ہیں اکثر انگریزی داں نوجوان ہمارے خصوصاً علی گڈھ کے طلبہ اس میں بکثرت مبتلا ہیں اور اس مرض کی اشاعت کے بانی اول دو چار یوروپین مورخ ہیں مگر زیادہ تر بعض ہمارے ہی گروہ کے بزرگوار ہیں۔ نام لیتے ہوئے میں ڈرتا ہوں مگر خیر مجمع بہت بڑا ہے عجب نہیں کہ میرے بھی حامی ومددگار یہاں بہت نکل آئیں گے۔

حضرات؟ بڑے منڈوں میں کے ایک نواب محسن الملک بہادر ہیں اور دوسرے مولانا شبلی نعمانی ہیں میرے قدیم کرم فرما مولانا حافظ نذیر احمد صاحب بھی اگرچہ کبھی کبھی اس کوچہ میں بھٹک نکلتے ہیں مگر وہ وقت پر نہیں چوکتے۔ کڑوی بات بیدھڑک کہہ جاتے ہیں جو تریاق کا حکم رکھتی ہے ان حضرات نے اودھم مچادی ہے آفت برپا کردی ہے کوئی مسلمانوں کی علمی دولت کو شمار کرتا ہے کوئی تمدنی خوبیاں گناتا ہے کوئی ہمارے مدارس ولونیورسٹیوں کی فہرست تیار کرتا ہے کوئی ہماری یونانی کتابوں کے ترجموں کا حساب دیتا ہے کوئی اندلس کی حکومت کا زور دکھاتا ہے کوئی ہارون ومامون کی شان بیان کرتا ہے۔

حضرات؟ اس میں شک نہیں کہ اسلاف پرستی بہت عمدہ شیوہ ہے

مگر اُسی حدتک کہ ہم اپنے بزرگوں کی خدمات کی داد دیں اور اُن کی عزت کریں اور اصلِ طریقہ اُن کی بزرگیوں کے داد دینے کا اور قدر کرنیکا یہ ہے کہ ہم اُن کے قدم بر قدم رکھیں اور اُن کی محنت اُن کی یک رنگی اُن کی نفس کشی کی تقلید کریں اور اُن کا سا صبر و استقلال اُن کا سا انہماک طلب علم میں پیدا کریں اور جس فن کو اختیار کریں اُس میں اُن کی سی نظر تحقیق حاصل کریں نہ یہ کہ ہمارے بزرگوار جو کچھ اپنے وقت میں کر گئے ہیں اُس پر غرہ کریں۔ اور مثلِ زنِ بیوہ کے اُن کے نام پر بیٹھ رہیں اور اُن کی علمی بزرگیوں کا تذکرہ دوسروں سے سنکر زمانۂ حال کی دولتِ علمی کو حقیر سمجھیں اور اُس کی دریافت سے اغماض کریں مختصر یہ کہ اسلاف پرستی کو اپنی جہالت یا کاہلی یا نفس پروری کا بہانہ گردانا ہرگز جائز نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ اُن کی بزرگیوں کو یاد کرکے ہم اپنے عیوب سے غافل ہو جائیں اُس شخص نے تاریخ پر بالکل کورانہ اور نافہم نظر ڈالی ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس وقت کے لوگوں میں کوئی عیب نہ تھا اور ہمارا ہی زمانہ بدیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی وقت عیب سے خالی نہیں ہوا کرتا جو نقصانات ہم میں اس وقت کسی قدر مبالغہ کے ساتھ موجود ہیں اُس وقت بھی موجود تھے اور ہماری ناکامی کا تخم بو رہے تھے۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ خداشناسی کے واسطے اول خود شناسی ضرور ہے جب تک ہم اپنے عیوب سے واقف نہ ہوں اور اُن کو

صداقت کے ساتھ تسلیم نہ کرلیں کبھی ہماری حالت میں اصلاح نہیں ہوسکتی مگر بیشک
یہ آخر العلاج الکی کا حکم رکھتا ہے اس سے اذیت بہت ہوتی ہے نفس انسانی
جو بالطبع خوشامد پسند ہے۔ اپنی عیب چینی کی گزند سے چیخ اٹھتا ہے اور ناصح
صادق سے ہمیشہ ملول رہتا ہے۔ عین الرضا ہر فرد بشر کو پسندیدہ ہے عین السخط
کی نقادیوں سے ہر کوئی گھبراتا ہے کیونکہ

وَعَیْنُ الرِّضَا عَنْ کُلِّ عَیْبٍ کَلِیلَۃٌ		وَلٰکِنَّ عَیْنَ السُّخْطِ تُبْدِی الْمَسَاوِیَا

ایک عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے دوسرا اُن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھکر نکالتا ہے مگر یاد رہے
کہ عین السخط ہی ہمارا اصلی دوست ہے دوسرا جو ہماری عیب پوشی کرتا ہے وہ
در اصل ہمارا دشمن ہے والعاقل تکفیہ الاشارہ۔

حضرات! آپ لوگ جو قوم کی طرف سے بطور وکلاء یہاں جمع ہیں
آپ کا منصب بہت عظیم ہے آپ کے اختیارات اور آپ کے اقتدارات
نہایت وسیع ہیں۔ آپ جس قومی اصلاح کے کام میں باتفاق و خلوص نیت
سعی و کوشش کریں ممکن نہیں کہ اُس میں کامیاب نہ ہوں۔ ہمت ہار دینا اور ارادہ
ترک کرنا امر قبیح ہے اس لئے آپ سے امید ہے بلکہ آپ کی قوم آپ سے بہزار
لجاجت متمنی ہے کہ اس جلسہ کو اس موقع کو آپ غنیمت جانکر ہمارے قومی مقاصد کے
حصول میں ایسی سعی و کوشش کریں کہ بہت جلد کوئی عملی نتیجہ نکل آئے پھر ایسا موقع
بارہ مہینوں کے بعد دستیاب ہوگا۔

مصرع ؎ تا سال دگر ے کہ خورد زند کہ ماند ؟

اور اگر آپ نے کچھ نہ کیا تو یہ سال بھی بیکار جائیگا اور ہماری ناکامی کے اسباب زور پکڑتے جائیں گے۔ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو ہدایت کروں کہ عملی کارروائی کس نہج سے شروع کیجائے مگر میں اس قدر عرض کرنیکی جرات کرتا ہوں کہ ہر مسلمان پر جو اس کانفرنس میں شریک ہے فرض و واجب ہے کہ جہاں تک اُس کا مقدور ہو خود اس طرف متوجہ ہو اور دوسروں کو متوجہ کرے اور ایک مستقل و معتد بہ سرمایہ اس قومی کام کیلئے جمع کرنیکی کوشش کرے مگر چونکہ منفردہ کوششوں سے کامیابی کی توقع نہیں کیجاسکتی اس لئے ضرور ہے کہ کانفرنس کی جملہ عملی کارروائیوں کو ایک قاعدہ و انتظام کے سلسلہ میں منتظم کیا جائے اور اُس کیلئے باتفاق رائے حاضرین کانفرنس کوئی معقول طریقہ قرار دیا جائے میں اس عرض کرنیکی معافی چاہتا ہوں کہ اسوقت تک کانفرنس کے جلسوں میں اراکین و حاضرین کا وقت زیادہ تر تقریروں میں صرف ہوتا رہا ہے۔ رزولیوشن بعضے بہت عمدہ اور مفید منظور ہوئے ہیں مگر اُن کی فائدہ مندی رپورٹوں کی حد تک محدود رہی ہے اُن پر اس وقت تک جس طرح لازم تھا عمل نہیں ہوا اگر اُن پر عمل ہوا ہوتا تو اس وقت تک ہم اپنی منزل مقصود سے کسی قدر تو قریب تر پہنچے ہوتے۔ کانفرنس کی رپورٹوں کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جلسہ میں یہ رزولیوشن منظور ہوا تھا کہ ہر شہر و ہر قصبہ میں کانفرنس کی کمیٹیاں مقرر ہوں اور وہ مسلمانوں کی عام

تعلیم اور اُن کے درس گاہوں کے متعلق رپورٹیں پیش کیا کریں" شروع شروع میں اس
رزولیوشن کی کسی قدر تعمیل ہوئی۔ مگر پھر اجلاس چہارم کے بعد نہ کوئی رپورٹ پیش ہوئی
نہ اس مفید تجویز کا ذکر آیا اور نہ مقامی کمیٹیاں کہیں قایم ہوئیں حالانکہ اس تجویز کی
تعمیل سے جس قدر فوائد متصور ہیں آپ حضرات خود خیال فرما سکتے ہیں۔ ایک
دوسری تجویز قرار پائی تھی کہ مختلف حصوں کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا صحیح اندازہ
کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ کتنے مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم دے سکتے ہیں مگر نہیں دیتے
پھر اُس کے اسباب دریافت کئے جائیں اور یہ معلوم کیا جائے کہ کتنے مسلمان ایسے
ہیں جو بوجہ افلاس اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دے سکتے اغراض بالا کیواسطے تعلیمی مردم شماری
پر چند روز کچھ توجہ کی گئی۔ اور مسٹر بیکٹ کو اس بات میں خاص دلچسپی رہی مگر اراکین
کی بے توجہی سے یہ کام بھی پورا نہ ہوا۔ اگر اس خاص مادہ میں درست طور پر معلومات
حاصل کئے جاتے تو آپ صاحبوں پر واضح ہو جاتا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کس قدر
افسوسناک ہی نہیں بلکہ شرمناک ہے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ عموماً مسلمان لوگ اپنے
بچوں کی تعلیم سے غافل ہیں اور جہاں ذرایع تعلیم اُن کے دروازے و دہلیز کے
متصل موجود ہیں وہاں بھی وہ سوائے معدودے چند اُس سے فائدہ نہیں اٹھاتے
مذہبی تعلیم جس پر بہت زور دیا جاتا ہے سب بقول عوام زبانی جمع وخرچ ہے گھر پر
والدین اس طرف مطلق توجہ نہیں کرتے فقط اسکول نہ بھیجنے کیلئے اُن کو یہ بہانہ
مل جاتا ہے کہ وہاں مذہبی تعلیم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جن مدارس میں مذہبی تعلیم کیواسطے

تاکید بلیغ کی گئی ہے اور نماز میں شریک ہونے پر اصرار کیا جاتا ہے وہاں دیکھا گیا ہے
کہ یہ تاکید و اصرار اساتذہ ہی کے حکم تک محدود ہے والدین کو عموماً اس سے دلچسپی نہیں ہے
بلا خوف مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان لڑکے جو شاذونادر کچھ حاصل کر لیتے ہیں اُن
والدین کا احسان چنداں نہیں ہوتا عموماً اپنے ہی شوق سے یا استادوں کی توجہ سے
کچھ حاصل کر لیتے ہیں مگر یہاں اس بحث کو طول دینا بے موقع ہے ایک اور بہت
عمدہ تجویز یہ قرار پائی تھی کہ "غریب طالب علموں کی تعلیم کیلئے وظیفے مقرر کئے جائیں
اور وظائف کی رقم بذریعہ چندہ جمع کی جائے"۔ اس کی کوشش صرف ۹۹-۱۸۹۸ء
میں ہوئی اور گو وعدہ آٹھ ہزار روپیہ سے زیادہ کا ہوا مگر فقط تین ہزار نو سو بائیس
روپیہ علی گڈھ کالج کو اور پانچ سو اسی روپیہ حمایت الاسلام لاہور کو وصول ہوئے کیا
اس تجویز کی نسبت اب کوشش نہیں ہو سکتی اور قوم کی فیاضی اس حقیر حد تک
محدود رہنے کے قابل ہے مجھے تو اپنی قوم سے اس قدر مایوسی نہیں ہے بشرطیکہ
آپ حضرات اس تجویز کی تکمیل میں بالاتفاق کوشش فرمائیں۔ مگر سب سے ضروری
اور باعتبار مقاصد قومی سب سے زیادہ مہتم بالشان یہ تجویز سید صاحب کی
وفات کے بعد پیش اور منظور ہوئی "کہ مدرسۃ العلوم کی تکمیل کر کے اُسے یونیورسٹی
کے درجہ تک پہنچایا جائے اور اس کیلئے کم سے کم دس لاکھ روپیہ جمع کیا جائے"
اس تجویز کی بابت جس پر دار و مدار ہماری تمام آرزوؤں کا ہے شروع شروع میں
بہت جوش و سرگرمی ظاہر کی گئی اور یونیورسٹی کی حقیقت اور اُس کے تعلیم و تربیت

کے اُصول قرار دینے کیلئے بہت سی مفید رائیں جمع کی گئیں اور جابجا ڈیپوٹیشن بھیجے گئے اور قریب تین لاکھ کے چندہ کا وعدہ بھی کیا گیا مگر اتبک فقط ایک لاکھ پچیس ہزار روپے وصول ہوئے ہیں اور اس سال میں جو ختم ہوتا ہے سوائے ایک بڑی رقم کے جو ہز ہائینس نواب صاحب رامپور سے بمقدار پچیس ہزار وصول ہوئی ہے کچھ زیادہ روپیہ جمع نہیں ہوا اس میں بھی ایک لاکھ روپیہ قرض کے ادا کرنے میں صرف ہوا اور ہوگا اور اصل تجویز یونیورسٹی کیلئے ہمارے ہاتھ میں پچیس ہزار روپیہ باقی رہ جائیگا اور اس عرصہ میں وہ جوش جو ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس تجویز کی نسبت ظاہر کیا گیا تھا روز بروز سرد ہوتا گیا اور سرد ہوتا جاتا ہے اور اب اگر فوراً اور بلا درنگ متفقہ کوشش سچے دل سے اور خلوص نیت سے اور نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ نہ کیگئی تو یہ نقش جو مسلمانوں نے ایک لحظہ کیلئے عالم رویا میں دیکھا تھا کبھی مجسم ہوکر ان کے آگے نہ آئے گا اور اس خواب کی تعبیر کبھی ظاہر نہ ہوگی۔ آپ سب حضرات جو اپنی قوم کے بہی خواہ ہیں یقیناً قبول فرمائیں گے کہ یہ سب تجویزیں خصوصاً یہ اخیر تجویز جس پر میرے نزدیک دار و مدار تمام قومی صلاح و فلاح کا ہے اس لایق ہے کہ جاری کی جائے اور قوم سے اس میں مدد لی جائے مگر قوم سے کام لینے کا کوئی مستحکم سلسلہ قایم ہونا چاہئے اسوقت تک کوئی اس قسم کا مستحکم سلسلہ قایم نہیں ہے اس کے لئے سب سے ضروری یہ امر ہے کہ دوامی کمیٹی کانفرنس جس کا مستقر علی گڈھ ہے اُس کے دفتر میں

ایک خاص لیاقت کا شخص مقرر کر لیا جائے جس کا صرف یہ کام ہو کہ وہ سال بھر
تک کانفرنس کی مفید تجویزات کی تعمیل پر مختلف مقامات کے لوگوں کو متوجہ
کرتا رہے اور بذریعہ خط و کتابت برابر یاد دہانی کا سلسلہ جاری رکھے اور جن شہروں
میں خاص خاص لوگ اس کام سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کو ہمیشہ بیدار کرتا رہے
اور پھر بھی کافی نہیں ہے کہ علی گڈھ کے دفتر سے فقط اشتہار بانٹے جائیں اور
خطوط جاری کئے جائیں بلکہ ضرور ہے کہ کم سے کم دو یا تین آدمی ایسے مقرر کئے
جائیں جو مختلف اضلاع میں دورہ کرتے رہیں اور برانچ کمیٹیوں کے قایم کرنے میں
ساعی ہوں اور جہاں کمیٹیاں قایم ہو چکی ہوں اُن کی کارروائی کو دیکھتے رہیں
جابجا مسلمانوں میں کانفرنس کے مقاصد مسلمہ اور فوائد و ضرورتِ تعلیم کی ہدایت
کرتے رہیں۔ آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس محنت و بار کے تحمل کی اُمید اُن لوگوں
سے نہیں ہو سکتی جو چند روز کے لئے اپنے شوق سے بلا معاوضہ یہ کام اپنے
ذمہ لیں بلکہ ضرور ہے کہ کم سے کم دو تین آدمی تنخواہ دار مقرر کئے جائیں جو بالطبع
اس کام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور تحریر و تقریر کا مادہ بھی اُن میں موجود ہو اور
چونکہ یہ تجویز بغیر رقم کے نہیں چل سکتی۔ اس لئے اس کے واسطے علیحدہ چندہ کیا جائے
اور اسی سال سے کام شروع کر دیا جائے اس سال کے واسطے امتحاناً ڈھائی ہزار
روپیہ کے چندہ کی فہرست کھولی جائے اور یہ رقم علیحدہ اس کام کے واسطے
رکھی جائے اور ایک سال اس تجویز کا تجربہ کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ اُس سے

کیا فائدہ ہوتا ہے میری تو یہ رائے ہے کہ اگر یہ تجویز استقلال اور درستی کے ساتھ کیجائے اور لائق لوگ منتخب ہوں اور صدر کمیٹی پوری نگرانی کرے تو نہ صرف کانفرنس کے مقاصد و اغراض کو مدد ملے گی بلکہ روپیہ بھی وصول ہوگا اور آئندہ اس آمدنی سے خرچ چل سکے گا کیا اگر فکر و کوشش کیجائے تو سارے ہندوستان میں پانچ چھ ہزار مرد مسلمان ایسے نہ ملیں جو پانچ روپیہ سالانہ چندہ ممبری کا دیا کریں صرف ترغیب دینا اور لوگوں کا آمادہ کرنا اور ایک مستحکم طریقہ پر باقاعدہ طور سے کام چلانا ضرور ہے چنانچہ آپ ہی کی اسٹانڈنگ کمیٹی نے ۱۸۹۸ء میں وظائف کے جمع کرنیکی کوشش کی اور چار ہزار چھ سو روپیہ ایک ہی سال میں جمع کرلیا اگر وہی کوشش اُسی طور پر برابر جاری رہتی تو کیا ممکن نہ تھا کہ ہر سال اسی قدر رقم وظایف کیلئے جمع ہوتی جاتی یہ توقع کرنا صرف چند آدمی چندہ کے لئے مخصوص کرلئے جائیں اور اُنھیں سے بار بار چندہ وصول کیا جائے عقل کے خلاف اور طریقہ انصاف سے بعید ہے پس اگر حضرات آپ کو اپنے لئے اور اپنے بال بچوں کیلئے اور اپنی قوم کیلئے کچھ کرنا ہے تو اس قسم کا کوئی طریقہ جس پر آپ سب لوگوں کو اتفاق ہو اور جو آپ کے نزدیک مستحسن ہو اپنے اختیار کیجئے اور عملاً کچھ کر دکھائیے باقی مرثیہ خوانی اور پرانے دفتروں کی ورق گردانی یا رونے دھونے اور تین چار دن تک مجلس گرم رکھنے سے نہ اب تک کچھ ہوا ہے نہ آئندہ ہونیکی اُمید ہے۔

حضرات! میں نے آج آپ حضرات کی بہت کچھ سامعہ خراشی کی

اور اپنے دل کے جوش سے بہت کچھ رطب و یابس بک ڈالا جس کیلئے میں معافی
مانگتا ہوں میں آپ کا نہایت درجہ ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے حسن خلق سے
میری شکستہ و از ہم گسستہ تقریر کو توجہ کے ساتھ سماعت فرمایا اب میں اُمیدوار ہوں
کہ آپ اس نادیہ کے کارفرماؤں کو اجازت دیں گے کہ وہ اپنے اپنے مقاصد
آپ کے سامنے پیش کریں تاکہ آپ کی رائے اور آپ کے مشورہ سے قوم مستفیض ہو
مگر قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر کو ختم کروں مجھ پر واجب ہے کہ اول تو اس شہر کی
مہمان نوازی کا شکریہ ادا کروں خصوصاً اُن بزرگواروں کا جو کمیٹی میزبانی کے
اعضا اور علی الخصوص والی ملک و ریاست عالیجناب ہز ہائنس نواب صاحب
رامپور کا جن کا نام نامی قوم کے محسنوں کے دفتر میں ہمیشہ کیلئے درج رہے گا اور
جنکی فیاضی نے مدرسۃ العلوم علی گڈھ کو اور مسلمانوں کی اس کوشش کو جان تازہ
بخشی ہے ہم سب لوگ جو دور دراز مقاموں سے آپ کے حسب طلب آئے
ہوئے ہیں تمام عمر آپ کے اخلاق آپ کی خاطرداری اور آپ کی مہمان نوازی
نہ بھولیں گے ثانیاً ہم اپنی قوم کے محسنوں کو نہیں بھول سکتے جن کی فیاضی اگر
سید صاحب کی کمک نہ کرتی تو اُن کے خیالات و تفکرات اُن کے دل ہی
میں رہ جاتے عملی نقش اُن کا صفحۂ ہستی پر مصور نہ ہوتا خصوصاً سرتاج مسلمانان
ہند والی ریاست حیدرآباد دکن ولی نعمت اعلیحضرت حضور نظام الملک
آصف جاہ خلد اللہ ملکہ کے بے بہا احسانوں کا شکریہ قوم پر واجب ہے

ادام اللہ منہ و برکاتہ لنا وللعلمین وحفظہ اللہ و بلادہ من حوادث الزمان و نوائب الحدثان اور آخر میں میرا فرض ہے کہ میں اس سرکار ابد قرار کا شکریہ تہ دل سے ادا کروں جس کی بدولت ہم اس قسم کی قومی اغراض میں بالاتفاق کوشش و سعی کرنے پر مستعد رہیں اور جو ہر طور سے تمام جائز اور مفید مقاصد میں ہم کو ہر وقت مدد و کمک دینے کیلئے آمادہ ہے خصوصاً حکمرانان ممالک مغربی و شمالی کا جو اول سے مدرسۃ العلوم علی گڈھ کو فیاضانہ کمک دیتے رہے اور لفٹنٹ گورنر حال کا کہ اُنھوں نے عین وقت پر مدرسہ کو بے بہا مدد سے سرفراز فرمایا اور ہمیشہ اُس پر مربیانہ نظرِ عنایت مبذول رکھتے ہیں یہ سالِ عیسوی جو آج کل حالتِ احتضار میں ہے بڑا پرمصائب سال تھا ایک طرف طاعون کی ترکتازی ایک طرف قحط سالی کے حملے اِدھر جنگ ٹرانسوال کے مہمات اُدھر چین کے پیچ پیچ مشکلات لیکن الحمدللہ کہ ہماری ملکۂ معظمہ خلد اللہ ملکہا کی نیک نیتی اور اُن کے کارپردازوں کی لیاقت و فطانت سے سال بخیر و خوبی گزر گیا اور تمام مشکلیں کامیابی کے ساتھ حل ہوگئیں اور نائرہ شر و فساد برطرف ہوگیا۔

خدا اُن کا ظلِ عاطفت ہم رعایا کے سروں پر ہمیشہ قایم و دایم رکھے ؁

عالیجناب سرسید احمد خاں بہادر و حضرات!

مجالس عزا میں مرثیہ خوانوں کا دستور ہے کہ اکثر اوقات تقدم بالحفظ کے طور پر یہ فقرہ سامعین کے گوش گزار کر دیا کرتے ہیں کہ آج ذاکر کی آواز خستہ ہے تاکہ اگر اُن کی توقعات پورے نہوں تو ذاکر کو معذور رکھیں اور اُس غریب سے رنجیدہ نہ ہوں۔ میری مثال بھی آپ حضرات کے روبرو اُن مرثیہ خوانوں سے کم نہیں ہے (قہقہہ) فرق صرف اس قدر ہے کہ خستگی آواز کا عذر معقول مجھے حاصل نہیں ہے تاکہ میں بھی اُسے تقدم بالحفظ کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کروں ہاں اس قدر عرض کرنیکی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر صدر انجمن کی نسبت آپ کے توقعات پورے نہوں تو از روئے انصاف آپ اپنے انتخاب کو قصوروار ٹھہرائیں، نہ اس بندۂ ناچیز کو جو کہ ہرگز اپنے آپ کو اس منصب کے لائق نہیں سمجھتا (نہیں! نہیں!) اور جس نے محض آپ کی مروتِ عظیم و اخلاقِ عمیم پر تکیہ کر کے اس کرسی پر بیٹھنے کی جرأت کی ہے۔ پس اگر میں اپنے فرائض خدمت سے عہدہ برآ نہوا تو اُمید ہے کہ آپ میری طرف سے حافظ کا یہ شعر یاد کریں گے ؎

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بد اندام ماست	
	ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

اب میں کانفرنس کی نسبت جو کچھ عرض کرنا ہے عرض کرتا ہوں - اور آپ کے روشن خیالات کو اس جانب متوجہ کرتا ہوں - کانفرنس کی یکسالہ کارروائی اس تین دن کے عرصہ میں تمام وکمال آپ کی سماعت میں آچکی اور آئندہ کیلئے جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ بھی آپ کے روبرو پیش ہو چکیں اب یہ فیصلہ آپ کی رائے اور صوابدید پر منحصر ہے کہ کارپردازان کانفرنس کہاں تک مقاصد کانفرنس میں کامیاب ہوئے - اور کہاں تک ناکام رہے؟ اور ناکامیابی کے کیا وجوہ ہیں؟ اور آئندہ کیا کوششیں ہم کو لازم ہیں؟ تاکہ قدم ہمارا ہمیشہ منزل مقصود کی طرف بڑھتا رہے اور پوری کامیابی کی امید کیلئے قوی وجوہ اور علامات بیّنہ پیدا ہو جائیں سوال یہ ہے کہ منزلِ مقصود ہماری کیا ہے؟ اور وہاں تک پہنچنے کیلئے کیا اسباب اور کیا ذریعے ہیں؟ اور اس وقت تک ہم نے اس راہ میں کتنی منزلیں طے کی ہیں؟

حضرات! سب سے عزیز و عظیم تر غرض و غایت ہماری اور ہر قوم کی جس میں ادنیٰ درجہ کی غیرت و حمیت باقی ہے ہمیشہ یہی ہے اور یہی ہوگی کہ فقط اپنے صنادید اور بزرگوں کی عزت و حرمت اور اپنا نام و نشان باقی رکھے اور اپنے آپ کو ایسی حالت ذلت و ضعف میں نہ پہنچنے دے کہ

دوسری قومیں اُسے دیکھکر افسوس یا رشک چند کریں بلکہ روحانی قوتوں کو جن پر دینی و دنیوی فتوحات کا دارو مدار ہے یوماً فیوماً ترقی دیتی رہے اور اپنا قدم میدان سعادت میں آگے بڑھاتی رہے۔ کیونکہ آپ کو خوب یاد رہے کہ حالتِ سکون انسان کیلئے ایک امر محال ہے۔ انسان کیلئے ترقی یا تنزل یہی دو شقیں ہیں۔ شق ثالث مفقود ہے۔ نفوس انسانی کو خداوند عالم نے یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے کہ ہر نفس ہر دم ہر لحظہ یا تو مدارج اعلائے سعادت کی جانب رو بترقی رہا کرتا ہے۔ یا برعکس حضیض شقاوت کی طرف رو بہ تنزل عدمِ ترقی کو تنزل لازم ہے اور یہ قانون افراد و نوع دونوں میں جاری ہے اور اس کے عمل سے کوئی شخص یا کوئی قوم خارج نہیں ہو سکتی۔ پس ہم اگر اس خیالِ خام میں مبتلا رہیں کہ ابھی وقت کوشش کا نہیں ہے کچھ دنوں اور انتظار کرنا چاہئے عجب نہیں کہ گزرنے والے وقت سے آنیوالا وقت بہتر ہو تو وائے برحالِ ما۔ ہماری ریل گاڑی نشیب کی جانب رواں ہے ایک ایک قدم ایک ایک انچ اس کی سرعت سیر کو تیز کر رہا ہے اور اُس کا روکنا مشکل ہوتا جاتا ہے وقت فکر و انتظار گزر گیا۔ اب سعی و کوشش کا وقت ہے۔ اب اس قصہ کو چھوڑ ئے کہ ہم کس حالت میں تھے اور ہمارے اہمال و سہل انگاری نے ہمکو تھوڑے ہی عرصہ میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ عروج کے وقت کس اوجِ سعادت پر تھی اور ہماری خود غفلت نے ہمکو کس حضیض شقاوت پر پہنچایا ہے۔ اس قصہ کو طول دینا محض بے سود اور خارج از بحث و مقصود ہے ع فیالها قصة فی شرحها طول

زوالِ سلطنت اندلس سے مجالس کانفرنس حال تک دردمندان قوم نظم و نثر میں یہ دوکھڑا روتے آئے ہیں پس ایسے ایک مسلم قصے اور اُس کے اسباب کے اعادہ میں کوئی منفعت نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک عام جلسوں میں اپنی حالتِ زار پر نالے کرنا اور خلایق کے سامنے بوڑھی عورتوں کی طرح اپنا دکھڑا رونا نہایت شرم کی بات ہے حضار مجلس اور عموماً بہی خواہان قوم کیلئے اس پرانی کہانی سے زیادہ تر دلچسپ اور لایقِ توجہ واقعہ یہ ہے کہ اپنی قوم کی اصلاح حالت میں اور ہم کو منزل مقصود کی طرف ہدایت کرنے میں ایک فرد متفرد نے ہماری قوم کے جو اس وقت ہمارا سب سے بڑا مایۂ افتخار ہے اپنی ساری قوت روحانی و مالی و جسمانی اوائل عمر سے وقف کر رکھی ہے اور خالص اور نیک نیت کوششوں سے اعوان و انصار بہم پہنچائے ہیں اور فضلِ خدا سے اپنی ہی عمر میں اس قدر کامیابی حاصل کرلی ہے کہ ہماری حالت کی درستی کا ایک عمدہ ذریعہ قایم کر دیا ہے اور ایک مضبوط بنیاد ہماری اصلاح کی ڈالدی ہے (چیرز) مگر اس بنیاد پر عمارت قایم کرنا اور اس متبرک کام کو پورا کردینا کوئی شخص کیسا ہی قوی دل ہو تن تنہا نہیں کرسکتا اگر عمر نوح و صبر ایوب بھی حاصل ہو تو ایسے مہمات کا ایک فردِ واحد سے انجام کو پہونچنا محال ہے۔

مجھے اس مقام پر ایک مختصر سا قصہ یاد آیا ہے جو میں نے ایامِ طفولیت میں ایک فارسی کتاب میں پڑھا تھا۔ وہ قصہ یہ ہے کہ ایک دن ایک پرندنے

ایک چیونٹی کو دیکھا کہ کچھ ریزے ایک بہت بڑے عظیم الشان تودۂ خاک سے
جو ایک نالے کے کنارہ پر واقع ہے اٹھا اٹھا کر نالے کے دوسرے کنارہ پر جمع کر رہا ہے
مرغ نے پوچھا کہ اے عزیز تو یہ کیا کر رہا ہے۔ چیونٹی نے جواب دیا کہ میں اس سعی و
کوشش میں مصروف ہوں کہ اس تودۂ خاک کو نالے کے اس کنارہ سے اٹھا کر اُس
کنارہ پہنچا دوں۔ مرغ نے کہا کہ اے عزیز کس خیالِ خام و زحمتِ بیجا میں مبتلا ہے
اگر خداوند تعالیٰ ہزار سالہ عمر بھی تجھے عطا کرے اور تو شبانہ روز اس کام میں مصروف
رہے جب بھی اس مہم کے عشر عشیر سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ چیونٹی نے جواب
دیا کہ اے یار میری قوم میں ایک لڑکی بہت حسین ہے جس کا میں خواستگار ہوں
اور اُس کے ماں باپ نے عہد کیا ہے کہ عقد اس نازنین کا اُسی کے ساتھ ہوگا
جو اس تودۂ خاک کو نالے کے اُس کنارہ پر جہاں اُن کا مسکن ہے پہنچا دے
میں نے کہ وادیٔ محبت میں قدم رکھا ہے اور عزم جزم اس کام کے انجام کو پہنچانیکا
کیا ہے میری ہمت گوارا نہیں کرتی کہ اس راہ کی مشکلات سے خوف کروں
اور اس کوچہ سے منہ موڑوں

مثنوی

من طریق سعی می آرم بجا	لیس للانسان الا ما سعےٰ
دامنِ مقصود اگر آرم بہ کف	از غم و اندوہ مانم بر طرف
ورنہ شد از سعی من کارے بکام	من دراں معذور باشم والسلام

حضرات۔ سر سید احمد خاں بہادر کی جو اس وادی میں ہمارے خضر طریقت

ہیں میں وہی حالت پاتا ہوں جو اُس مورچہ کی حالت تھی (چیز) جس کام کا انھوں نے بیڑا اُٹھایا ہے جس میدانِ سعی میں انھوں نے قدم رکھا ہے وہ بے پایاں ہے اور اُس کا طے کرنا بغیر اس کے کہ ساری قوم یا ایک گروہِ کثیر اعیان وبزرگانِ قوم کا اُن کی کمک اور مدد پر آمادہ ہو ایک خیال محال ہے۔

پھر کیا ہماری آپ کی حمیت گوارا کرتی ہے کہ ہم ایسے بزرگوار کی سعی کو ضایع چھوڑ دیں اور اُن کی کمک اور مدد نہ کریں ہرگز ہرگز نہیں۔ میں ہرگز ہرگز باور نہیں کرتا کہ ایک مہم جس کو ایک ذاتِ واحد کی سعی نے ساری عمر کے زحمت کے بعد کسیقدر آسان کر دیا ہے اور آیندہ اُس کی کامیابی کے سامان واسباب جمع کر دئے ہیں ہماری قوم کے فہمیدہ لوگ گوارا کریں گے کہ ہماری غفلت اور سہل انگاری سے وہ کام انجام کو نہ پہنچے اور ہماری قوم اپنے ہمعصر اقوام کے نزدیک مطعون اور بدنام ہو اور ہمارے اخلاف بعوضِ تشکر و دعائے خیر ہمکو بُرے ناموں سے یاد کریں۔

میں نہیں چاہتا کہ ایسے نامسعود اور بدشگون فال کو اپنے یا اپنے سامعین کے ذہن میں ایک لحظہ کیلئے بھی جگہ دوں یا خطرہ بھی اُس کا دل میں آنے دوں۔

حضرات۔ آپ سر سید احمد خان بہادر کی رپورٹ اور اُس کے بعد کی تقریریں سُن چکے ہیں جنابِ سید صاحب کی شکایتیں ایسی نہیں ہیں کہ کوئی بُرا مانے اور اُن کو فی الواقع اپنی قوم اور اپنے کام سے بددل خیال کرے۔ سید صاحب کا حال واقعی اس پدر بزرگوار یا اُستاد مہربان سے مشابہ ہے جو اپنے فرزند ارجمند

یا شاگرد رشید سے کسی اعلیٰ امتحان کے درجۂ اول میں کامیاب ہونیکا اُمیدوار ہو
اور وہ برعکس توقع تیسرے درجہ کے نمبر بشکل حاصل کرے شک نہیں ہے کہ ایسے
طالبِ علم کے پدر یا اُستاد کو بیحد رنج ہوگا اور وہ اپنی محبت سے اس ادنیٰ درجہ
کی کامیابی سے ناراض ہوگا اور بعوض تحسین کے زجر و توبیخ کریگا۔

جنابِ سید صاحب اور اُن کے ہم خیال بزرگوارانِ قوم کو غور فرمانا چاہیے
کہ جو مریض تپ دق میں مبتلا ہو وہ کبھی اپنے آپ کو بیمار نہیں سمجھتا ہے
اور اپنے علاج میں دلچسپی ظاہر نہیں کرتا ہے اُن کو غور فرمانا چاہیے کہ قوم میں
کتنی کم تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو زمانۂ حال کے طریقۂ تعلیم و تربیت اور اسکے
فوائد سے واقف ہیں۔ اُن کو غور فرمانا چاہیے کہ اب تک وہ زمانہ بالکل نیست
و نابود نہیں ہوا ہے جبکہ ادنیٰ درجہ کی تعلیم میانجیوں کے ہاتھوں میں تھی اور
دستور الصبیان و انشائے مادھورام و انشائے خلیفہ وغیرہ سے شاذ و نادر تجاوز
کرتے تھے اور جبکہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم بھی کسبِ معیشت اور تحصیل علوم دنیا کو
اپنی غرض و غایت کے احاطہ سے بہت دور رکھتی تھی۔ میں سید صاحب
کو یاد دلانیکی جرأت کرتا ہوں کہ ابھی تک جمہور اہل ہند کو طبیب و معلم کی فیس
دینا ایک جبر عظیم ہے اور مفت علاج کرنا کرانا اور حسبتہ للہ تعلیم و تعلم میں مشغول
ہونا عام اہل ہند کی جبلت میں داخل ہے۔ یہ حالت رفتہ رفتہ دور ہوگی اور
ایک عرصہ میں عامہ خلایق اس مسئلہ کو قبول کریگی کہ اپنی اولاد کی تعلیم میں

مال صرف کرنا ہمارا فرض ہے اور اس سے پہلو تہی کرنا گناہِ عظیم بلکہ بر ہمزن دین
وایمان ہے یہ خیال اب شایع ہو چلا ہے مگر اب تک پورے طور سے ہمارے
دلوں میں در نہیں آیا ہے اور معیشت روزمرہ میں ہمارے داخل نہیں ہوا ہے
ابھی جنابِ سید صاحب اور اُن کے ہم خیال دوسرے بزرگانِ قوم طریقۂ
تعلیم کی اشاعت میں زیادہ امداد و قدرشناسی و ہمدردی کی اُمید نہ کریں جسقدر
کہ کمک اور مدد اس عظیم الشان مہم میں اُن کو آج تک ملی ہے وہ بھی ملک اور قوم
کی حالت کے لحاظ سے غنیمت اور مستوجب شکر ہے گو وہ کمک و مدد درحقیقت
ضرورت وقت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑی ہوئی کیونکہ اس میں کوئی شک
وشبہ نہیں ہے کہ اگر قوم ایک مرتبہ بیدار ہو جائے اور اپنے مصالحِ وقت پر
مطلع ہو جائے اور جن مصائب وآفات کا ہجوم اُس کے سر پر روز بروز بڑھتا
جاتا ہے اُس کی صحیح تشخیص اور اُن کے مہیب نتائج کا درست اندازہ کرنے پر
قادر ہو تو اس اپنی شکستہ حالت پر بھی ایک آن کی آن میں اپنے بہی خواہوں
کی ساری مرادیں پوری کر دسکتی ہے اور قومی تعلیم و اصلاح کے عمدہ ذرائع
شرق سے غرب تک اور جنوب سے شمال تک ہندوستان میں پھیلا دسکتی
ہے (چیرز)

مگر حضرات اس میں شک نہیں ہے کہ جس قدر کمک اور امداد اس وقت
تک قوم سے ملی ہے وہ دو حیثیتوں سے ان اغراض کے پورا کرنے میں قاصر

اول بحیثیت کمیت اعانت مالی جو اس قدر قلیل ہے کہ اُس سے کوئی مستقل اور مستحکم بنا اُس قسم کی تعلیم کی جس کے ہم طالب و خواستگار ہیں نہیں پڑسکتی۔ اور دوسری حیثیت کیفیت امداد سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ معاونوں کی تعداد بمقابلہ مقدار مالی بہت کم ہے اور اس سبب سے قوم کی ہمدردی کا درست اندازہ اُس اعانت سے نہیں کیا جاسکتا اور نہ آیندہ کی نسبت قوم کی مدد پر بلا خوف و خدشہ تکیہ کیا جاسکتا ہے یہ دونوں مسئلے مقاصد کانفرنس سے بہت چسپاں اور کسی قدر تفصیل کے محتاج ہیں

اول مسئلہ تعلیم کی نوعیت سے متعلق ہے۔ کسی وقت واحد میں کسی قوم کی طرز معیشت وطریقہ معاملات سے اُس کے سویلزیشن اور حالت تمدنی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے مگر اُس حالت میں تغیر وتبدل ہوا کرتا ہے ہماری قدیم سویلزیشن ہماری قدیم حالت تمدنی ایک خاص طرز معیشت وطریق معاملت کے ساتھ سازگار تھی، اور ہماری قومی حالت اُس وقت بُری ہو یا اچھی ہماری توقعات اور ضرورتوں کے پورا کرنے پر قادر تھی اب حالت ہماری یہ ہے کہ ایک بیرونی سویلزیشن نے جو ہماری سویلزیشن اور طریق تمدن سے بدرجہا بہتر ہے ہمارے ملک پر قبضہ کیا ہے اور صورت یہ پیدا ہوئی ہے کہ دوسری قومیں جو دانشمند اور مصلحت شناس تھیں اور جن کو اپنی قومی طریق معیشت وطرز معاشرت کے ساتھ شاید ایسا مضبوط اُنس نہ تھا جیسا ہم مسلمانوں کو ہے

اُن قوموں نے خواہ برضا و رغبت ہو خواہ بجبر و اکراہ اس نئے سویلزیشن کی طرز معیشت و طریق معاملت کو اختیار کرلیا ہے اور اختیار کرتے جاتے ہیں مگر ہم مسلمان لوگ اس وقت تک اُس کے مصالح پر مطلع نہیں ہوئے اور اگر مطلع ہوئے ہیں تو اپنے قدیم جادہ سے قدم باہر نکالنے میں اکراہ کرتے ہیں اور اُس کی مداخلت کو روکتے ہیں زیادہ تر یہ دقت پیش آئی ہے کہ اس طرز معیشت و طریق معاملت کے ایک جزو نے ہماری قوم میں طوعاً و کرہاً کسی قدر اپنا سکہ جما دیا ہے مگر ایک جزو کی مداخلت کو ہم ابتک روک رہے ہیں - اور اسی کشمکش نے ہمکو موجودہ مشکلوں میں ڈال رکھا ہے -

ایک چھوٹی سی مثال اس کی یہ ہے کہ ہم ریل پر سوار ہوتے ہیں مگر ابھی تک ایسے لوگ ہم میں موجود ہیں جو کہ پابندی اوقات میں اپنی قدیم طرز معاشرت کی تقلید کرنے پر عادتاً مجبور ہیں اور اس کی وجہ سے نقصان اُٹھاتے ہیں ایک دوسری مثال یہ ہے کہ ہم سرکاری نوکریاں تلاش کرتے ہیں - مل جائیں تو خوشی سے قبول کرتے ہیں مگر سرکاری نوکری کے لوازم کے حصول سے ابتک جی چراتے ہیں اور اس پر نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں -

پس اول فرض ہمارا یہ ہے کہ اس نئے سویلزیشن و طریق تمدن کیواسطے جو طرز معیشت و طریق معاملت لازم ہے اس کو ہم بطوع و رغبت قبول کریں بلکہ پورے طور سے اُسے اختیار کرنے میں کوشش کریں - قدیم زمانہ میں عموماً

قدیم زمانہ میں عموماً شرفا کے لڑکے فنونِ سپہگری کی تعلیم پاتے تھے اور جن لوگوں کو علم کا شوق ہوتا تھا وہ محض علوم دین اور اُس کے مبادی کی تحصیل میں اپنی عمر صرف کرتے تھے علم کو دنیوی معاملات میں مداخلت نہ تھی اور اگر تھی تو بہت ہی قلیل و ضعیف جو کہ ایک فلسفی جویائے اسباب و علل کے نزدیک قابلِ اعتنا نہیں ہے اب حالت یہ ہے کہ معاملات دنیا کے امضا میں علم کو پوری مداخلت ہے حال کے طریقہ معاشرت و اسباب معیشت علمی نتائج پر مبنی ہیں۔ علوم عقلیہ و استقرائیہ نے ایک انقلابِ عظیم تمدن میں پیدا کر دیا ہے یہاں تک کہ کوئی فرد بشر اپنی زندگانی سے پورا تمتع حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اپنی روحانی و جسمانی قوتوں سے پورے طور پر کام لے سکتا ہے الا بذریعۂ علم۔ حتیٰ کہ سپہگری کا فن جو ہمارے قدیم تجربہ کے موافق علم سے بہت دور بلکہ علم کا ضد تھا، اب دارو مدار اُس کا بھی علم پر ہے۔ تمام کاروبار تجارت و بیع و شرا۔ تمام حرفت و صنعت کے کام مبادی علمیہ پر محول ہیں عدالتوں کے اندر فصلِ خصومات اور کلکٹریوں میں مالگزاری کا رتق و فتق علم کا محتاج ہے۔ اخلاق و تمدن کا معیار بہت بڑھ گیا ہے اور اس معیار میں کامل عیار نکلنے کیلئے تعلیم جدید کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کی تعلیم ہمکو کیونکر دستیاب ہو سکتی ہے۔ اور اس کے حاصل کرنیکیلئے ہم کو کیا تدبیریں عمل میں لانی چاہئیں؟

حضرات ایک مرتبہ جاپان کے ایک جنگی جہاز پر میرا گذر ہوا جس کا

ناؤخدا ایک بڑا لائق اور ذی علم اور جہاندیدہ سردار تھا۔ یہ شخص میرے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آیا اور تمام مراتب خاطر و مدارات ادا کئے اثنائے گفتگو میں جب میں نے جاپان کی ترقی کی مدح کی اور یہ کہا کہ جاپان نے ایک قدیم مسلمہ مسئلہ کی بین تکذیب عملی طور پر کردی ہے کہ کوئی قوم ایک دہلہ میں اور دفعۃً ترقی نہیں کرسکتی، بلکہ ترقی رفتہ رفتہ ہوتی ہے۔ ناؤخدا نے جواب دیا کہ بلاشک ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی قوم کو جہل و تاریکی کی حالت سے باہر نکالیں اور علم و شائستگی کے نور سے منور کریں مگر یہ ایک بہت مشکل اور دقت طلب کام ہے اور عوائق اور موانع ہماری راہ میں بیشمار ہیں مگر تمھاری حالت بہت رشک کے قابل ہے کہ تم کو غیب سے ایک عمدہ معلم ملگیا ہے جو بلا زحمت تمھارے تم کو تعلیم دے رہا ہے۔

حضرات۔ اس سردار جاپانی نے شاید کسی قدر طنز کی راہ سے یہ لطیفہ کہا ہو مگر میں اس کو بیانِ واقع سمجھتا ہوں اور نہایت تشکر و امتنان کیساتھ اعتراف کرتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ ہر مسلمان تہِ دل سے اعتراف کریگا کہ آج جس طرح حکومتِ برطانیہ نے ہمارے واسطے تعلیم کی راہیں آسان کردی ہیں یہ آسانی ہم کو کبھی نصیب نہ تھی (چیرز) اگر رحمتِ الٰہی ہم کو ہماری طائفۃ الملوکی کی حالت سے جس کا مختصر اور دلچسپ بیان سردار محمد حیات خان بہادر کی فصیح تقریر میں ہم سن چکے ہیں نکالکر زیر سایۂ عاطفت حکومت

برطانیہ جائے نہ دیتی تو کبھی ہم کو یہ نعمت حاصل نہ ہوتی معلوم نہیں ہے کہ کیا کیا
آفتیں ہمارے آگے آتیں اور کیا کیا مصیبتیں ہم کو برداشت کرنی پڑتیں بلکہ عجب
نہیں ہے کہ وہ خوفناک اور پرہول زمانہ ہم کو تباہ بلکہ نیست و نابود کرڈالتا پس
ہم کو بخوشی و تفخر اس جاپانی سردار کے قول کا اعتراف کرنا چاہیئے اور خدا کا
ہزار ہزار شکر کرنا چاہیئے کہ خدا نے ہمارے لئے ایک معلمِ شفیق بھیج دیا ہے (چیئرز)
میں ہرگز ان مسلمانوں کی شکایت و زارنالے میں شریک نہیں ہوں جو ہندوستان
کے بعض معاملات میں گورنمنٹ پر دوسری قوموں کی جانب داری کرنے کا
الزام لگاتے ہیں واقع میں اُن کو جانب داری کی شکایت نہیں ہے بلکہ وہ
اس بات سے ناراض ہیں کہ گورنمنٹ اپنی تمام رعایا کو ایک نظر سے دیکھتی
ہے۔ اُن کا اصل مطلب یہ ہے کہ سرکار مسلمانوں کے ساتھ ناجائز رعایتیں ملحوظ
رکھے جو ایک ذیشان و عادل حکومت کی ذات سے بہت بعید ہے اور میں
اُمید کرتا ہوں کہ تمام عالی ہمت مسلمان جو اس مجمع میں حاضر ہیں میرے ہمزبان
ہوں گے کہ جیسا ناجائز رعایتوں کا برتنا سرکار کی شان سے بعید ہے اُسیقدر
ہماری شان سے بھی بعید ہے کہ ہم ایسی رعایتوں کے متوقع ہوں۔
مگر حضرات جو ذرائع تعلیم کے گورنمنٹ نے ہمارے واسطے مہیا کرائے ہیں
وہ سب سرکاری ذرایع ہیں اور کوئی حاکم قوم کبھی کسی محکوم غیر قوم کے قومی
مقاصد کو خواہ اُس قوم کی خاطر حکام کو کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو پورا نہیں کرسکتی

سرکار انہیں مقاصد پر نظر ڈال سکتی ہے جو تمام اقوام محکومہ میں مشترک ہیں اور
ہر عالی دماغ اور تجربہ کار شخص جانتا ہے کہ بغیر قومی تعلیم کے محض عام تعلیم جس میں
قومی مقاصد ملحوظ نہوں ہم مسلمانوں کے واسطے بے سود ہی نہیں بلکہ مضرت
بخش ہے کیونکہ ہم مسلمانوں میں قومیت اگر ہے تو ایک مذہب کی بنا پر ہے۔
ورنہ ہمارے گروہ میں کوئی عرب ہے کوئی مغل ہے کوئی ایرانی ہے کوئی
رومی ہے کوئی روہیلہ ہے کوئی پٹھان ہے کوئی نومسلم ہے، غرض مختلف اصناف
انسان سے ہماری قوم مرکب ہے اور رشتہ اور رابطہ ہم میں ہے تو بس یہی حبل المتین
ایمان ہے پس ہم دین محمدی اور اخلاقِ محمدی سے علیحدہ ہو کر قومی حالت میں
زندہ نہیں رہ سکتے اور صورتِ مجموعی اہل اسلام کا تحفظ نہیں کر سکتے (چیرز)
سرکاری مدارس بلاشبہ بہت عمدہ ہیں اور تمام ہندوستان اُن سے مستفید
ہوتا ہے۔ میری مجال تقریر سے باہر ہے کہ میں سرکاری مدارس کی ہجو کروں یا
اُن کو برا کہوں میں خود سرکاری مدارس میں تعلیم پاچکا ہوں اور اُن کی برکت کا
شکرگزار ہوں مگر شاید کوئی شخص مجھ سے زیادہ تر جوش کے ساتھ اس امر کا اعتراف
نہ کرے گا کہ سرکاری مدارس کی تعلیم ہمارے واسطے عموماً اگر مضر نہیں تو ناکافی
ضرور ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں اور اثنائے مجالس کانفرنس میں بعض مقرروں کی
زبان سے بیان میں بھی آچکا ہے کہ محض انگریزی تعلیم کا جو سرکاری مدارس میں
حاصل ہوتی ہے۔ اکثر ضعیف طبائع کے مذہبی خیالات پر کس قدر برا اثر پڑتا ہے

سرکاری مدارس کا تعلیم یافتہ اکثر تمام اُس ذخیرہ حکایات و روایات قومی و مذہبی سے
جو ایک مسلمان لڑکا اپنے گھر کی عورتوں اور مردوں سے ایامِ طفولیت میں
سُنا کرتا ہے اور یاد رکھتا ہے اور جن کا بڑا اثر خاص ہماری قومی اخلاق پر مترتب
ہوتا ہے محض بے بہرہ ہے۔

توحید و رسالت سے واقف بیشک ہوتا ہے۔ مگر منزلہ اسم بلا عین ایمان
اس کا محض ایک قالب بے جان ہوا کرتا ہے روزہ نماز کی پابندی سے جو
ایک عام شعار اہلِ اسلام کا ہے دور ہوتا ہے اور اوامر و نواہی سے بالکل
ناواقف نہ ہو تو اس قدر ضرور ہوتا ہے کہ اوامر و نواہی کو مہتم بالشان نہیں
سمجھتا مسلمانوں کی تاریخ قصص انبیا، سیرۃ جناب رسولِ مقبول۔ سیرۃ خلفا و
ائمہ اطہار سے بالکل نابلد ہوتا ہے اور گو تاریخ انگلستان کے تمام واقعات
اس کو بخوبی یاد ہوں، بلکہ یورپ کی عام تاریخ پر بھی اُس کو اطلاع ہو، پر اپنے
گھر کے حالات سے وہ بالکل ناواقف ہوتا ہے اخلاق کی درستی کی طرف
مطلق توجہ نہیں ہوتی اور ہوتی ہے تو بالکل بے اثر توجہ ہوتی ہے جس کا
کوئی مفاد نہیں آزادی کے غلط اور تکلیف دہ خیالات نوجوانوں کے دلوں
میں پیدا ہوتے ہیں جو اُس سچی حُرّیت سے بہت بعید ہیں جس کی قدر
ہمارا قدیم لٹریچر اور نیز یورپ کا لیٹریچر ہم کو سکھاتا ہے اور جس کا بڑا زیور سلاسل اخلاق
و قیود تمدنی و فرائض منصبی ہے اس سے بھی قطع نظر کیجئے تعلیم سے غرض

یہ نہیں ہے کہ چند کتابوں کے مضامین یاد ہو جائیں یا چند ہندسی سوالوں کے حل کرنیکی قوت پیدا ہو جائے۔ بلکہ سچی تعلیم وہی ہے جس سے طبیعت میں صلاحیتِ تمیزِ حق و باطل پیدا ہو۔ واقعاتِ روزمرہ سے صحیح نتایج نکالنے کی قابلیت حاصل ہو۔ نفس کی تمام قوتوں کو صیقل اور جلا ہو۔ گزشتہ قرنوں کے عمدہ خیالات پر اطلاع ہو اور اُن خیالات کو معیشت روزمرہ میں صرف کرنیکی اور اُن سے کام لینے کی استعداد اور ترقی روحانی و کسبِ کمالِ نفسانی کے میدان میں ہر روز ایک قدم آگے بڑھکر رکھنے کا جوش و ولولہ پیدا ہو۔ معاملاتِ روزمرہ میں خلوص غرض اور باہمی تمدن میں دوسروں کے حقوق کا تحفظ اپنے ذاتی اغراض پر عام مصالح کو ترجیح دینا اور ہر خاص و عام سے حفظِ مراتب کے ساتھ پیش آنا۔ یہ سب نتیجے عمدہ تعلیم کے ہیں اور یہی صفات ہیں جن سے انسان انسان کہلاتا ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ صفات سرکاری مدارس کی تعلیم سے پیدا ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں سرکاری مدارس کی تعلیم کی غرض و غایت یہ ہوا کرتی ہے کہ چند مقررہ امتحانوں میں کامیابی حاصل ہو۔ امتحان دینے کا ایک محدود راستہ ہے اور جو لوگ فقط اسی غرض کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اُن کی نگاہ دائیں بائیں نہیں پڑتی ہے اور سوائے اس بال سے باریک لکیر کے کوئی دوسری شئے اُن کو دکھائی نہیں دیتی ہے امتحان میں کامیابی حاصل کرنیکے

تدبیروں میں اُن کو ایسا انہماک ہوتا ہے کہ اُن کے قوائے روحانی و جسمانی کو اور کسی قسم کی ریاضت کا موقع نہیں ملتا نوٹوں کا رٹنا اور خلاصوں کا یاد کرنا اُن کا دائمی شغل ہوتا ہے استادوں اور ذی علم لوگوں کی صحبت اُن کو میسر نہیں ہوتی اور نہ وہ خود اس کے جویا ہوتے ہیں۔ قیود تربیت یعنی ڈسپلن سے وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں اور رفتار اُن کی مثل شتر بے مہار ڈانوا ڈول ہوا کرتی ہے پس آپ کیونکر تعجب کر سکتے ہیں اگر ایسی تعلیم کا علمی نتیجہ محدود و تنگ اور اخلاقی نتیجہ مذموم و ناپسندیدہ ہو۔

انگریز لوگوں سے اکثر شکایت سننے میں آئی ہے کہ کالجوں کے گراجویٹ آدابِ صحبت سے ناواقف ہوتے ہیں اُن سے ہمکلام ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی معمولی مباحثِ روزمرہ میں اُن کے معلومات ایسے محدود ہوتے ہیں کہ اُن پر ایک صاحبِ فہم کی طرح گفتگو نہیں کر سکتے۔ کتابوں کا ذکر مذاکرہ خصوصًا درسی کتابوں کا تو کر لیتے ہیں۔ گو اس دائرہ میں بھی اُن کی تقریریں مستعار اور مسروق ہوتی ہیں باقی خیر۔ اپنے ملک کے پولٹیکل بلکہ سوشیل اُمور سے بھی ناواقف ہوتے ہیں اور اگر اُن پر نظر بھی ڈالتے ہیں تو اُسی رنگ کی عینک لگا کر جس میں وہ خود رنگے ہوئے ہیں اور رائے قائم کرنے میں کبھی ذمہ داری کا لحاظ اور تفحص علل و اسباب کی پابندی نہیں کرتے اور سکینہ و وقار سے عاری اور تہذیبِ اخلاق سے خالی ہوتے

ہیں بخلاف ان کے ہمارے قدیم طریقہ کے تعلیم یافتہ لوگ جو انگریزی سے بے بہرہ ہیں ان عیوب سے پاک ہوتے ہیں اور گو دائرۂ معلومات اُن کا کتابی مباحث کے متعلق تنگ و محدود اور پُرانے فیشن کا ہو مگر معاملات روز مرہ اور حالاتِ مقامی پر اُن کی اطلاع وسیع اور روش اُن کی باوقار اور رفتار اُن کی مردانہ ہوا کرتی ہے۔ حاشا میں نہیں کہتا ہوں کہ یہ سب الزامات صحیح ہیں اور اس لئے میں آپ سے ملتجی ہوں کہ آپ لوگ ایک لحظہ کیلئے بھی گمان نہ فرمائیں کہ میں سرکاری مدارس کو نام رکھتا ہوں یا اُن کی ہجو کرتا ہوں مدارس سرکاری بہت عمدہ ہیں اور اُن میں مدرسین و پروفیسر لوگ بہت اعلیٰ لیاقت کے مقرر ہوتے ہیں اور بڑی خوبی کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں اور نہ میں طلبہ کو قصوروار قرار دیتا ہوں۔ دیکھئے کتنے ہی ہندو مسلمان مدارس سرکاری کے نکلے ہوئے موجود ہیں جو ہر طرح کے جوہر ذاتی و علمی سے آراستہ ہیں دیکھئے بعض بنگالی صاحبوں نے جن پر ملک کو فخر کرنا چاہئے کس قدر نام آوری میدان تصنیف و تحقیق میں پیدا کی ہے۔ میرا مقولہ فقط یہ ہے کہ جس طریقہ اور جن اصول تعلیم کے اختیار کرنے پر مدارس سرکاری مجبور ہیں وہ ہمارے قومی مقاصد کیواسطے بالکل ناکافی ہیں خصوصًا مسلمانوں کو اس سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہے الا ماشاءاللہ پس اگر مسلمانوں نے عمومًا اس وقت تک مدارس سرکاری سے کنارہ کیا

اور اُن سے زیادہ مستفید نہ ہوئے تو کچھ تعجب یا افسوس کا مقام نہیں ہے۔
ایک ایسی تعلیم سے جو قومی زندگانی کی برہم زن ہے کنارہ ہی بہتر ہے یہی
سبب ہے کہ مسلمانوں میں خود بخود طبعی طور پر اپنے تحفظ قومی کی
فکر نے ایک قومی محرک بنکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانیکا خیال پیدا کر دیا
اور جیسا کہ اس عالم اسباب میں دستور معمول ہے خداوند عالم نے اس خیال کو
مجسم کرکے ہمارے بڑے پیارے سید کو پیدا کر دیا اور قرعۂ فال اُن کے نام
پھینکا (چیرز)

حضرات۔ آپ ہم سے نہ پوچھئے کہ یہ خیال سرسید کے ذہن میں کیونکر پیدا ہوا
میں خود حیران ہوں سید صاحب اس نسل اور اس جگٹ کے لوگوں میں
نہیں ہیں کہ پاکی کھی ہیں یا رائے پتھورا کے وقت کے لوگوں میں ہیں اگر
تو ہم اگر کسی مسجد کے زیر سایہ تسبیح ہاتھ میں لئے اللہ اللہ کرتے ہوئے دیکھتے تو
حیرت کی جا نہ تھی یہ ہم خراباتیوں میں کیونکر آملے (چیرز) اور طرفہ یہ ہے کہ بقول
نواب محسن الملک بہادر گالیاں سنتے ہیں اور اُس پر بھی باز نہیں آتے اپنی بک
بکے جاتے ہیں (چیرز و قہقہہ)

حضرات سچ پوچھئے تو میرے نزدیک خدا کو منظور تھا کہ ہماری قوم کچھ
دنوں اور زندہ رہے اس واسطے اس نے سید کے سینہ کا گنجینہ درد سے
بھر کر ہماری پیشوائی اور رہنمائی کیواسطے بھیجدیا (چیرز) اور اس ایک شخص نے

اپنی عمر قوم کی خدمت کیلئے وقف کر کے ہمارے واسطے نہ فقط ایک ذریعہ عمدہ قومی تعلیم کا پیدا کیا۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ تر قابلِ قدر یہ کام کیا کہ اُن خیالات کو جن سے اُن کا دل بھرا ہوا تھا قوم میں پھیلا دیا اور بہتیرے لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ یہاں تک کہ مخالفین بھی جو تعصب و جہالت کے تاریکی میں مبتلا تھے اس نئے عالم کی روشنی سے منور ہو گئے (چیرز)

اب آمدم بر سر مطلب تعلیم کی ضرورتیں میں بیان کر چکا ہوں اب اُن ضرورتوں کے حاصل کرنیکے واسطے جن اسباب کا مہیا ہونا ضرور ہے اُن پر آپ کو متوجہ کرتا ہوں۔ اس قسم کی تعلیم کے واسطے جس کے ہم خواہاں ہیں اسباب و ذرایع کا مہیا کرنا گورنمنٹ کے احاطۂ امکان سے بالکل باہر ہے اور نہ میرے نزدیک یہ کام گورنمنٹ کے فرائض میں داخل ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے پر مستعد ہوں کہ اگر گورنمنٹ اسی قسم کی خاص تعلیم کے ذرائع پیدا کرنے پر آمادہ بھی ہو تو ہم اُس کی مداخلت کو مداخلت بیجا ہی کہیں گے۔ یہ ہمارا خانگی فرض اور ہمارے گھر کا کام ہے اس کو ہم ہی خوب انجام دے سکتے ہیں۔ ہاں ہم گورنمنٹ سے حمایتِ مربیانہ و ہمدردی کے بیشک مستحق اور خواستگار ہیں اور ہم کو پوری توقع ہے کہ یہ ہمکو ہمیشہ ملتی رہے گی۔

اول چیز جس کی ہم کو ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ایمان و عقائد کی تعلیم کا پورا تشفی بخش بندوبست ہو جائے اور اُس کے واسطے نہ فقط مدرس اور معلم

مقرر ہوں بلکہ سخت نگرانی کے ساتھ عملی طور پر اُس کو نافذ کیا جائے۔

دوسری چیز تہذیب اخلاق ہے تہذیب اخلاق کے ذرائع اور تدابیر متعدد و متنوع ہیں اور اُن کا فراہم کرنا ایک لازمی امر ہے۔ آپ اُس پرانے خیال کو چھوڑئے کہ پند و نصائح کی کتابیں ازبر کرا دینے سے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ اخلاق کی درستی کیلئے عملی تعلیم درکار ہے جس کا اثر لڑکوں کی روزانہ زندگی پر پڑتا رہے اور یہ طریقہ بھی بہت نازک تدابیر کا محتاج ہے جنکو جاننے والے جانتے ہیں اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں۔

تیسری چیز تعلیم جسمانی ہے اُس کی نسبت بہت غلط خیالات مسلمانوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر نادان لوگ اس کو لہو و لعب اور تضیع اوقات سمجھتے ہیں اور نہیں دیکھتے ہیں کہ ہمارے خالق نے ہمارے اس کالبد کو ذریعہ ہماری روحانی تعلیم کا گردانا ہے اور جسم کی صحت و سقامت کو ہماری روحانی حالت میں پوری مداخلت عطا فرمائی ہے مگر چونکہ یہ ایک طویل بحث ہے اور میں آج آپ کے سامنے لکچر دینے کی غرض سے حاضر نہیں ہوا ہوں اس واسطے اسکی زیادہ تفصیل کرنے سے مقصر ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ وہ مردانگی، وہ حریت، وہ خودداری وہ ہمت، جو ہمارے اعلیٰ مقاصد میں شامل ہے ہرگز بغیر تعلیم جسمانی کے حاصل نہیں ہوسکتی اور خود علم کی تحصیل اور ذہن کی جولانی بھی تعلیم جسمانی کے ساتھ مثل لازم و ملزوم کے منضم و متعلق ہے۔

چوتھی ضرورت اس تعلیم کیلئے ایسے استادوں اور پروفیسروں کا پیدا کرنا ہے جو ہمارے مقاصد پر مطلع ہو کر ان کے حاصل کرانیمیں سعی کریں۔ حضرات یہ کام ہرگز ہرگز ایک محض مزدوری کرنیوالے شخص سے انجام نہیں پاسکتا اگر آپ چاہیں کہ جس طرح سابق زمانہ میں دو چار روپیہ کے میانجی کو دروازہ پر رکھکر لوگ اُس سے اپنی اولاد کو تعلیم دلاتے تھے اُسیطرح اب بھی کالجوں کے پڑھے ہوئے کسی لالہ بھائی یا کسی بابو صاحب کو سو پچاس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھکر اُن سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا کام لیں تو یہ خیال محال ہے۔ یورپ کی تعلیم کو یورپ ہی کے لوگ کچھ بہتر پورا کر سکتے ہیں اور وہ بھی اگر خود اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت سے آراستہ اور حسن خلق اور صفاتِ انسانیت سے پیراستہ ہوں ورنہ کیا کابل ہیں گدھے نہیں ہوتے، بڑا اگر تعلیم کی درستی کا یہ ہے کہ معلم و متعلم میں ہمدردی و موانست ہو اور اُستاد میں شفقت و محبت اور شاگرد میں سعادتمندی اور رشد کا مادہ پیدا ہو۔ ایسے اُستاد بمشکل دستیاب ہوتے ہیں اور اگر اتفاق سے دستیاب ہو گئے تو ہم کو چاہیئے کہ ہم اُن کو اپنی آنکھوں سے زیادہ عزیز رکھیں اور اُن کی خدمتگزاری کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

پانچویں ضرورت۔ اور لازمہ اس تعلیم کا یہ ہے کہ طلبہ کا سارا وقت وہ وقت جو کلاس یعنی جماعت میں صرف ہوتا ہے اور نیز وہ وقت جو کھانے پینے یا کھیلنے کودنے میں صرف ہوتا ہے سب پر اُستادوں کی نگرانی اور نظر رہے تاکہ

اُن کے طبایع اور اخلاق و عادات پر اُن کی صحبت و تعلیم کا پورا اثر پڑے اور
یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی الا بورڈنگ ہوس میں۔ پس بورڈنگ ہوس کا
وجود نہ فقط اُن طلبہ کیواسطے ہی ضرور ہے جو دور دراز مقاموں سے تعلیم
کیواسطے آتے ہیں بلکہ اُن کے واسطے بھی اسیقدر ضروری ہے جو مدرسہ کے
قرب و جوار کے رہنے والے ہیں۔ اگرچہ میں نے تعلیمی ضرورتوں کو بہت مختصر
طور پر بیان کیا ہے اور واقعی آپ کے آگے زیادہ تفصیل کرنا "حکمت بہ لقمان
آموختن" ہے مگر اس مختصر سے بھی ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ تعلیمی خیالات کو
عمل میں لانیکے لئے کیا کیا سامان اور کس قدر صرف کثیر درکار ہے۔ مدرستہ العلوم
کی موجودہ حالت بیشک بہت غنیمت ہے مگر اُن کالجوں کے مقابلہ میں جو
اس قسم کی تعلیم کیواسطے بکثرت انگلنڈ کی یونیورسٹیوں میں صدہا سال سے
موجود ہیں۔ مدرستہ العلوم کے مکانات اور مدرستہ العلوم کی آمدنی بالکل بے حقیقت ہے
اور جو کچھ کہ اس وقت موجود ہے اُس کو بھی بغیر زیادہ امداد اور اعانتِ مالی کے
دوام و استقلال حاصل ہونیکی کوئی صورت نہیں ہے جو کچھ فیاضانہ اعانتِ مالی
بعض اعوان اور انصار مدرسہ خصوصًا والیان ریاست سے اور سب سے
زیادہ سرکار دولت مدار آصفیہ خلد اللہ ملکہٗ سے ملی ہے وہ بیشک بے بہا
اور شکر کے قابل ہے (چیرز) مگر جیسا کہ میں اوپر عرض کرچکا ہوں تکمیل و استحکام
بنائے مدرسہ کیلئے کافی نہیں ہے۔ قصہ مختصر کمیت اعانت میں قصور ہونیسے

میری یہی غرض تھی جو اوپر بیان ہو چکی کیفیت اعانت کی بابتہ صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ تمام ہندوستان کے مسلمان اگر سال میں ایک پائی فی کس کے حساب سے سالانہ مدد کریں تو سال کے تین لاکھ روپیہ سے زائد ہوتے ہیں اور اگر کل نہیں بلکہ فقط ایک عشر مسلمانانِ ہند اس حساب سے چندہ دیا کریں تو بھی سال میں تیس ہزار کی آمدنی مدرسۃ العلوم کیواسطے مہیا ہوسکتی ہے اگر یہ بھی امرِ محال خیال کیا جائے تو فقط اُن لوگوں کو محسوب کیجئے جو تعلیم کی قدر سے واقف ہیں اور فرض کر لیجئے کہ اُن کی تعداد فیصدی ایک سے زیادہ نہیں ہے تو بھی ہندوستان کی آبادی میں اُن کا شمار چھ لاکھ ہے اور اگر فی کس ایک پائی ماہانہ سے بھی یہ لوگ مدد کریں تو سالانہ تین ہزار روپیہ کی آمدنی مدرسۃ العلوم کیواسطے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس تخمینہ سے ظاہر ہے کہ اگر ہماری قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہو تو اُس کے آگے مدرسۃ العلوم کو زکبی اور اٹین اور بلیبل اور ٹرنٹی کے ہم پلہ بنا دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ پس معدودے چند رؤساء و بزرگانِ قوم کا ایک معتدبہ رقم سے مدد کرنا گو اُن کی فیاضی کا گواہ ہو، پر قوم کے ہوشیار اور متنبّہ ہونے کی شہادت نہیں دیتا۔

حضرات - ہم کو اگر اُمید ہے تو اس کانفرنس سے اُمید ہے کہ ہر سال قوم کے محبوں کا مجمع اس کی بدولت ہوتا ہے اور مختلف حصص و نواحی ملک کے تعلیم یافتہ باشندوں کو ایک دوسرے کے خیالات پر اطلاع اور

اور اُن سے استفادہ کا موقع ملتا ہے ایک ایک سے اپنا درد کہتا ہے اور سنتا ہے اور ہر رکن وممبر کانفرنس سے واپسی کے بعد اپنے وطنِ مالوف یا مسکنِ عاریہ میں ایک بڑا مرکز ان خیالات کی اشاعت کا قرار پاتا ہے اور بیشمار لوگ مقاصدِ تعلیم سے واقف اور اُس کی ضرورت سے آگاہ ہوتے ہیں اگر میں مقاصدِ کانفرنس کی دریافت کرنے میں سخت غلطی نہیں کرتا ہوں تو سب سے بڑا منصب اس کا دعوت ہے یعنی یہ کانفرنس ایک مشنری گردہ کے مثل ہے جن میں سے ہر معنی فہم اور کارکن فرد ایک داعی اور ایک واعظ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرات۔ اس تین دن کے عرصہ میں ہم نے اپنے بعض معزز اور دردمند اور لائق ارا کین کانفرنس کی زبان سے پراثر تقریریں سنی ہیں جن میں بعض نے کانفرنس پر مشفقانہ اعتراضات کئے ہیں اور بعضوں نے اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے اصل یہ ہے کہ کوئی مہتم بالشان قومی کام اس قسم کا کبھی آغاز نہیں ہوا جس میں جزئی غلطیاں یا نقص نہ پائے جائیں۔ یہ غلطیاں قابلِ اعتنا نہیں ہیں اس وقت تک کہ جس وقت تک اس قومی تحریک میں اُس کی حرارتِ غریزی تند اور پرجوش ہو یہی ایک اصلی معیار اس کے جانداری کا ہے اور اسی سے اُس کے آئندہ کارآمد ہونیکا تخمینہ کرسکتے ہیں۔

حضرات - جہاں تک میری نگاہ کام کرسکتی ہے میں اس مجلس کی اس تحریک کو پرجوش اور نوجوان پاتا ہوں (چیرز) جس تحریک میں دس برس کی زندگانی کے بعد بھی اس قدر حرارتِ غریزی باقی ہو بلکہ ہر سال اُس حرارتِ غریزی میں تندی اور جوش زیادہ ہوتا جائے جیسا کہ کانفرنس کے مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے ہم اس تحریک کو مردہ کیا مریض بھی نہیں کہہ سکتے (چیرز بلند آوازسے) میرے نزدیک اگر کانفرنس نے کوئی عملی کام نہ کیا ہو اور آئندہ نہ کرے تو بھی فقط اشاعت و دعوت اور دوسری تبلیغی فرائض جو کانفرنس سے ادا ہوتے ہیں اُس کی محمودیت اور مقبولیت پر شاہد و گواہ ہیں (چیرز)

حضرات - ہماری شرع ہم کو حکم فرماتی ہے کہ نماز پنجگانہ ہم پر واجب ہے اس کے بعد حکم کرتی ہے کہ اگر ہوسکے تو جماعت سے ادا کرو۔ اُس سے اولیٰ یہ ہے کہ محلہ کی مسجد میں ادا کرو۔ اُس سے بھی اولیٰ یہ ہے کہ شہر کی جامع میں ادا کرو عیدین کی نماز سال میں دو بار عیدگاہ میں جا کر عام جماعت کے ساتھ ادا کرو اس کے علاوہ عمر بھر میں بشرطِ استطاعت کم سے کم ایک مرتبہ حرم محترم کعبہ میں ادا کرو۔ کیا یہ احکام مصالح سے خالی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اِن میں جو روحانی مصالح پوشیدہ ہیں اُن سے اس وقت قطع نظر کیا جائے تو ہر عقل و تیقہ رس پر واضح ہوگا کہ اِن احکام میں تمدنی اخلاقی قومی مصالح بیشمار بھرے ہوئے ہیں

جو محتاج بیان نہیں ہیں (چیرز) جو ملت کہ ایک خاص ملک و قوم کے ساتھ مختص نہ ہو بلکہ اُس کی برکات تمام عالم کے احمر و اصفر و اسود سب پر عام ہوں۔ اُس کی پیرو اُمت میں ہمدردی و یگانگی پیدا کرنیکی اس سے بڑھکر کیا تدبیر ہو سکتی ہے کہ وہ باوقاتِ معین باہم ملا کریں اور ایک دوسرے کے شریک حال ہوا کریں اور اپنے خیالات اُن مقاصد و حوائج کے متعلق جو مابین اُن کے مشترک ہیں باہم ظاہر کیا کریں پس کیا ہم مسلمانوں کو لازم نہیں کہ محبوب شارع کے ارادہ کی تائید میں جہانتک ہوسکے اپنی قوم میں بے غرضانہ ملاقات کے ذرایع کو توسیع دیں؟ اور کیا اس سے بہتر کوئی طریقہ اپنے قومی اغراض کے حاصل کرنیکا مل سکتا ہے؟ (چیرز)

مگر حضرات میں کیونکر کہوں کہ کانفرنس نے کوئی کام نہیں کیا یا اُس سے قوم نے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا جب میں اس پنڈال کو دیکھتا ہوں جو شرفا و اعزہ اہل اسلام کی متبرک صورتوں سے مثل ایک قومی البم کے آراستہ ہے اور ہر صورت کو اُس میں سے کانفرنس کی کارروائیوں کو سننے کے واسطے ہمہ تن گوش پاتا ہوں تو مجھے بے انتہا حیرت اور خوشی ہوتی ہے جسکو میں بیان نہیں کرسکتا (چیرز) فی الواقع اگر آپ لوگوں کی محبت آپ کی شفقت مجھکو کشاں کشاں پندرہ سو میل کے فاصلے سے یہاں تک نہ لائی ہوتی تو مجھے کبھی باور نہ ہوتا کہ ہم مسلمانوں میں بھی اس قدر ترقی اس قلیل

عرصہ میں ہوئی ہے جس کا یہ مجمع ایک عمدہ نمونہ ہے (چیرز) چوبیس برس کے آگے جبکہ میں نے اپنے وطن مالوف سے مہاجرت کی ہے اس قسم کا کوئی مجمع مسلمانوں کا جس کے اغراض میں فقط قومی مقاصد شامل ہوں اور کوئی حاکم وقت اُس کا محرک نہ ہو ایک امر محال تھا۔ اب یہ دل خوش کن ترقی جس کے بین آثار وامارات آج میں برای العین دیکھتا ہوں مجھے حیرت میں ڈالتی ہے اور پھر مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس ترقی کا محرک اور اُس کا بانی وہی ایک ذات ہے جس کے کالبد خستہ و سال خوردہ کو اپنے سامنے زینت بخش مجلس پاتا ہوں (چیرز) بلاشک یہ اُسی شخص کا اور اُن کے اعوان و انصار کا طفیل ہے کہ نہ فقط مدرسۃ العلوم علی گڈھ کا صدقہ جاریہ و فیض روز افزوں ہم کو چار سو پھیلتا نظر آتا ہے، بلکہ یہ اُنہیں کے پُر اثر نصیحت اور پر اثر خیالات کی تحریک ہے جس نے اس عظیم الشان مجلس مجتمعہ کی مستحکم بنا ڈالی ہے جس کا نام نیشنل محمڈن اینگلو اورنٹیل کانفرنس ہے (چیرز متواترا اور بلند آوازسے) حضرات۔ اور کوئی جو چاہے سو کہے میں تو مدرسۃ العلوم مسلمانان اور اس کانفرنس کو جدا نہیں سمجھتا میرے نزدیک تو یہ دونوں ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی بہار کے پھول ہیں۔ اس کانفرنس کی مثال ایسی ہے جیسے نماز میں اذاں جس میں ہم دعوت و ہم اعلان مرکوز ہے۔ ہماری ساری قوتوں اور ساری کوششوں کا نتیجہ فقط ایک اس بات پر آرہا ہے کہ کسی طرح اس تعلیم کو جس کی بنا علی گڈھ میں ڈالی گئی ہے انجام کو پہونچائیں۔ جا دسے کیسے ہی مختلف

ہوں۔ منزل مقصود ایک ہی ہے۔

حضرات! تعلیم نے اس زمانہ میں ایک فن کی حیثیت پیدا کی ہے اور کیا بحیثیت انتظام اور کیا بحیثیت نشر و اشاعت بہت ہی مشکل و دشوار ہو گیا ہے۔ مگر میرے حقیر تجربہ میں سب سے بڑا عائق و سد راہ اشاعت تعلیم و انتظام تعلیم کا یہ ہے کہ ہر کس و ناکس جو چند درسی کتابیں پڑھ گیا ہے اپنے آپ کو اس مسئلہ میں صائب الرائے اور اس فن میں حاذق تصور کرتا ہے اور دخیل ہونا چاہتا ہے مجھے امید ہے کہ مدرسۃ العلوم کے بھی خواہ اس غلطی سے بچتے رہیں گے اور عملی کاموں کو تعلیم کے ہمیشہ اُن کارپردازان و پروفیسران مدرسہ کی رائے پر محول رکھیں گے جو فن تعلیم میں ماہر ہیں اور جنھوں نے اپنی عمر اس کام میں صرف کی ہے۔

دوسری ایک اور دقت یہ ہے کہ ہر سال یورپ کے ممالک میں خصوصاً جرمنی اور انگلینڈ میں نئے نئے طریقے نئے نئے اصول نئی نئی تدبیریں اور وسیلے بچوں کو تعلیم دینے کے ایجاد ہوتے جاتے ہیں جن پر کارپردازان تعلیم کو ہمیشہ اطلاع حاصل کرنا بہت ضرور ہے۔ عمدہ تعلیم خصوصاً خرد سال بچوں کی تعلیم بڑا دقت طلب کام ہے کیونکہ معلم کو ضرور ہے کہ ہر پہلو و جانب پر نظر رکھے اور جسم و روح میں صحیح موازنہ قائم رکھے اگر جسم کی تربیت میں حد اعتدال سے قدم باہر نکل گیا تو نقصان جانی تعلیم میں کئی نقصان رہ جائیگا بلکہ عجب نہیں ہے کہ آخر علاوہ اُن کے طبیعت میں بہیمیت کا جزو غالب ہو جائیگا

اور اخلاق و عادات پر برا اثر ظاہر ہوگا - اور اگر برعکس اس کے طبیعت پر زیادہ
بار ڈالا جائے اور روحانی حصہ کی تعلیم میں حد سے زیادہ توجہ کیجائے تو قوائے
جسمانی میں اضمحلال اور صحت بدنی میں خلل آجانیکا احتمال ہے - علاوہ اس کے
بڑا ہی دقیق مسئلہ یہ ہے کہ ابتدائے تعلیم میں کن علوم و فنون کو سکھانا چاہئے -
زبانوں کی تعلیم کس طرح دینی چاہئے اخلاق کے درستی کے کیا بہتر ذریعے ہیں
سچے خیالات مذہبی پیدا کرنیکا اور خدا کی معرفت اور انبیا اور بزرگان دین کی
محبت دل میں پیدا کرنیکا کونسا طریقہ عمدہ ہے - کس طور کی تعلیم میں وقت کم
ضایع ہوتا ہے اور تھوڑے عرصہ میں مشکلات راہ طے ہو سکتی ہیں - بادی
واقف حال پر مخفی نہیں ہے کہ عام طور پر استادوں کی تعلیم کا اثر مدرسہ کی حد تک محدود
مدرسہ سے باہر نکلنے پر تعلیم ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد تعلیم کا زمانہ شروع
ہوتا ہے جس کیلئے نہ کوئی حد معین ہے اور نہ کوئی انتہا مقرر ہے اور انسان کیلئے
یہی اصلی تعلیم ہے جو کہ تا دم مرگ ختم نہیں ہوتی مدرس اور مدرسہ کا مقصد یہ ہے کہ
پڑھنے والوں میں اس تعلیم کا مذاق پیدا کرے اور تزکیۂ نفس و تہذیب اخلاق کے
آلات و ادوات مہیا کر دے -

اب میں تین باتیں بطور نصیحت و پند محبان قوم کی خدمت میں عرض کرنا
چاہتا ہوں - گو میرا یہ منصب نہیں اور علاوہ اس کے آپ جیسے گروہ کے آگے
پند و نصیحت کا نام لینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے -

حضرات - اول امر یہ ہے کہ جو کوئی شخص کوئی کام خالصتاً للہ
اور بے آمیزش غرض اپنی قوم کی صلاح و فلاح کے واسطے کریگا بلاشک و شبہ
دنیا و آخرت میں کامیاب ہوگا اور نام نیک اُس کا تا ابد باقی رہے گا۔ ناکامی
اور خذلان فقط اُسی کیواسطے ہے جو کوئی کار خیر نام آوری اور کسی اور داعیہ
نفس کے تحریک سے کرتا ہے حکمائے اسلام نے ایک نقل لکھی ہے کہ ایک
روز ہم سادات کے مقتدا اور جد اعلی حضرت علی مرتضی کسی مجرم پر حد شرع جاری
فرمائی تھی اور اُس پر تازیانے لگ رہے تھے اس اثناء میں اُس نابکار نے
حضرت کے روئے مبارک پر تھوک دیا حضرت نے فوراً تازیانہ موقوف اور
مجرم کو آزاد کر دیا اور معترضوں کے جواب میں یہ فرمایا کہ میں اس شخص کو حکم
خدا سے سزا دیرہا تھا جب اسنے میرے ساتھ گستاخی کی تو میرا داعیہ نفس
اُس میں شامل ہوگیا اور خلوص نیت میں احتمال خلل پیدا ہوا۔ اسواسطے
میں نے اس کی سزا کو روک دیا۔ نظم

از سخنش آتش من تیز شد	کار الٰہی غرض آمیز شد
داعیہ نفس چو بنمود رو	سعی اخلاص نماند از او
کار کہ اخلاص نشد بہرہ ور	ترک چنان کار سزاوار تر

غرض میری اس حکایت کے ایراد سے یہ ہے کہ ہر قومی کام میں اخلاص
از غرض بڑا ذریعہ کامیابی ہے جس کسی قومی کام کا محرک غرض آمیز ہے

اُس کو کبھی صلاح و فلاح نہیں ہے اور گو دوسروں کو اُس سے کسی قدر نفع پہونچ جائے پر خود بانی کار کو کبھی کوئی فائدہ نہ پہنچے گا اور نہ دنیا و عقبیٰ میں اُس کا نام نیک ہو گا۔

اور اُس کے ہم پہلو (دوسرا امر) قابل یاد رکھنے کے یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے تشتت سعی و انتشار صرف ہمت سے احتراز کرنا چاہئے۔ جو کام سَو دو آدمی ملکر بآسانی انجام دیسکتے ہیں اُسی کام کو دس آدمی دس جگہ الگ الگ کرنا چاہیں تو محال ہو جاتا ہے۔ اس واسطے میرے نزدیک آپ لوگوں نے جس مہم میں قدم رکھا ہے اُس میں اِن دو امروں کو پیش نظر رکھئے یعنی خلوص نیت و جمعیت سعی انشاء اللہ آپ اپنے مقصود میں کامیاب اور دنیا و آخرت میں ماجور ہوں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم کو ہندوستان کی دوسری قوموں سے مل جلکر رہنا چاہئے ہم سب ایک بادشاہ کی رعیت اور ایک ملک کے باشندے گویا ایک دودھ کے بیٹے ہیں اور اعضائے یکدگر ہی نہیں بلکہ آپس میں بھائی بند ہیں کسی ہندی قوم کے کسی فرد کو کسی تمہم کا منصب یا ترقی حاصل ہو تو ہم کو خوش ہونا چاہئے کیونکہ وہ عین ہماری ترقی ہے اور ہر حالت میں باہم برادرانہ ہمدردی و محبت رکھنی چاہئے مصالح ملکی و قومی و حسن اخلاق دونوں اس روش و رفتار کی ہدایت کرتے ہیں اور آپ خود خوب جانتے ہیں

کہ خلق و مروت سے سنگِ خارا بھی موم ہو جاتا ہے - بڑی دانائی یہی ہے کہ آدمی دشمنوں کو دوست بنائے نہ یہ کہ بیٹھے بٹھائے دوستوں سے دشمنی کا خریدار ہو

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند	
	جوانانِ سعادتمند پندِ پیرِ دانا را

اگرچہ مجھے نہ تو دانائی کا دعویٰ ہے اور نہ پیری کا اعتراف - پر آپ سے اس قدر اُمید ہے کہ بفحوائے اُنْظُرْ اِلیٰ مَاقَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلیٰ مَنْ قَالَ آپ اِن چند نصائح پر غور فرمائیں گے اور اگر آپ غور فرمائیں گے تو شاید آپ پر ضرور منکشف ہوگا کہ اُن کا عملی اثر کس قدر دور و دراز تک پہونچتا ہے اور ہماری قومی اغراض اور قومی اصلاح میں کس حدنا محدود تک فائدہ مند مداخلت رکھتا ہے - آخر میں میری عرض یہ ہے کہ آپ کی یہ پر جوش مجلس اور آپکی مدتِ دراز کے مستقل و مستحکم مساعی ناممکن محض ہوتے اگر آپ کو ایسی عادل و معتدل حکومت نے اپنے زیر سایہ پرورش نہ کیا ہوتا - جیسی ہماری ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند خلد اللہ ملکہا و سلطنتہا کی حکومت ہے (چیرز) پس ہم کو لازم اور ضرور ہے کہ ہم اپنی مہماتِ قومی میں کبھی اس احسان کو نہ بھولیں اور اس حکومت کو قوت دینے اور اُس کے حامی و مددگار رہنے میں اور بڑے وقتوں میں اس حکومت کیواسطے اپنی جان و مال فدا کرنے میں ہرگز ہرگز دریغ نہ کریں -

میں بلا خوف و خطر کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند سے بڑھکر کوئی فرقۂ رعایا ایسا وفادار اور خیر طلب دولتِ انگلشیہ کا نہیں ہے (چیرز) اور مجھے اُمید ہے کہ مسلمان لوگ کبھی اس جادہ سے سرمو انحراف نہ کریں گے اور اپنے آپ کو محسن کش اور احسان فراموش نہ کہلائیں گے۔ میں اپنی تقریر کو اس درخواست پر ختم کرتا ہوں کہ آپ جب اپنے اوقاتِ خمسہ میں اپنی قوم اور اپنے بادشاہ اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے حق میں دعائے خیر کیا کریں تو اُس وقت مجھ غریب کو بھی اس اخیر صف میں شامل کرکے دعائے خیر سے یاد کرلیا کریں ؀

حضرات! اگر میں سنتِ بزرگانِ قوم کی تقلید کروں تو میرا فرض ہوگا کہ
میں حامیانِ کانفرنس کے آگے اپنی نااہلی اور بے بضاعتی کا اظہار کر کے معذرت
کروں اور اُن کی نوازش کا شکریہ دل و جان سے ادا کروں کہ ان کی حسنِ
عقیدت نے مجھ کو آج کے روز کرسیِ صدارت سے معزز کیا مگر حضرات آپ
تعجب نہ فرمائیں کہ بعوض معذرت و تشکر کے میں خود اس وقت حامیانِ
کانفرنس سے معذرت کا طلبگار ہوں کہ ان حضرات نے کیوں اور کس ضرورت
سے ایسے ایک ضعیف مریض بے بصارت و بے بصیرت شخص کا انتخاب
آج کی صدارت کے واسطے کیا جو نہ فقط سرکاری خدمات سے تقریباً نصف
صدی کی محنت و مشقت کے بعد وظیفہ پا چکا ہے بلکہ تمام دوسری دنیاوی
گفت و شنید و تفکرات سے بلا وظیفہ بطور خود دست کش ہو چکا ہے۔
خصوصاً جبکہ اس بے بضاعت شخص کو کبھی آج تک اس کانفرنس سے کسی
قسم کا تعلق نہیں رہا اور کانفرنس کے مقاصد و طریقِ عمل سے قطعاً بے بہرہ
بہرحال گذشت ہرچہ گذشت اب تو بغیر اس کے چارہ نہیں کہ جو کچھ

میرے ذہن ناقص میں آئے اُسے بک جاؤں اور اس مختصر خطبہ کے نقائص
کی ذمہ داری کا طوق حضراتِ حامیانِ کانفرنس کی گردنوں میں ڈالدوں
جن کی بدولت میں آج کرسئ صدارت پر جلوہ افروز نہیں غبار اندوز ہوں۔
کانفرنس کی گذشتہ کارروائی اور موجودہ تجویزوں کو کارپردازانِ کانفرنس
آپ کے سامنے پیش کریں گے کیونکہ میں اُن سے واقف نہیں ہوں۔
میں فقط چند فقرے تعلیم و تعلم کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں جس سے اتفاق
یا اختلاف سامعین کی فہم و رائے پر موقوف ہے۔

ہر ذی بشر جانتا ہے کہ آج کل تعلیم کے تین درجے قرار دئے گئے ہیں یعنی
ابتدائی متوسط اور اعلیٰ اس مرز بوم کے گذشتہ حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم
ہوگا کہ قسم اول اور قسم آخر کی تعلیم یہاں ہزارہا سال سے رائج ہے۔

ہنود کے زمانۂ حکومت میں کم کوئی باوقعت قریہ ایسا تھا جس میں خود اہل دیہ
کا بنا کردہ پاٹ شالا موجود و جاری نہ ہو۔ ان مدرسوں میں مہاجنوں اور دیگر
اہل دیہ کے لڑکے ابتدائی تعلیم پاتے تھے لکھنا پڑھنا اور ضروری حساب
سیکھتے تھے اور سارا خرچ اس گاؤں والے کرتے تھے اس قسم کے پاٹ شالے اس
وقت تک بالکل معدوم نہیں ہوئے ہیں اب بھی جا بجا دیکھنے میں آتے ہیں
جن میں پٹیل پٹواری اور دوسرے گاؤں والوں کے لڑکے گوبر سے لیپی ہوئی
زمین پر بیٹھے ہوئے تاڑ کے پتوں پر یا خود زمین پر اپنی ملکی زبان کے حروف

لکھ رہے ہیں یا پہاڑے یاد کر رہے ہیں۔

اہل اسلام کے گھروں میں اسی درجہ کے مکتب جاری تھے جن میں میانجی صاحب لڑکوں کو اردو فارسی نوشت خواند سکھاتے تھے۔ قرآن شریف پڑھاتے تھے اور ضروری مذہبی ارکان سے ان کو آشنا کرتے تھے۔ مکتب و پاٹ شالا دونوں میں لڑکوں کی عمر کے موافق سزائیں مقرر تھیں جنکی تفصیل اگرچہ نہایت دلچسپ ہے مگر بخوف طوالت ترک کرنے پر مجبور ہوں یہ تو ابتدائی تعلیم کا حال تھا انتہائی تعلیم کے مرکز تمام ہندوستان میں جا بجا موجود تھے جہاں بڑے بڑے پنڈت مشہور و معروف علما سیکڑوں طلبہ کو مفت درس دیا کرتے تھے نزدیک و دور سے طلبہ آتے تھے سالہا سال تکلیف مالا یطاق برداشت کر کے تحصیل علم کرتے تھے اور بالآخر اپنے اپنے وطنوں کو واپس جاتے تھے۔ کاشی۔ اجودھیا۔ بکرم پور۔ ندیا۔ میڈورا وغیرہ مقامات میں سیکڑوں برس سے تعلیم و تعلم جاری تھا بڑے بڑے تارک دنیا پنڈت کار خیر سمجھکر ہندو طلبہ کو سنسکرت زبان اور سنسکرت علوم و فنون خصوصاً مذہبی علوم کا درس دیا کرتے تھے اسیطرح مسلمانوں کے زمانۂ حکومت میں اور اُن کے زوال کے بعد بھی گوپامئو۔ خیرآباد۔ بلگرام۔ فرنگی محل۔ رامپور۔ جونپور۔ ڈھاکہ دیوبند وغیرہ میں مشہور و معروف علما وقت درس دیا کرتے تھے۔ نزدیک و دور سے سیکڑوں طلب آتے تھے اور مستفید ہوتے تھے برسوں محنت کرتے تھے تکلیف

اُٹھاتے تھے اور فضیلت کی دستار حاصل کر کے واپس جاتے تھے۔ ان درسگاہوں میں نہ سرکاری مداخلت تھی اور نہ کوئی فیس مقرر تھی نہ سالانہ امتحان کی قید تھی غریب طلبہ کو مقامی مرفہ حال حضرات اپنے ہاں بود و باش کی جگہ دیتے تھے اور ان کی خورد و نوش کیلئے دال روٹی کا بندوبست کر دیتے تھے ذریعۂ تعلیم ہندوؤں کے ہاں سنسکرت اور علماء کے ہاں عربی تھا درسگاہوں سے بڑے بڑے نامی پنڈت اور علما مستفید ہوئے اور دنیا میں نام پیدا کر گئے۔

انگریزی حکومت کے زمانہ میں بھی ابتداءً فارسی عربی السنہ اور علوم مشرقیہ کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ رہی۔ کلکتہ میں گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے اپنی ذاتی فیاضی سے ایک عظیم الشان مدرسہ موسوم بہ مدرسہ عالیہ قائم کیا جس میں مدت تک اعلیٰ درجہ کی تعلیم عربی و فارسی زبان و علوم کی ہوتی رہی اب تک یہ مدرسہ بحال خود قائم ہے مگر اس میں انگریزی کی [illegible] زیادہ کر دی گئی ہے اور عربی۔ فارسی کی طرف توجہ کم ہو گئی ہے [illegible] سرکاری طور پر ایک سررشتہ تعلیمات قائم کیا گیا اور انگریزی زبان کی تعلیم شروع ہو گئی اور روز بروز ترقی کرتی گئی اور اسی انداز سے عربی و فارسی کی طرف توجہ کم ہوتی گئی یہاں تک کہ اب عربی فارسی کی تعلیم گویا مفقود ہو گئی ہے ابتدائی مدارس میں اب بھی ملکی زبان سکھائی جاتی ہے مگر اعلیٰ تعلیم

فقط مغربی زبان و علوم تک محدود ہے متوسط درجہ کے مدارس میں بھی
تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہے اور چونکہ کوئی سرکاری خدمت بغیر انگریزی دانی
کے نہیں مل سکتی اس واسطے لوگ اپنے لڑکوں کو ابتدا ہی سے سرکاری
یا خانگی مڈل و ہائی اسکولوں میں داخل کر کے انگریزی میں تعلیم دلاتے
ہیں یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی حساب جغرافیہ وغیرہ انگریزی کے
ذریعہ سیکھتے ہیں اور اول سے آخر تک سارا وقت اُن کا اسی قسم کی تعلیم میں
صرف ہوتا ہے نہ اپنی زبان کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے اور نہ اپنی قومی
مذہب و عقائد و اخلاق سے واقف کرائے جاتے ہیں اور اس پر طرہ
یہ ہے کہ خود انگریزی زبان بھی اچھی طرح نہیں آتی انگریزی کی تکمیل کے واسطے
کالجوں میں جا کر کم سے کم چار سال تک درس لینا ضرور ہوتا ہے اور وہاں
بھی کل طلبہ کامیاب نہیں ہوتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی تعلیم کے بدولت ملک میں
ابتدا سے اسوقت تک روزافزوں ترقی ہوتی رہی ہے مغربی علوم کا
چرچا ہر طرف پھیل گیا ہے۔ طریقۂ تعلیم میں وقتاً فوقتاً بیش بہا اصلاحیں
ہوتی رہی ہیں غرض ملک کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے اور پہنچتا جاتا ہے۔
مگر باوجود اس اعتراف کے ہم اس تعلیم کے نقائص سے چشم پوشی نہیں
کر سکتے جیسا کہ میں تمہید میں بیان کر چکا ہوں تعلیم کے تین سلسلے قرار

دئے گئے ہیں۔ ادنیٰ متوسط اور اعلیٰ۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی عیب سے خالی نہیں۔

ابتدائی مدارس کیواسطے جن میں دیہات کے کم عمر بچے لکھنا پڑھنا سیکھتے ہیں اُستاد ایسے مقرر ہیں جنکی تنخواہیں چپراسیوں خدمتگاروں سے بھی کم ہیں ظاہر ہے کہ اُن کی استعداد اُن کی معلومات بھی اُسی درجہ محدود ہوگی۔ حالانکہ چھوٹے بچوں کی تعلیم خصوصاً اُن کی تربیت نہایت فہمیدہ باخبر علم کی محتاج ہے جو اُن کے خلقی عیوب کو دور کرسکے اور ان کے خلقی محاسن کو رونق دیسکے اور اُن میں انسانیت پیدا کرسکے

ثانوی مدارس میں ابتدا سے انگریزی شروع کرائی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور نہایت ادق زبان ہے اور لڑکے مجبور کئے جاتے ہیں کہ تمام ابتدائی فنون مثل حساب جغرافیہ تاریخ وغیرہ کے اسی غیر مانوس زبان کے ذریعہ سیکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش ناواقف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی حتیٰ کہ جب اُنمیں سے بعض طلبہ کالج میں داخل ہوتے ہیں تو اول اول اساتذہ کی تقریریں جو انگریزی زبان میں ہوا کرتی ہیں اُن کی سمجھ میں نہیں آتیں اور کم سے کم ایک سال اس کی تلافی میں صرف ہوتا ہے کالج کا تعلیمی زمانہ محض انٹرمیڈیٹ اور بی اے کیلئے صرف ہوتا ہے طلبہ کا مطمح نظر اور نصب العین

بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ ان دونوں امتحانوں میں یکے بعد دیگرے کامیاب ہوں اور سارا وقت اُن کا اسی نعمتِ عظمیٰ کی جستجو میں صرف ہوتا ہے ایسے خوش نصیب طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو اس چار سال کی مدت میں سوائے نصابِ مقررہ کے دوسری کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہوں اور اپنے علم و فضیلت کو ان امتحانوں کے باہر اور ان سے بالاتر وسعت دے سکتے ہوں۔

اگرچہ دوسرے فرقوں کے طلبہ کی بھی یہی حالت ہے مگر مجھے اس وقت فقط مسلمان طلبہ کو اپنے مدنظر کے دائرہ میں رکھنا مقصود ہے اور مسلمان ہی طلبہ کی حالات سے مجھے بحث ہے فقط اس قدر یاد رہے کہ جو کچھ میں مسلمان طلبہ کی تعلیم کے متعلق عرض کر رہا ہوں یہ سب حرف بحرف ہندو طلبہ اور اُن کی تعلیم پر صادق آتا ہے فقط فرق اس قدر ہے کہ ان کی اعلیٰ تعلیم کا جزو لاینفک زبانِ سنسکرت ہے اور ہمارا عربی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اسکولوں میں سات آٹھ برس کے لڑکے داخل ہوتے ہیں اور خوش نصیب سمجھے جاتے ہیں وہ لڑکے جو سولہ برس کی عمر میں میٹریکولیشن یا اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ اور اسی سند کی بنا پر کالج میں داخل ہونے کا حق حاصل کرلیں ورنہ بیشتر تعداد میں طلبہ کو دس دس بارہ بارہ سال اسکول ہی کے حدود کے اندر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اب اگر پوچھیے کہ اس

عرصۂ دراز میں اُن کو کیا حاصل ہوتا ہے کونسی دولت دستیاب ہو جاتی ہے
تو جواب یہی ملے گا کہ انگریزی زبان قدرے قلیل سیکھ جاتے ہیں سلیٹ
کاغذ پر انگریزی میں حساب کے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں اقلیدس
تو اب متروک ہے جیومیٹری کے ابتدائی مسایل یاد ہیں جغرافیہ جانتے ہیں
اقطار دنیا کے نام جانتے ہیں خاص خاص ملکوں کے مشہور و معروف
شہروں - ندیوں پہاڑوں کے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشہ میں انکا
نشان دے سکتے ہیں - یورپ خصوصًا انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے
ہیں ہندوستان کی تاریخ سے بھی ایک حد تک واقف ہیں اور آپ کو
بتا سکتے ہیں کہ جہانگیر ایک شرابی سلطنت سے بے خبر اور اورنگ زیب ایک سخت
متعصب اور ظالم بادشاہ تھا - اپنی زبان سے بالکل لاعلم نہیں ہیں کچھ کچھ
بول اور لکھ لیتے ہیں مگر اپنی مذہبی زبان اور بزرگوں کے علوم و حالات سے
بالکل نابلد ہیں کالج میں چار پانچ سال تعلیم پانیکے بعد اُن کی حالت میں
زیادہ تغیر نہیں ہوتا بجز اس کے کہ ہمہ تن مغربی دنیا کے مقلد بن جاتے ہیں
ہر امر میں مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں - اپنے قومی اخلاق پاکیزہ تہذیب
چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کرتے ہیں آپس میں گفت و شنود - بات چیت
سلام علیک سب انگریزی میں کرنا ان کو بھاتا ہے - کھانا پینا انگریزی
قسم کا پسند کرتے ہیں - اپنے ساتھ کے ہم مذہب ہمسایان ہند کو

مسلم ڈاکرسی کے نام سے شرف بخشتے ہیں۔ اپنی زبان میں تحریر و تقریر کرتے ہیں
تو اس میں بھی حتی الوسع انگریزی لغات کی بھرمار کر دیتے ہیں بہتوں کو نماز
نہیں آتی سورے یاد نہیں ہیں ایک صاحب کو میں نے سنا ہے کہ کلمۂ توحید
تک معلوم نہ تھا کہ کیا شئے ہے اور کس کا نام ہے کوئی صاحب یہ کہتے ہیں کہ
ہماری کتابِ مقدس بالکل توریت و انجیل سے ماخوذ ہے۔ اعوذ باللہ من ذالک
ہرگز ہرگز میں یہ نہیں کہتا کہ سب انگریزی خوان اسی قماش کے ہوتے ہیں
بہت نوجوان مسلمان حضرات ایسے بھی ہیں کہ جنھوں نے باوجود ان سب
دقتوں کے خود اپنی محنت و شوق سے اپنی مقدس کتاب اپنے قومی علوم
و فنون اپنی قومی تاریخ پر کامل عبور حاصل کیا ہے اور دل و جان سے اپنے
ملک و قوم کی علمی خدمت کر رہے ہیں بڑی خوشی بڑے فخر کی بات ہے کہ
علی گڈھ کے متعدد کامیاب طلبہ اس زمرہ میں داخل ہیں مگر سب سے زیادہ
ندوۃ العلماء کے وہ شکر کا لایق ستایش ہیں جو علومِ مشرقی و مغربی دونوں قسم
کی تعلیم کی تکمیل کر چکے ہیں اور اب تصنیف و تالیف یا درس تدریس میں
مصروف ہیں رسالہ "معارف" کو کوئی دیکھے جو دار المصنفین ندوۃ سے
نکلتا ہے۔ مولوی عبد السلام۔ مولوی عبد الباری۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف
کو کوئی دیکھے۔ مولانا حبیب الرحمن شروانی کے زورِ قلم کو کوئی دیکھے۔ کیا کوئی
محض انگریزی داں۔ بی، اے، ایم اے ان کا مقابلہ کر سکتا ہے کیا

ایک صفحہ بھی اس سلاست و متانت و فصاحت اس عالمانہ طرز کا تحریر کر سکتا ہے

میری غرض و غایت اس مختصر تقریر سے یہ ہے کہ ہمارا طریقہ تعلیم غلط اصول پر مبنی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود جہاں تک ممکن ہو ان اصول کی اصلاح کر دیں اور حکومت کی نظر کو بھی تا بحد امکان اس طرف منعطف کریں

اس کی صورت یہ ہے کہ اسکولوں میں تمام فنون مثل حساب جغرافیہ تاریخ وغیرہ اپنی زبان میں سکھائے جائیں انگریزی جو ایک اجنبی اور مشکل زبان ہے بطور ایک زبان کے تعلیم دیجائے اور اس کی تکمیل کی طرف بہت زیادہ توجہ کیجائے محض طوطوں کی طرح ریڈروں کو رٹنے سے کچھ نہیں ہوتا، زبان سکھانے کے جدید طریقے اختیار کئے جائیں اور اس کیلئے روزانہ معقول اوقات اور خاص مدرس مقرر کئے جائیں مجھے یقین کامل ہے کہ یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو اسکولوں کی تعلیم کی تکمیل میں اس قدر وقت ضائع نہ ہوگا جس قدر اب ضائع ہوتا ہے اور طلبہ کے انگریزی دانی کے معیار میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ ذخیرہ لغات انگریزی صحت تلفظ وغیرہ میں بہت کچھ اضافہ ہو جائیگا۔ اس کے علاوہ میری رائے ناقص میں اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو لڑکوں کو موجودہ حالت سے کمتر مدت میں اسکول کی تعلیم سے فراغت حاصل ہو جائیگی۔

کالجوں کی تعلیم میں بہت سے چھوٹے بڑے نقائص اب بھی باقی ہیں اور اُن کی اصلاح یقیناً رفتہ رفتہ ہو جائیگی مگر مجھے دو اُمور کی طرف آپ کی توجہ

منعطف کرانا اس وقت بہت ضرور ہے ۔

امر اول یہ ہے کہ گو کالجوں میں بوساطت زبانِ انگریزی علوم و فنون کی تعلیم بعض اعتبار سے مفید ہے مگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائیگی اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علومِ متعربیہ سے ہمیشہ نا آشنا رہیں گے ۔ بلادِ یورپ و امریکہ میں یہاں تک کہ مصر میں بھی جو ایک اسلامی ملک ہے علوم کی تحصیل میں کسی اجنبی زبان کی وساطت کی حاجت نہیں ہوتی مصر میں بہت سی علمی کتابوں کا فرنچ اور انگلش زبان سے عربی میں ترجمہ ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے ۔ ایک ہم ہند کے مسلمان ہی اس نعمت سے محروم ہیں اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنی جامع علمیہ عثمانیہ کو جس میں خاص اردو زبان واسطۂ تعلیم علوم و فنون قرار دیگئی ہے حسبِ امید کامیابی ہوئی تو یہ عیب مٹ جائیگا اور ہماری زبان قلیل عرصہ میں دولتِ علمیہ سے مالامال ہو جائیگی ۔ اور کامیابی کیوں نہ ہو گی جبکہ اس کی سرپرستی خود ہمارے شاہ جمجاہ نے منظور فرمائی ہے اور اس کو اپنے نامِ نامی و اسمِ گرامی سے منسوب کرنیکی اجازت عطا فرمائی ہے ۔

دوسرا امر جس کی طرف کارپردازانِ جامعِ علمیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس جامع کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبانِ تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں اور ہندو طلبہ کیواسطے سنسکرت کے درس

تدریس کا بندوبست کیا جائے اور کوشش کیجائے کہ چار پانچ سالہ مدتِ تعلیم میں زبانِ انگریزی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی تکمیل ہو جائے اگر اساتذہ لائق ہوں اور طریقۂ تعلیم اور نصابِ کتب درست اختیار کیا جائے تو مجھے یقین کلی ہے کہ ہمارا منشاء پورا ہو جائیگا اور اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اکارت جائیگی۔ طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی اُن کو ادہم کو اُمید اور اُن کی قوم کو ضرورت ہے۔

عربی زبان کو مختلف حیثیتوں سے ہم مسلمانوں پر حقِ تحکم حاصل ہے۔ اول یہ کہ عربی زبان ہماری آسمانی زبان ہے ہماری کتاب مقدس اسی زبان میں نازل ہوئی ہے۔

دوسرے یہ کہ ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو ایسے علوم و فنون سے مالا مال کر دیا ہے کہ اس وقت بھی اہل مغرب داد دیتے ہیں اگر کسی کو مختصر و مفید طور پر ان خدماتِ علمیہ پر اطلاع حاصل کرنی منظور ہو تو دور جانیکی ضرورت نہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی کا بے نظیر خطبۂ صدارت جلسہ ندوۃ العلماء منگا کر مطالعہ کر لے۔ اس کے مطالعہ کے بعد اگر کسی کے دل میں عربی زبان کی ضرورت کی نسبت ذرہ برابر بھی شک باقی رہ جائے تو خدا ہی

اُس کی تاریکی ذہن کو دور کر سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ ہماری زبان اُردو کی درستی و اصلاح کا دارومدار عربی و فارسی پر ہے جو کوئی عربی زبان سے ناواقف ہے وہ ضرور اُردو کی نوشت و خواند میں غلطیاں کرے گا اردو زبان میں اعلیٰ درجہ کی تصنیف و تالیف وہی کر سکتا ہے جس کو عربی و فارسی میں بھی ایک معتد بہ مہارت حاصل ہو۔ ورنہ یوں تو لوگ اُردو کا لغت تالیف کرتے ہیں اور اُس میں سکڑوں غلطیاں کر جاتے ہیں۔ نئے نئے الفاظ کو رواج دیتے ہیں جن کا نہ سر ہے نہ پاؤں محض اس وجہ سے کہ عربی زبان سے واقف نہیں ہیں۔

اس وقت میں نے اپنی اس مختصر تقریر میں زیادہ تر اعلیٰ تعلیم اور اُردو یونیورسٹی کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھا ہے۔ تاہم ابتدائی تعلیم کا انتظام و اہتمام اس قدر ناگزیر اور ضروری ہے کہ اس سے کسی طرح غفلت کرنا جائز نہیں۔ مگر آپ خیال کر سکتے ہیں کہ گاؤں گاؤں ابتدائی مدرسہ سرکار کی طرف سے قائم ہونا کس قدر وقت طلب مسئلہ ہے مدرسوں کی تعداد کا خیال اور خرچ کا حساب لگائیے تو محال معلوم ہوتا ہے کہ نزدیک زمانہ میں یہ مرحلہ طے ہو جائے اور اہل دیہات کے بچے ناخواندہ نہ رہیں۔ ایک آسان صورت جو میرے ذہنِ ناقص میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو طریقہ چند سال پیشتر صوبۂ ورنگل میں امتحاناً جاری کیا گیا تھا اُس کے نتائج و نقائص دریافت کر کے اسی کو وسعت دیجائے وہ طریقہ

یہ ہے کہ قدیم مکتب اور پاٹ شالوں کی تجدید کیجائے اس طرح پر کہ ابتدائی مدارس
زیادہ تر گاؤں کے پٹیل پٹواریوں کے تفویض کردئے جائیں اور سرکار سے
بطور امداد کے ہر مدرسہ کو ایک قلیل رقم سالانہ ملتی رہے اور گاؤں والوں سے
شرط کر لی جائے کہ سال میں کم سے کم دو بار سرکاری ناظران مدارس اُن کا معائنہ
کریں گے اور کسی مدرسہ کی حالت درست نہ پائی گئی اور جلد اس میں اصلاح
نہ ہوئی تو امدادی رقم موقوف کردیجائیگی۔ اس طریقہ میں ایک خوبی یہ ہے
کہ خود گاؤں والے پٹیل پٹواری اپنے مدرسہ کو آباد رکھنے اور کامیاب بنانے
میں سعی و کوشش کرتے رہیں گے جو رقم سرکار سے بطور امداد مقرر کیجائے گی
اُس سے بہت زیادہ یہ لوگ اپنی جیب سے مدرسہ کی ضروریات پر خرچ
کرتے رہیں گے اور اس سے اپنی اولاد کو متمتع کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

حضرات۔ میں اپنی لاطائل تقریر کو طول دینا نہیں چاہتا آپ کی
کانفرنس کے مقاصد بہت وسیع اور نہایت مفید ہیں خدا کرے کہ آپ ان
مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہوں اور تمام ملک میں تحصیل علم کا شوق
پیدا ہو جائے اور اہل ملک خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنی حالت کی
اصلاح کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اس
عہد معدلت مہد میں جبکہ ہم پر ایسے ظل اللہ کا سایہ پڑ رہا ہے جو ہمہ تن اور
ہر وقت اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کی فکر میں مصروف رہتے ہیں اور کوئی تجویز

کوئی استدعا، کوئی گزارش خصوصاً تعلیمی معاملات کے متعلق جس میں واقعی اور درست طور پر اہل ملک کی بہتری کی امید ہو کبھی رد نہیں ہوتی آپ کی کانفرنس ملک میں تعلیم کا شوق اور اہل ملک میں اپنی اصلاح کا مذاق نہ پیدا کرا سکے تو سمجھ لیجئے کہ بجز ہماری شومی قسمت کے اور کوئی اس کا ذمہ دار نہیں اور یہ مقصد اسیوقت حاصل ہوگا جبکہ حامیان کانفرنس اور نیز وہ بزرگان قوم جو شاید اتفاقاً کانفرنس میں شریک نہیں ہیں عملی طور پر کام کریں اور فقط فصیح و بلیغ تقریروں پر بھروسہ نہ کریں وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

گزارش

خلد الله ملکه و دولته

بحضور اعلیحضرت سراج الملة والدین امیر حبیب الله خان جی سی ایم جی والی امیر افغانستان و حدود متعلقهٔ آن

اعلیحضرت! همانا ورود مسعود همایون بخاک هندوستان جنت نشان
نه همین مایهٔ خوش بختی و سبب خوش اوقاتی و اخلاص کیشان گردیده است
بلکه سائر مسلمانان این کشور را شرف و افتخار بخشیده -

ما اخلاص کیشان که در ظل عاطفت دولت بهیه برطانیه ادام الله ملکها -
به امن و امان و حریت و اطمینان هر چه تمامتر شب را سحر می کنیم و عمر بسر می بریم
بر خوش نصیبی خود می نازیم - که یکے از اجل فرمانروایان ملت بیضای اسلام که
با این دولت علیه رابطهٔ یک جهتی و اتحاد و رسم خلوص و وداد مستحکم دارد -
امروز به مهمانی دولت ما از قدوم میمنت لزوم ما را مشرف فرموده

مژده اے یاران که در تن ها روان آید همی
وا اندرین گلشن بهار بے خزان آید همی
شاهِ افغانان همی آید درین دارالعلوم
ابر رحمت بهر تشنه لبان آید همی

اعلیحضرت! سلسلهٔ ترقیات علمی و سیاسی که در مملکت قوی شوکت
خداداد افغانستان آباد و حکومت اعلیٰ حضرت خلد آشیان ضیاء الملة والدین
امیر عبدالرحمن خان شروع شده بود - ادوار تجدید معدلت مهد حضور والا

بتکمیل رسیده و می رسد در هر مرکزے آثار ترقیات روز افزوں عیان است در هر اداره صورت صلاح و فلاح نمایاں و دریں مدت قلیل عظیم ماتیکه دراں مملکت بظهور آمده باعتقاد ما مخلصان سرکار محض نمونه ایست ازاں نعمائے بهیه و آلائے علیه که در ازمنه مستقبله جلوه بروز و ظهور نمودنی است ـ

اعلیحضرت حالت مسلمانان هندوستان بنهایت عبرت خیز است فیالها قصة فی شرحها طول قرونے چند نگذشته که حامل لوائے علوم و فنون و محافظ ایں خزینه برکت مشحون در عالم و عالمیاں همیں مسلمانان بودند و حکمت و فلسفه و هیئت و هندسه و اخبار و آثار قدیمه و جدیده بوجود فیض آمود ایں قوم زنده و دار العلوم هائے مشهور و دبستان هائے معروف صفحه دنیا از برکات ایں طائفه پاینده بود و در ازمنه سابقه که تاریکی جهل عالم را فرا گرفته بود انوار تعلیم و اشعه تهذیب و تمدن ازیناں ساطع و لامع بود ـ ولے بحسب مقتضائے فطرت دنیائے دوں و گردش گردون بوقلموں اختر اقبال شاں که باوج کمال رسیده بود بیک چشم زدن رو بحضیض ادبار نهاد و بالآخر به کلی غروب شد چنانچه امروز حالت ما بپایانے رسیده است که نه آشنائے محیط علم و نه قدم فرسائے وادی هنر ـ نه آتش در کاسه داریم و نه زر در کیسه بگرداب جهل و تعصب گرفتاریم و با مذلت و نکبت هم کنار ـ اگر هر آئینه دولت بهیه برطانیه از بخت ما بر تخت مملکت جلوس نمی فرمود و نعمت امن و اماں و دولت حریت و اطمینان انعام

نمی کرد۔ دریں ملک جز اسمی و رسمی از ما باقی نمی ماند۔ و مثلِ حرفِ غلط از صفحۂ ہستی
محو می شدیم۔ دولتِ بہیہ برطانیہ نہ ہمیں امن جان و مال و آزادی حال و
مقال بما ارزانی فرمود بلکہ ذرایع بیشمار و وسایل ہزار در ہر باب جہت ترقی ما مہیا
کرد عمدہ و افضل آں طرقِ تعلیم و تربیتِ عمومیت کہ بغیر آں نشو و نمائے علمی
کہ وابستہ بقرار وی تہذیبِ عقلی و اخلاقی و تمدنی است صورت نمی پذیرد۔ اقوام دیگر
ازیں برکات بہرہ یافتند و ازیں خوان یغما لقمہ برداشتند و در تحصیل علوم
و فنونِ جدیدہ چنداں تیزگامی کردند کہ از ناکامی رستند۔ ولے ہزار افسوس
کہ ما مسلماناں بجائے اینکہ ہم پائے دیگراں رفتار کنیم و مثلِ ہمرہان در حصول معارف
بکوشیم از ہمچو موہبتِ عظمی بچشمِ تنفر نگریستیم و از خودپسندی و تعصب پائے در ریب
رہ گذر نہادیم و چوں دریں روزگار در ہمہ کارہائے ملکے و دولتے از
زبان انگریزی و علوم جدیدہ گزیر نیست ما را ہر روز نشیبے تازہ روئے میداد
و زحمتے نو بروئے کار می آمد و اقران و امثال ما گوئے سبقت ربودہ ترقیات
بردند و یاس و ناکامی بما سپردند و لے خداوند یگانہ کہ مدبر ایں کارخانہ است
از الطافِ رحیمانہ خود مردے ہوشمند و فرزانہ را برانگیخت کہ کنہ ایں خطرات
کہ باعثِ ہلاکت و بربادی ما بود در رسید۔ رگ حمیتش بجنبید و دلش بدرد آمد
و ایں اندیشہ در خاطر او استوار گردید کہ تا مسلمانان علوم و فنونِ غربی را
نیاموزند دشوار بلکہ محال است کہ از قعرِ ذلت خلاصی یابند و بمدارج علیائے معارف

وتهذیب ارتقاء جویند-

هرچند که از لطفِ عمیم حکومتِ فخیمه برطانیه مدارس و مکاتب و دارالعلومهائے متعدد در تمام هندوستان قائم و جاری و خود بزرگوار مشارٌ الیه معترف سودمندے آنها بود- ولے در اندیشهٔ دوربینش این امر جاگزین شده بود که هیچ قومی در تحصیل علوم و تهذیب اخلاق بدرجاتِ شایسته و بایسته نمی تواند رسید تا وقتیکه صعب ترین مراحل این ره گزر را بپامردی خود طے نه کند و برائے پیش رفت مقاصد دینی و دنیوی بناے دارالعلم مخصوص و علیحده برائے خود ننهد خصوصًا درچنین زمانیکه باد موافق از طرف دولت وزان ست و نسیمِ حریت و ترقی بر تمام مملکت باران نبودن دارالعلم اسلامی حیف بود، و بر همین قصد و نیت بزرگوار موصی الیه که مراد از سر سید احمد خان است رحمه الله وجعل الجنة مثواه- این کالج را بر بنیان محکمے کارگزاشت و هرچند در حصول این مقصود مخالفتهائے بسیار و مزاحمتهائے بیشمار دید ولے از پائے ننشست تا دست بدامنِ مقصود نه رسانید، بمرور زمانه هم کیشانِ سر سید مغفور که ضد و کاربا مرگزارِ او ناسازگار بودند، قدرِ زحماتِ او دانستند و کمرِ همت برائے آبادانی این مدرسه چست کردند تا اینکه امروز بدرجه رسیده است که فی الجمله منظورِ ملاحظهٔ عالی گردیده، و اگرچه در اول این مدرسه محض تحتِ حمایتِ دولتِ بهیه برطانیه قائم گردید ولے متعاقب بعونِ خداوندی مساعیِ جمیله افرادِ قوم بکفالتش رسید

که از ستایش این عماراتِ عالی شان و طلابِ فراوانِ امروز از نظرِ همایون
میگذرند و بجهت تعمیرِ عمارات و اعانتِ طلاب این مدرسه که با مصارفِ تعلیم را
متحمل نبودند و دیگر کارهای ضروری زاید از شانزده لک روپیه از همه روان
بهم رسید که بغیر آن استقرار و استحکام این درسگاه ممکن نبود. بالجمله از جمیع نقاط
هندوستان هر کسے که در دماغ فهمید از درمان دریغ نکرد خاصته والیان
فرمانروایانِ ریاستهاے ملکی که همت به اعانت این کار گماشتند و قوم را از بنیاد ممنون ساختند

نبذے از تفصیل این اجمال عرض میشود که درین زمانِ سعادت توامان ماهے
تقریباً سه هزار روپیه از دولتِ علیه هندوستان به مدرسه می رسد و سرکار
نظام الملک والی فرخنده بنیاد حیدرآباد دکن خلد الله ملکه ماهے دو هزار روپیه
مرحمت می فرمایند و علی هذا والیانِ ریاستهاے رامپور و بهاولپور و جاوره و
مالیر کوتله و مهاراجه پټیاله نیز عطیه دوامی معاونت می نمایند و جمله مداخل مدرسه
سالے یک و نیم لک روپیه می شود که تمامش در تعلیم و تربیت و امداد
شاگردان که از هشت صد بیشتر اند بکار برده میشود. بقدر ضرورت این مدرسه
که اسباب جمعی با اخلاص کیشان باشد نشد چه بسیار طلاب مسلمان از کمی جای عمارت
نمی توانند از تعلیم و تربیت اینجا استفاده نمایند و با آنکه پانزده هزار روپیه در
وظایف خرچ می کنیم این قدر هم کفایت نمی کند و همین سال تقریباً دویست نفر را
که با نجابت و شرافتِ خاندانی پرتو قابلیت ذاتی و استعداد فطری از جبین شان

آشکار بود، ولے افلاس و ناداری مانع تحصیل علم و کمال بود نتوانستیم ابداً
بدہیم ناچار درخواستہا رد کردیم و بر محرومی ایشاں بسیار تاسف خوردیم
برائے مہر ضیائے ہمایونی مستور و محتجب نماند کہ ابتدائے ایں درسگاہ
اسلامی از ۱۸۷۵ء است و در ۱۸۷۸ء گویا از طفولیت بہ رشد رسید و بنامِ
کالج نامزد گردید و پس ازاں آغاز تعلیم اعلائے درجہ ایم - اے کہ در دارالعلومہا
ہندوستان و فرنگستان متداول و جاری ست از ۱۸۸۴ء بہ ظہور پیوست
و درس قانونِ ملکی در ۱۸۹۱ء شروع گردید چوں تمام ایں مراتب طے شد و ایں
مدرسہ من حیث فراہمی اسباب درس انگریزی و فروعِ آں چنانکہ در مدارس بزرگ
ایں ملک می باشند بہ تکمیل رسید۔ نظر بہ ہر دو غایات اصلی و مقاصد دلی
یعنی ترقی دینی و دنیوی کہ از اول در بنائے ایں مدرسہ پیش نظر بود ما
مخلصانِ سرکار والا خواستیم کہ تکمیل تحصیل اعلائے علومِ عربیہ کہ فوائدِ
آں مخصوصاً بہ مقاصد دینی ما مسلمانان است بنمائیم و در ترویج آں بکوشیم تا نونہالانِ
اُمتِ مرحومہ محمدی از گلزار پر بہار آں علومِ مقدسہ گلہا بچینند و زیب دستارِ
فضیلتِ خود نمایند و ریاضتہائے علمائے سلف بہ ہدر نرود و گنجینہ معارف
و خزینۂ تہذیب کہ بزرگانِ ملت از برائے ما گذاشتند ضائع نشود
بجہت حصول ایں مقصد دولتِ علیہ ہندوستان کہ ما نمی توانیم سر از
بار منت و احسانش برداریم - ماہے یک ہزار روپیہ برائے ایں کار براعانت

دوامی خود افزوده و بزرگان ملت برائے اعانت طلاب نه هزار روپیه سالانه
بصورت وظایف بذمه خود گرفتند تا که شاگردان از بار مصارف تعلیم
سبکدوش گردیده در تحصیل و تکمیل علوم عربیه مشغول باشند -

ثانیاً چوں دریں زمان تعلیم سائنس که مراد از دروس فنون جدیده علمیه و
عملیه است از برائے پیش رفت مقاصد دنیوی لازم و ضروری است و
ترقیات مادی هر قوم بغیر آں صورت نمی پذیرد و دریں مدرسه هم اگرچه بنیاد
ابتدائی آں علوم از شش سال پیش ازیں برقرار بود و لیکن در سنه گذشته یعنی
سنه ۱۹۱۱ع بیادگار تشریف آوری والا حضرت شاهزاده ولی عهد دولت بهیه
برطانیه و علیا حضرت شاهزاده خانم انتظام مخصوص برائے تکمیل و توسیع
سائنس بر روئے کار آمد و عالیجناب هز هائنس آقا سر سلطان محمد شاه آغا خان
جی-سی-آئی-اے امداد کافی و کمک وافی فرموده مبلغ سی و پنجهزار
نقد مرحمت فرمودند و بر عطیه شش هزار روپیه سالانه خود دو هزار روپیه دیگر
سالانه افزودند و یکے از محتشمان بمبئی سر آدم جی پیر بهائی که به همت عالی و کشاده دلی
اتصاف دارند مبلغ هنگفت یک لک و ده هزار روپیه بحیثیت عطا فرمودند و در ایں
اساسے که برائے تعلیم سائنس نهاده شد درس اعلائے آں جاری خواهد شد و لیکن
ایں کار بغیر فراهمی آلات و تعمیر عمارات و جمع آوری اجل اساتذه و اهل کمال
که مصارف کثیره لازم دارد بتکمیل نخواهد رسید و دولت علیه هندوستان بست هزار روپیه که

برائے خرید کردنِ آلات عطا فرموده از افضالِ خداوندی امید داریم که بالائے
آں ہرچہ بجہت ایں کار درخواست از دیگر وسائل بحسب ما خواہد گردید۔
این ست مجملی از ترقیات ایں مدرسه که در بلغ عرض ہمایوں رسانیدیم اکنوں
میخواہیم که از بابت درسِ دینیات و فقه و حدیث که دریں مدرسه جاری است
حرفے بسامعِ والا معروض داریم۔

اعلیحضرت مقصود از بنا نہادن مدرسه مخصوص از برائے مسلمانان
ایں بود که ہم علوم متداوله انگریزی را بیاموزند و ہم سر رشته کیش و مذہب
از دست نروند و علوم مذہبی را آں قدر فراگیرند که از مہمات و ضروریاتِ مسائل
بہرۂ وافی اندوخته باشند۔ نظر براں دریں مدرسه بزرگانے چند از علمائے
ملت به سائرِ شاگردان موعظت می فرمایند۔ و درس مسائلِ منقولاتِ شرعیه
می دہند و ہم از بابت عملیاتِ واجبه اسلامیه مثل صوم و صلوٰة وغیره مواظبت
کلی می نمایند و غیر ازیں علما که بالمره مصروفِ تلقین و تدریس ہستند۔ علمائے کرام
از دیگر جاہا می آیند و امتحان شاگردان ایں مدرسه می گیرند و از افاضات خود
مستفیض میفرمایند۔

اعلیحضرت دریں زمان اصولِ تربیت و تعلیم در اکناف و اطرافِ عالم
چناں رو به ارتقاء آورده است که ہر طائفه که ہم پائے سابقین ایں مضمار
رفتار نه کند۔ ہر آئینه در حضیض پستی خواہد ماند و ظاہر است که برائے حصول ایں

مطلب واوارۀ درس اعلائی کابل که با مدارس عمومیه فرنگستان دم مساوات وهمسری زند باید خطیر ومصارف کلی لازم است اما به حسرت وافسوس عرضه میداریم که باوجود بذل جهد ومساعی که از خیر اندیشان این خطب جلیل بر روی کار آمده هنوز دست ما کوتاه است واین درسگاه بدرجۀ علیا وغایت قصوی که مطلوب ومقصود بانیانش بوده رسیده اما مصداق آیۀ کریمه لا تقنطوا من رحمة الله ما از مراحم خداوند عالم مایوس نمی شویم ویقین داریم که روزے تیر امید ما بهدف مراد خواهد رسید واین دار العلم بدان پایۀ رفیع ارتقاء خواهد نمود که قوم را بدان احتیاج ست وروزے بآبیاری بخت وپائمردی خیر اندیشان ملت وحصول پول کافی وبذل جهد وافی بدرجه وحیثیت یونیورسٹی ارتقاء خواهد نمود وبفحوائے سالی که نکوست از بهارش پیداست این ورود میمنت آمود همایونی باعتقاد ما اخلاص کیشان آیتے از آیات وامارتے از امارات حصول مطالب وانجاح مآرب ماست که از الطاف ایزد متعال بظهور آمده -

خوشا نصیب ما که از زیارت همچو نیر سعادت بهره اندوز شدیم وشب تیرۀ خود را بروز روشن آوردیم شک نیست که اینهمه از آن ست که اتفاق دو دولتین بمیان است - ایزد توانا این اتفاق را قائم واین اتحاد را دائم داراد که در روسود گروه اسلام است وبهبود ملت خیر الانام - اگر چنین نمی بود این آفتاب عالمتاب افغانستان بر مالکے جلوه می فرمود - دیرست که شمع مبارک وهمایون را

زحمتِ شنفتن می دہیم، اکنون باید کہ دست ازین زحمت برداریم و بہ دُعا برآریم ہ

تا مدار کار باشد بر عمل ‌‌ عار باشد تا جوانان را کسل

درجہاں تا علم را باشد نشاں ‌‌ بر ہنرہا تا کنند نازش جہاں

تا ریاست راست در گیتی وجود ‌‌ تا سیاست راست در عالم نمود

شخص تو محفوظ ماند از گزند ∴

چارۂ درد از تو جوید دردمند

سقراط

لما عفت من ارض یونان آثار العلم و رسومه ٭ واختفی قمره
وافلت نجومه وارخی الجهل سدوله علی الدیار والامصار ٭ واطفیت
منارات الحکمة فی الاکناف والاقطار ٭ فما بقی فی تلك البقعة
من الحکمة المتقدمه الا اثر بلا عین وقد رحل خالص اللجین ٭ ومضی
السابقون السابقون من الحکماء والمقربون بالفضل من الفضلاء
خلفهم السوفسطائیون اصحاب الادعاء الذین اخذوا توهین
الحکمة شعارهم ٭ وتحقیر العلم دثارهم ٭ وطلبوا فی ذلك
الافتخار ما بین الجهال ٭ ونالوا منهم المال والمنال ٭ وزاغوا عن الحق
وجعلوا طلاقة اللسان غایة العلم واعلاه وزعموا سلاسة
البیان نهایة الطلب وقصواه ٭ وملأ الدهر منهم ومن اقوالهم
واجتمع علیهم الناس وصاروا معولی ارذالهم واقیالهم ٭
واصبحت اباطیلهم مقبولة ومنتها جهم مرضیا ٭ وکاد یدرس العلم
ویصیر نسیا منسیا ٭ فبینا هم یتداولون القیل والقال ٭ ویجری

حالهم على ذلك المنوال اذ برز بينهم حكيم ذو ايات ظاهرة كاسر لدعاويهم الباطلة ببينات باهرة الذي خالفهم صورة وسيرة اختلاف الليل والنهار وباينهم ظاهرا وباطنا مباينة النور والنار فانهم غضوا اطرافهم عن الحق وعموا عنه وغشيت ابصارهم كالحرباء من شمسه وهو اخذ الحق ازاء مولاه وبذل الجهد في كسبه وكشفه من بيانه الى مسه اليهم والحق احتقروا وطلبوا الجاه والمال عوضه وهو عد الحق عدده وحسبه عرضه وعرضه وغايته وغرضه ۞ ومع صفر يده وكثرة نكده ۞ احبه واعزه ۞ السوفسطائيون كانوا يدعون انهم يعرفون الحكمة اصلها وفرعها وينقدون زيفها وجيدها ۞ ويفرقون لبها من قشرها ويعلمون العلوم جميعا ۞ ويفقهونها باسرها ۞ وهو يقول انه لا يعلم الا انه لا يعلم ۞ فكيف يعلم من لا يدري شيئا ولا يفهم ۞ ويضيء الطريق لغيره مريهيم في الظلم ۞ وقال ان التعليم شيء عسير ۞ لا يقدر احد على قليل منه ولا كثير لكني لعلي اعاون اعوان دهري ۞ واساعد اقران عصري ۞ لا بتعليمهم العلوم والحكم من لدني بل باهدائهم سبيل السعي ۞ واحذارهم مضلة الزلة والعي ۞ ومزلة الضلالة والغي فان شاني نقد الخطرات وتطهير الشبهات ۞ ومنع الخطوات من خطط الخطيات وكما كانت امي قابلة تعين الحبالى في اخراج الاجنة ۞ فانا اماثلها في صنعتي واؤيد حاملي الخطرات واكشف

من خواطرهم الجنه ÷ ثم انظر فی طالع الولید ÷ وامیز الشقی من
السعید ÷ فان فسد سقط بطوهم اهلکته وافنیته ÷ وان صح
حفظته وابقیته ÷ ولا ارید منهم جزاء ولا شکورا ولا اطلب اجرا
یسیرا ولا موفورا وقیل انه افرط فی تسأله لاولی الالباب الذین فاقوا
اقرانهم فهما وعلما ÷ واکثر خطابه للجهابذة الذین لهم قصب الخطاب
وسبق القصبات لبا وحلما ÷ وهو ینقد جید معانیهم وغثیثها
ویخرج جها من خثیثها ÷ فربما استصعبوا جواب سواله ÷ واستثقلوا
حمل احماله واستبعدوا من نباله ÷ وحصروا حین خطابه وتلجلج
السنتهم فی ردجوابه ÷ فسئلوا عن مبنیهم واستخبروا عن مبارکهم
فقیل انه سقراطیس ولد سفرانسقوس وشانه المناظره ودابه
المشاجره لرد الخطاء وکشف الغطاء ÷ ذاک ولا غیره ÷ والناس منه
فی العجب والحیر وقالوا هل لمعارضیه حظ من سیبه ÷ ولطارقیه
فرج من بوبیه ÷ هل یروی الصداة مریحابه ÷ ویکسی العراة من ثیابه
فاخبروا ان جوفه جوف عیره ÷ وبابه سما بیره ÷ وانه کاسر الاوثان
لا عامر الاوطان وکاشف الغطاء ÷ لا صاحب العطاء ومرحل الراحل
لا معبر المنزل ÷ ومیوی الحجه لا موفی المنیه ÷ ومتم الحجه لا مفید
الغنیه وانه لیس عنده وجه الحکمه ÷ ولا زاد یجتازبه مجاز الحقیقه

ان فی کنانته سهما فردا؛ وفی کیسه درهما منفردا؛ عصارة اغنائه جرعة واحدة؛ وخلاصة عظاته کلمة مفردة؛ وهی ان الانسان ظلوم وجهول؛ ومغتر بانه علیم وعقول؛

سقراطیس الحکیم کان قبیحا ظاهره وصورته ونزیها باطنه وسیرته یخالف ابناء عصره فی شیمه وعاداته؛ ولا یوافق کرائم دهره فی بادی صفاته؛ ینطلق حافیا فی انثنیه واسواقها ویمشی غیر منتعل فی سککها وزقاقاتها؛ وهو فی وجد وفکر لا یبالی بالمارین علیه ولا یکترث بما هم فیه لدیه کثیرا ما یوجد قائما عدة ساعات فی زقاقها او تحت بعض الطاقات وقیعانها؛ ولا یزال کذالک مشغوف البال؛ هائما فی تیه الخیال؛ حائرا وساکتا کبعض اوثانها؛ کل یوم من ایامه یروح الی السوق ویناظر مناظریه ویناضل مناضلیه؛ هیئته هیئة بعض اصنام الاثنیین؛ ماخوذة من الحجارة والطین؛ انفه اخنس؛ جسمه سمین الحشن بطنه مفاض ضخیم؛ لحمه مسترخ شحیم؛ منخراه وسیعتان مرتفعتان وعیناه جحیظتان من حدقتیهما خارجتان لکنه مع کراهة منظره؛ یاتی بالسحر فی خبره؛ ویسخر آذان سامعیه بسمره؛ حتی ان الذین کانوا یحتقرونه ویستصغرونه لوقاحة صورته

ویکرهون النظر فی وجهه وبشرته ؛ صاروا یهجمون علیه ویدنون
منه ویقبلون الیه ؛ لیصیخو البدیع کلامه ؛ ولیصغوا الی غریب نظامه ؛
روی عن اسماوس الذی کان من اکابر ذلک الزمان و
اعاظم ذلک الاوان انه قال کلما امر سبقراط والناس مشغوفون
ببنات شفته ویحلون اریاقهم من نبات موعظته ؛ وینفعمون
سجالهم من زلال کلامه ؛ ویجنون قطوف بدائع نظامه ؛
وارنه محاطا باخلاط الزمر کالقمر بین النجوم لیلة الرابعة عشر
فاستعجل سیری ولا ابالی بغیری وامر مر السحاب حتی لا امس
برجلی التراب ؛ واهرب منه هرب الصید الخائف ؛ وافر فرار
المضیم من الحائف ؛ لکیلا یسحرنی نوابغ کلماته ؛ ویاخذنی
اخیذ اخذات سجعاته ؛ ویجلبنی الیه نوادر فقراته ؛ فاسحر
فی استماع لفظاته ویعقر مطایای قطع مراحل عظاته ؛ وقال
ان سقراط لا یعرفه احد حق معرفته کما اعرفه فانه مزن هامر
وسحاب ماطر وبحر زاخر ونخل مثمر ؛ وفیض سارٍ وماء جارٍ
ومسک اذا اهتک وذهب اذا انسبک وریح عبق وماء
غدق وقوس رشق ومطر طبق ونهار فلق وسماء اذا برق و
ومیض اذا خفق الیلا اذا غسق رقی المعالی طبقا عن طبق ؛

لبیب حلیم حکیم فهیم ؛ غمر الرداء خفیف الرواء سابق سالفیه و
معاصریه بصفو صفاته وتفرد بین الانام بموسماته و انی
لا اعرف احدا شابهه فی الازمنة الماضیه او ماثله من ابناء آونتنا
الباقیه لاعدیل له فی اساطیر الاولین ولا مثیل له فی دفاتر الاخرین
کان اسم امه فرانیطی و کانت قابلة صناعة کاملة الصناعه
وکان ابوه عامل الاصنام وکان کلاهما قلیل البضاعه
واسم ابیه کما سلف ذکره ؛ سفرانسقوس وهما فی غایة النکد
مما علیهما من القله والشدة والبوس ؛ واهما ادباه غایة
التادیب وهذباه نهایة التهذیب وما منعهما من ذالک
تکسر الحال واختلال البال وهجوم البلبال وسعة التشتت
وضیق المجال وعلمه ابوه عمله ؛ لکنه ما احب شغله
فترکه وذهله ؛ قیل ان بعض اساطین اثینه المشتهر بین اضرابه
بقریطا لمح لمعة الحکمة فی سعة جبینه فاخذه بیمینه ؛ وشام
بروق المجد فی بهجه جبهته فاخمد لوعة مهجته وصار ظهره
وعضده وساعده ویده ولم یزل من تلامذته ؛ ومادام
یتعظ بعظته وقیل ان سقراط اخذ العلوم الطبعیه فی بدو
امره ؛ وعنفوان عمره ؛ من ارقیلیوس وانقساغوروس ؛ وتعلم

الفنون الادبیه بین یدی فراد یقوس لکن الاخبار ههنا جمه
ولیال استنادها مد لهمه والحق ان ذکاءه مستنارة
لا مستنیره وذکائه مستفادة لا مستفیدة سلک جادة
جدیدة واختار طریقة غیر کدیدة ؛ ؛ ؛

علمی مصطلحات دیسی زبانوں میں

یہ مضمون نواب عماد الملک بہادر نے پچاس سال قبل انگریزی زبان میں تحریر فرمایا تھا۔
اب پچاس سال بعد انجمن ترقی اُردو نے اپنے سہ ماہی رسالہ میں اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔
فاضل ممدوح نے انجمن کی درخواست پر اُن اُصول کا ایک خلاصہ بھی تحریر فرما دیا ہے جن کے
مطابق اردو میں اصطلاحات وضع ہونے چاہئیں یہ تحریر اس مضمون کے آخر میں درج ہے۔ ناشر

تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا حکومتِ بنگال نے دیسی زبانوں میں طبی رسائل کی تالیف کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اِس کمیٹی کے دو ارکان کی آراء شائع ہو چکی ہیں لیکن سوال محض طب ہی کی اصطلاحات کا نہیں۔ بلکہ اِس مسئلہ کا تعلق اُن تمام علوم کی مصطلحات سے ہے جو جدید فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ ہمارا مقصد ایک ایسا قاعدہ وضع کرنا ہے جس کے مطابق سائنس کی تمام اصطلاحات کو دیسی زبانوں کا جامہ پہنایا جا سکے۔ کتب سائنس اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ہر قسم کی مغربی تصنیفات کے ترجمہ کے لئے سب سے بڑی مشکل اِن اصطلاحات کی کثیر تعداد ہے جن کے مترادف دیسی زبانوں میں بالکل نہیں ملتے۔ اِسی مشکل کی وجہ سے اُردو میں بہت کم کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ہے اور اچھے تراجم کی تعداد تو اسی وجہ سے اور بھی قلیل ہے۔

اِس مشکل کو رفع کرنے اور دیسی زبانوں کو نو آموز مترجمین کے مضر اثر سے بچانے کے لئے جو ان زبانوں میں مترادف الفاظ کے ہوتے ہوئے بھی بوجہ لاعلمی یا تو نئی اصطلاحیں گھڑ لیتے ہیں یا موجودہ الفاظ کے غلط استعمال سے ایک ایسا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں جو آئندہ نسلوں کو رد کر دینا پڑے گا۔ مستند الرائے حضرات کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسا قاعدۂ کلیہ مقرر کریں جس سے اِس قسم کی تکمیلی اصطلاحات بنائی جائیں جو ہماری نئی علمی ضروریات کو پورا کر سکیں اور ہماری دیسی زبانوں کی فطرت سے ایسی مطابقت رکھتی ہوں کہ بلا تکلف اِن میں ضم کی جا سکیں۔

لیکن اِس مسئلہ میں اختلاف آراء اِس قدر ہے کہ کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا، جس پر تمام علماء جو رائے قائم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں متفق ہو یا اظہار تشفی کریں۔ اسوقت ہمارے سامنے تین مختلف تجاویز ہیں۔ جن میں مختلف خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور ہر تجویز میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اِن میں سے ایک فاضلِ اجل و ماہر علم اللسان بابو راجندر لال متر کا مقبول و عالمانہ تبصرہ ہے۔ علمی اصطلاحات پر اِس سے زیادہ مبسوط بحث پہلے کبھی ہماری نظر سے نہیں گزری دوسرا تبصرہ اِس ملک کے نامور طبیب مولوی تمیز خاں بہادر کے قلم سے ہے جنھیں اس صوبہ کی دونوں زبانوں میں علوم تشریح الابدان و طب کی تعلیم دینے کا بہت عرصہ سے

تجربہ ہے اور سالہا سال سے اپنے ابنائے وطن میں مغربی تعلیم پھیلانیکی
نہایت شوق سے مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ لہذا ان کا قول مسئلہ زیر بحث
کے لئے ایک بہت بڑی سند کا حکم رکھتا ہے تیسری رائے مہتمم مدارس حلقہ بہار
کی ہے جس کا کلکتہ کی کمیٹی سے کچھ تعلق نہیں۔ لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے
کہ اس کے ساتھ بہت سی عملی مثالیں سائنس کی کتابوں کے متعدد ترجموں کی
شکل میں بطور نمونہ دی گئی ہیں جن پر ہم بعد میں حسب ضرورت نظر ڈالیں گے۔
ہم فی الحال ان تمام تجاویز کی نمایاں خصوصیات نہایت اختصار کیساتھ
دکھانے پر ہی اکتفا کریں گے اور اپنی رائے کو کسی آئندہ صفحہ کے لئے محفوظ
رکھتے ہیں۔

بابو راجندر لال متر اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کے زبردست حامی ہیں۔
لیکن وہ ترجمہ لفظی پابندیوں میں جکڑا نہ ہو جس طرح چینی نقل کرتے وقت
مکھی پر مکھی مارتے ہیں بلکہ اس ترجمہ سے ایسے الفاظ پیدا ہونے چاہئیں جو
اشیاء متذکرہ کے لئے علامات کا کام دیں۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ الفاظ
اشیاء کا ایک دھندلا تصور ظاہر کریں جو قدیم زمانے میں کسی نسل نے غلطی سے
ان کے متعلق اپنے ذہن میں قایم کیا تھا جس وجہ سے غلط الفاظ اس کی زبان
میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو گئے اور زمانہ قدیم سے مستعمل ہونیکے باعث اب تک
مروج ہیں۔

صاحب موصوف نے اپنے مقصد کے لحاظ سے جملہ الفاظ کو چھ قسموں میں
تقسیم کیا ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اِن کی تقسیم کی انتہائی موزونیت اور
کمال کا اختصار سے خون کیا جائے۔ لہذا ہم انہیں کے الفاظ درج
کئے دیتے ہیں :-

مختلف علوم کی اِن تمام اصطلاحات کا جو طبی مدارس میں بالعموم پڑھائے
جاتے ہیں بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ چھ اقسام
یا اصناف میں تقسیم کیجا سکتی ہیں جن میں سے ہر قسم اپنی امتیازی خصوصیت
رکھتی ہے۔

پہلی قسم میں زبان کے وہ معمولی الفاظ شامل ہیں جو کبھی کبھی بطور اصطلاحات
استعمال ہوتے ہیں۔

دوسرے قسم کے الفاظ میں جامد اسماء اور مختلف چیزوں کے نوعی نام
شامل ہیں جیسے مالٹ (شعیر منقوع) بیسٹ (خمیر) رنیٹ (   ) وغیرہ
گو یہ الفاظ نہایت عام فہم ہیں لیکن زیادہ تر ایک خاص فن میں استعمال ہونے کی
وجہ سے انہوں نے ایک نیم اصطلاحی شکل اختیار کر لی ہے اور یہ سائنس
اور روزمرہ کی زبان کے بین بین ایک بحث طلب حیثیت رکھتے ہیں۔

تیسری قسم کے الفاظ سائنس کی اشیاء کے غیر اشتقاقی نام ہیں۔ مثلاً کونین
اپی کگوانہا (ایک تلخ دوا جو ایک امریکائی پودے کی جڑ سے حاصل کی جاتی ہے)

بلیریم (ایک دھات) سلینیم (ایک دھات) برومین (ایک مفرد مائع) وغیرہ۔ ابتدا ئً جب یہ الفاظ وضع کئے گئے تو اکثر حالتوں میں جن چیزوں کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اِن کی کوئی خاصیت ظاہر کرتے تھے لیکن اُن میں سے بہت سے الفاظ کے اشتقاقی معنی عرصہ دراز سے مفقود ہو گئے ہیں اور یہ الفاظ اب دوسرے درجہ کے جامد بن گئے ہیں جنھیں سنسکرت میں "یوگ روڑھی" کہتے ہیں۔

چوتھی قسم میں نباتات وحیوانات کے مرکب علمی ناموں کا شمار ہے جو ابتداً اشتقاقی معنی رکھتے تھے۔ لیکن بوجوہِ چند در چند اِن میں سے اکثر الفاظ کی اب یہ کیفیت نہیں رہی اور اب وہ کسی خاص نوع یا جنس کا نام ظاہر کرتے ہیں، جونیسا ایسوکا (Jonesia Asoka) کوئیس بھکتی (Coius bhekti) وغیرہ۔ لہٰذا گزشتہ اقسام کی طرح یہ بھی جامد اسماء تصور کئے جاسکتے ہیں۔

پانچویں قسم سے اُن مفرد الفاظ کو تعلق ہے جن کے اشتقاقی معنی نہایت صاف وصریح ہوتے ہیں اور صرف اسی حد تک کار آمد ہیں جب کہ سلِ مع پر اپنے اشتقاقی معنی بخوبی واضح کر دیں۔ چوں کہ یہ الفاظ صرف علوم وفنون ہی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اِس لئے انھیں خالص اصطلاحی سمجھنا چاہیے۔

چھٹی قسم میں وہ مرکب اصطلاحات شامل ہیں جن کا کم از کم ایک اور اکثر حالتوں میں ہر جزو کچھ نہ کچھ اشتقاقی معنی ضرور رکھتا ہے یہی معنی اُن اصطلاحوں کی

جان ہوتے ہیں اور اس شئی کی نوعیت معلوم کرنے کی غرض سے جس کیلئے کوئی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے لازمی ہے کہ سامع ہر جزو کا مطلب بخوبی سمجھ لے۔

الفاظ کی ان چھ قسموں کا فاضل موصوف نے اس طرح تصفیہ کیا ہے۔ (ہم ذیل کی عبارت صاحب موصوف ہی کے تبصرہ کے خلاصہ سے جس میں انھوں نے مسئلہ ہذا پر شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے نقل کرتے ہیں)

(۱) خلاصہ کلام پہلا قاعدہ جو میں تجویز کرتا ہوں یہ ہے کہ ان تمام اصطلاحات کا جو اشیاء کی صفات ظاہر کرتی ہیں بغیر استثناء ترجمہ کیا جائے یا ضروری ترمیم سے انہیں مفید مطلب بنا یا جائے۔ لیکن اگر ہندوستانی زبانوں میں مترادف الفاظ نہ ملیں تو مفرد اشیاء کے نام یورپی زبان سے لئے جاسکتے ہیں اور اس قاعدہ کے استعمال کے متعلق میری یہ رائے ہے:

(۲) قسم اول کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے۔

(۳) قسم دوم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انہیں موزوں بنا لیا جائے اور بشرط ضرورت ان میں اصلاح کی جائے۔

(۴) قسم سوم کے الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۵) قسم چہارم کے الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے بلا تغیر و تبدل

دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۶) قسم پنجم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انہیں موزوں بنا لیا جائے اور بشرطِ ضرورت اِن میں اصلاح کی جائے۔

(۷) قسمِ ششم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے اور بشرطِ ضرورت اِن میں اصلاح کی جائے۔ لیکن آلات کے نام اِس سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کا صرف اِملا ہی دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۸) مترجمین کی رہنمائی کے لئے چند آسان قواعد مرتب کئے جائیں۔

(۹) اصطلاحات کے مکمل لغات تیار کئے جائیں جن میں دیسی زبان کے مترادف الفاظ یا اُن الفاظ کا اِملا دیسی زبان میں درج ہو جن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر تمیز خاں اِس بات میں تو بابو راجندر لال سے متفق ہیں کہ دیسی زبان کی اصطلاحات اگر مل سکیں تو ضرور اختیار کی جائیں لیکن وہ نئے الفاظ گھڑنے کے موئد نہیں ہیں کیونکہ وہ اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں دیسی زبانوں میں مترادف نہ ملنے کی حالت میں وہ نئی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے عربی و سنسکرت سے کام لینے کے بجائے بہتر یہی سمجھتے ہیں کہ مغربی اصطلاحات کو برقرار رکھا جائے۔

اُن کی رائے حسبِ ذیل ہے :-

اس تجربہ کی بنا پر جو طب انگریزی کے بعض شعبوں کا اُردو بنگالی میں ترجمہ کرنے اور انہیں زبانوں میں اس کی تعلیم دینے سے مجھے حاصل ہے میں وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترجمہ کے لحاظ سے سائنس کی مغربی اصطلاحات تین جداگانہ اصناف میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

صنف اول میں ایسی مشہور و معروف علمی اصطلاحوں کا شمار ہے جن کے صحیح مترادف اُردو و بنگالی دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔

صنف دوم میں وہ بیشمار علمی اصطلاحیں شامل ہیں جو طب کی انگریزی کتابوں میں آتی ہیں اور جن کے ہم معنی الفاظ بظاہر دیسی زبانوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس صنف کا ذکر آگے چل کر پھر آئیگا۔

تیسری اور آخری صنف میں وہ اصطلاحی الفاظ شامل ہیں جو طب کی انگریزی کتابوں میں استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جن کے مترادف فی الواقع دیسی زبانوں میں بالکل موجود نہیں۔ اس صنف میں نسبتاً بہت زیادہ الفاظ شامل نہیں۔

پہلی دو صنفوں کے لئے انھوں نے دیسی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے کی سفارش کی ہے اور ان الفاظ کے انتخاب کے لئے انھوں نے یہ رائے دی ہے کہ قابل مولویوں اور پنڈتوں کی ایک کمیٹی مقرر کیجائے لیکن آخری قسم کے الفاظ کے بارے میں وہ کہتے ہیں:۔

ان الفاظ کے متعلق جو ہیں نئے تیسری صنف میں داخل کئے ہیں یعنی وہ اصطلاحات جن کے ہم معنی الفاظ دیسی زبانوں میں مطلق نہیں پائے جاتے اور جن کی تعداد بدقسمتی سے کچھ کم نہیں بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ترجمہ میں مغربی اصطلاحیں ہی اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں بلا تغیر و تبدل قایم رکھی جائیں یا مترجمین دیسی زبانوں میں انہیں ادا کرنے اور ان کا مفہوم بتانے کے لئے نئے الفاظ وضع کریں۔ اِس دقیق مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کی تائید میں معقول دلائل و براہین پیش کئے جا سکتے ہیں۔ نئے الفاظ گھڑنے کی مخالفت میں جتنے قوی دلائل بیان کئے جا سکتے ہیں اتنے ہی اسکی حمایت میں بھی پیش ہو سکتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ محض سنسکرت، عربی یا فارسی لفظ کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اِس تصور سے کچھ بہتر تصور نہیں ہو سکتا جو اِس کا انگریزی، لاطینی یا یونانی نام سننے اور طالبِ علم کو یہ بتا دینے سے ہوتا ہے کہ فلاں لفظ فلاں شئے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا۔ ہمارے کالج کے مختلف شعبوں کی تعلیم میں اور نیز دوسرے کالجوں میں بعینہٖ کامیابی سے اسی پر عمل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کسی طالب علم سے یہ کہدیں کہ ایک خاص ٹیکے کا نام بائی سیپا

(Biceps) ہے یا ایک خاص عمل کو اسٹالائیڈ (Styloid) کہتے ہیں
یا وہ جسم لمفیٹک گلینڈ (Lymphatic gland) کے نام سے موسوم ہے
اور اِس کو ان الفاظ کا اشتقاق سمجھنے کی زحمت دئے بغیر یہ بتا دیں
کہ فلاں نام صرف فلاں شئے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کسی
دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا تو ہم دیکھیں گے کہ وہ طالب علم
اس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرتا اور یاد رکھتا ہے اور کسی دوسری
چیز کے نام سے خلط ملط نہیں کرتا۔

ان الفاظ کی نسبت جو ڈاکٹر ٹائیلر اور ایسے ہی دوسرے
لوگوں کی محنت سے قبل ازیں وضع ہو چکے ہیں ان کے بہترین
استعمال کے متعلق فاضل ڈاکٹر کا یہ خیال ہے:۔

میرا یہ منشا ہرگز نہیں کہ اِن کی ناقدری کی جائے۔ یا ان
سرگرم نیک نیت اور جلیل القدر مستشرقین کی جانکاہی و عرق ریزی کو
بہ نگاہِ استحقار و استخفاف دیکھا جائے۔ مگر ان الفاظ کو آئندہ مفید و
کارآمد بنانے اور ان لوگوں کو جو محض دیسی زبانوں یا سنسکرت
و عربی سے واقف ہیں۔ یورپ کی علمی اصطلاحات کا اشتقاق
سمجھانے کے لئے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اولاً ترجمہ کی ہر فصل کا
عنوان یورپ کی اصل اصطلاح میں ہو۔ ثانیاً متن کتاب میں

صنف اول و دوم کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور ثانی الذکر کے وضع کئے ہوئے
موضوعہ الفاظ بہ شکل حواشی کتاب میں درج کئے جائیں لیکن کسی
حالت میں بھی انہیں کچھ زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔

ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ ان تبصروں کا اس طرح
خلاصہ درج کر دینے سے ہم نے اول الذکر کی گہری تحقیقات
اور ثانی الذکر کی علمی و ماہرانہ خصوصیت کی کچھ داد نہیں دی
لیکن ان تینوں تجویزوں کے لب لباب کو چوں کہ ہم تھوڑی سی جگہ میں
محدود کرنے پر مجبور ہیں۔ لہذا اب ہم بادل ناخواستہ تیسری تجویز
کی طرف رجوع کرتے ہیں جو دنیائے ہند کے ایک ایسے طبقہ
کی جانب سے پیش ہونے کے باعث جسے ہم اب تک عالم ظلمات
میں بھٹکتا ہوا خیال کرتے تھے۔ ہماری خاص توجہ کی مستحق ہے۔

ہم شروع ہی میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تجویز جو
پٹنہ سے پیش ہوئی ہے اور جس کی منسلکہ رسائل میں توضیح کی گئی ہے
ہمیں نہایت دل کش معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ
تمام ادق اور ثقیل اصطلاحات نکال دی جائیں اور ان کے
بجائے عام لوگوں کی بول چال کے الفاظ اختیار کر کے سائنس کی
تعلیم میں آسانی پیدا کی جائے اور اسے عامۃ الناس کی دسترس

میں کر دیا جائے۔ اور اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو سکتا کہ روزمرہ کی مبہم اور پوچ زبان کی اصطلاحیں وضع کرنے سے علمی ضبط وصحت کا خون نہ ہوگا تو ہم ضرور اس تجویز کی حمایت کرتے اس میں تو کچھ شک نہیں کہ یہ طریقہ نہایت سادہ ہے۔ اور اگر اختیار کیا جائے تو ہمیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہ تو عربی و سنسکرت علوم کی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی حاجت ہے اور نہ سیدھی سادی دیسی بولیوں پر غیر زبان کے الفاظ کا بار ڈالنے کی ضرورت اور الفاظ بھی ایسے الفاظ جن کا نہ تو املا دیسی زبانوں میں صحیح طور پر لکھا جا سکتا ہے اور نہ دیسیوں ہی کے ناآشنا لب ان کا ٹھیک تلفظ ادا کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں صرف یہی کرنا ہوگا کہ غیر زبان کی ایک اصطلاح لے لی اور لوگوں کی عام بول چال میں اس کا مفہوم ظاہر کر دیا۔ اگر دانایانِ فرنگ اپنے حرارت ناپنے کے آلہ کو تھرمامیٹر کہتے ہیں تو پٹنہ کے مترجم صاحب حکماء ہندوستان کی آنے والی نسل کو یہ سکھانا چاہتے ہیں کہ وہ اس آلہ کو "گرمی ناپ" کے نام سے تعبیر کریں۔ اس موقع پر یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ اس دلآویز طریقہ کے وضع کرنے کا سہرا رائے سوہن لال منتظم نارمل اسکول پٹنہ کے سر ہے۔

ہندوستان کی دیسی زبانوں میں علمی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے ہم تین تجویزوں کا خلاصہ درج کر چکے ہیں۔ اب اگر ہم غیر زبان کے الفاظ کو دیسی زبانوں میں لکھنے کا طریقہ اس پر مستزاد کریں تو ہم سمجھیں گے کہ یورپ کی جدید مصطلحات علمیہ کو ہندوستانی جامہ پہنانے کے تقریباً تمام ممکن ذرایع ہمیں معلوم ہو گئے۔ یہ طریقہ کچھ ایسا لغو و مہمل نہیں، لیکن یورپ کے بعض ماہرین تعلیم اکثر اوقات "کاہلانہ بے صبری" یا قومیت کے مغالطہ آمیز فخر کی وجہ سے اس طریقہ کی حمایت کرتے ہوئے اصوات و اُصولِ نحوی کی مناسبت کا کچھ لحاظ نہیں کرتے تاکہ اِن کی مادری زبان کا پلہ کسی طرح بھاری رہے۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب طریقے تین درجوں میں منقسم ہو سکتے ہیں جن میں سے دو انتہائی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور تیسرا ان تینوں کے بین بین ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ مروجہ اصطلاحات کے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں ہے اور موجودہ بحث کا تعلق صرف اِن الفاظ سے ہے جن کے مترادف معلوم نہیں ہیں۔ یہ مترادف معلوم کرنے کے لئے ہمیں یا تو

(۱) مغربی اصطلاحات کو بجنسہ قایم رکھکر انھیں املا کے ایک قت

طلب طریقہ کے مطابق دیسی زبانوں میں منتقل کرنا چاہئے - یا
(۲) اُس خزانۂ الفاظ کو جو عربی و فارسی میں مدفون ہے فراخ دستی
و کشادہ دلی سے صرف کرکے ان اصطلاحوں کا دیسی زبانوں میں
ترجمہ کرنا چاہئے - اور یا
(۳) بعض مغربی مصطلحات بجنسہٖ قایم رکھنے اور بعض کا ترجمہ
کرنے سے اِن دونوں طریقوں کو مخلوط کردینا چاہئے -
پہلا طریقہ ہرگز قابل التفات نہیں اِس لئے بالکل نظرانداز
کیا جاتا ہے - کوئی سمجھ دار ہندوستانی ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے
اتفاق ظاہر نہیں کرے گا - اور نہ کوئی سمجھ دار یوروپین اس کا
مؤید ہوگا - اِس سے ہماری مادری زبان دوغلی بن جائے گی -
ہم اس بات کا بہ آسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اِس طریقہ پر عمل
کرنے سے ہمارے آئندہ پنڈت لاطینی نما ہندوستانی لکھیں گے
اور ہندی نما لاطینی بولیں گے - اِس کا تصور ہی اِس قدر مضحکہ خیز
اور عجیب و غریب ہے کہ ذہنیات سے اِس کو علمیات میں لانیکی
کچھ ضرورت نہیں - سوال فی الحقیقت صرف یہ رہ جاتا ہے کہ آیا
ہمیں مغربی علوم کی تعلیم صرف بواسطۂ انگریزی دینی چاہئے ؟
اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو سب الفاظ کا املا دیسی حروف

ہیں لکھنے کے طریقہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔

بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انگریزی اصطلاحات عوام سے خراج مقبولیت حاصل کر سکیں گی، جو ہمیں بالکل محال نظر آتا ہے تو پھر بھی اِس طریقہ پر یہ سخت اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ الفاظ اپنے اصلی ماخذوں سے بالکل منقطع اور دیسی زبان کے متعلمین کی نظر میں ہمیشہ اجنبی رہیں گے اور متعلمین پر اتنے ہی گراں گزریں گی جتنے کہ چینی زبان کے حروفِ تہجی سوائے چینیوں کے اور سب پر گراں گزرتے ہیں۔

اب ہم ترجمہ کی بحث کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ اور اِس اُصول کو ایک بدیہی صداقت سمجھ کر ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ترجمہ میں ہمیں ہمیشہ سادگی یکسانی اور صحت کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اِن تینوں شرائط کو نہایت پابندی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے ہمارے طریقِ عمل کے اصول موضوعہ کیا ہوں اور ہماری رہبری کے لئے کیا قواعد مقرر کئے جائیں؟ اس سوال کا شاید یہ جواب ہو سکتا ہے:۔

(۱) مفرد اشیا کے تعبیر کرنے میں مفرد الفاظ کو مرکب الفاظ پر ترجیح دینی چاہیئے۔

(۲) وہ مصطلحات جو اشیاء متذکرہ کی کوئی خاصیت ظاہر کرتی ہیں ان اصطلاحات پر جو کوئی خاصیت ظاہر نہیں کرتیں مرجح ہیں۔

(۳) اگر ہندوستانی متعلم کے لئے انگریزی اصطلاح اور اس کے ترجمہ میں برابر کا اشکال ہو اور ایک کو دوسرے پر کچھ بھی فوقیت نہ ہو تو یکسانی کی خاطر دیسی اصطلاح کے بجائے انگریزی اصطلاح قایم رکھنی چاہئے۔

(۴) مرکب اشیاء کے تعبیر کرنے میں مرکب اصطلاحات کو ترجیح دینی چاہئے اور یہ اصطلاحات ایسی ہوں کہ مرکب کے اجزا پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں۔

(۵) ایک ہی قسم کی چیزوں کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی قسم کے مرکبات و مشتقات کو مرجح سمجھنا چاہئے۔

(۶) مروجہ اصطلاحات میں خواہ یوروپی ہوں یا ایشیائی کوئی ایسی اصطلاح قایم نہیں رکھنی چاہئے جو کسی شئی کی نوعیت یا خاصیت کی نسبت غلط خیال پیدا کرتی ہو۔

ممکن ہے کہ یہ قواعد ناکافی ہوں اور شاید ان میں کسی قدر ردوبدل کی بھی ضرورت ہو لیکن ان سے ہمیں اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ہم ایک قلیل مدت میں اپنی زبان کے لئے وہ کام

کرنا چاہتے ہیں جیسے مغربی زبانوں کے لئے کرنے میں عمریں صرف ہوگئی ہیں تو ہمارے طریق عمل کی حدود ہونی چاہئیں۔ ہم یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمارا اصول سادگی یکسانی اور صحت ہونا چاہئے سادگی اور صحت تو شاید پیدا کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہندوستانی زبانوں کی اس کثرت کی صورت میں یکسانی کیونکر پیدا کی جائے گی؟ ہم دور کیوں جائیں خود ہمارے چھوٹے سے صوبہ میں اردو اور ہندی کے جھگڑے کا کیا تصفیہ ہوگا؟ کیا ایک صوبہ کے لئے ہم دو قسم کی اصطلاحات مقرر کریں؟ اس مشکل کا پورا احساس اِن دونوں فضلاء میں سے جن کے تبصرے اِس رسالہ کی اشاعت کے محرک ہیں کسی کو بھی نہیں ہوا۔

کچھ عرصہ ہوا اُردو اور ہندی کے مسئلہ پر ایک گرم مباحثہ عام ہوا تھا جس میں ناظرین کو یاد ہوگا کہ سر سید احمد خاں سی۔ ایس۔ آئی نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ ہم اس بحث کو یہاں دوبارہ نہیں چھیڑنا چاہتے لیکن عربی اور سنسکرت کی ذاتی خوبیوں کے متعلق ہمیں چند الفاظ ضرور کہنے چاہئیں کیونکہ ہمارے موجودہ مبحث سے اِس مسئلہ کو بہت بڑا تعلق ہے۔

اِس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اِن دونوں زبانوں کے

ادبی ذخائر ناپیدا کنار ہیں۔ خوبی کلام و ضاحت معانی، اور خالص فلسفیانہ نکات کی چھان بین کے لئے سوائے یونانی کے دنیا کی باقی تمام زبانوں میں یہ اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ لیکن اگر ان دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ نوع انسانی کی اُن دو بڑی آبائی نسلوں کے دماغ، خصائل، جذبات اور تاریخ میں ہے جن کے اجتماعی، اخلاقی، ذہنی اور تمدنی تجربہ کی یہ مظہر ہیں خیالات کے صحیح اظہار اور تعین کے لئے یہ دونوں زبانیں اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں ہیں۔ لیکن سنسکرت کو عربی پر یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس میں الفاظ کے بے شمار مرکبات و مشتقات بن سکتے ہیں اور آگے پیچھے الفاظ بڑھا کر ان میں کئی طرح سے تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے اگرچہ اس بات کے اعتراف کرنے سے ہم لوگوں کی انانیت کو (جو اردو بولتے ہیں) صدمہ ضرور پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان عربی اس لحاظ سے نہایت کم مایہ ہے۔ اس میں صرف ایک سابقہ "ال" اور ایک لاحقہ "ی" ہے۔ اس میں مرکب الفاظ بنانے کی صلاحیت بہت کم ہے اور یہ اس لئے کہ اس کے مرکبات کی صرف چار قسمیں ہیں جن میں سے دو ہمارے اغراض کے لئے محض بیکار ہیں۔ مشتقات کے لئے تو یہ قاعدہ کلیہ مقرر ہے کہ داخلی حروف علت کو

بدل دیا جائے (اور سامی زبانوں کا یہ ایک امتیاز خصوصی ہے) لیکن نئے الفاظ بنانے کے لئے اس میں کوئی ایسا لچکدار قاعدہ موجود نہیں جو ہر حالت میں کام دے۔ جو مرکب الفاظ اس زبان میں بن سکتے ہیں انہیں ہم سوائے ایک مشتبہ استثناء کے واحد کلمۂ صرفی قرار ہی نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ اِن مرکبات کے اجزا کی انفرادی و ابتدائی حیثیت بدستور قایم رہتی ہے اور انہیں الگ الگ ہی سمجھنا پڑتا ہے یہ ہے وہ مدد جو اُردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں ہمیں عربی سے مل سکتی ہے۔

ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ عربی زبان بعض صرفی اور لسانی خصوصیتوں کی وجہ سے مرکب اور مشتق الفاظ بنانے میں اتنی مفید امداد نہیں دے سکتی جتنی سنسکرت دے سکتی ہے۔ اگر گنجایش ہوتی اور ہم یہ سمجھتے کہ عربی کے کثیر الفاظ کا انگریزی حروف میں لکھنا ایک انتہا درجہ کا محنت طلب کام نہیں ہے تو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں بے شمار مثالیں پیش کرتے جنھیں عربی داں حضرات جھٹلانے کی کبھی جسارت نہیں کر سکتے اِس زبان کو (جس کا خود راقم بڑا مداح ہے) اِس نقصِ صریح کا ملزم قرار دینے کے بعد اب انصاف یہ ہے کہ ہم دوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالیں۔

یہ ایک مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے کہ اندلس اور شام کے عرب یورپ کی علمی ترقی کے ابوالآبا تھے۔ اِس زمانہ میں جبکہ دُنیا کے اور لوگوں پر دماغی ظلمت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی عرب وادی الکبیر اور فرات کے کناروں پر علمی و ادبی مشاغل میں مصروف تھے جربرٹ کی طرح جو بعدازاں پوپ سلوسٹر کے نام سے مشہور ہوا مسیحی طلبہ صدیوں تک مسلمان فلسفیوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے اور علم و فضل میں اعجوبۂ روزگار بن کر اپنے وطن کو لوٹتے رہے ہیں۔ ابن رشد اور ابن سینا کی تصانیف صدہا سال تک مغربی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شریک رہے ہیں اور پروفیسروں نے اپنے مسیحی شاگردوں کو اِن ہی کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے۔ یہی عرب یونانی علوم کے امین اور یونانی تہذیب کے محافظ اور حامل تھے اگر یہ نہ ہوتے تو یورپ کی وہ ادبی اور علمی دولت جو اِس کے عروج کا باعث ہوئی کبھی نصیب نہ ہوتی۔ بلکہ خود یہ عروج ایک غیر معین عرصہ تک رُکا رہتا۔ وہ اپنے یونانی اُستادوں کی کچھ کورانہ تقلید بھی نہیں کرتے تھے گو اُن کے عیب جو کبھی کبھی اُن پر یہ الزام لگانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ وہ یکے بعد دیگرے تحقیق کے ہر میدان میں قدم رکھتے تھے۔ ہیئت اور طب کا مطالعہ وہ

نہایت شوق سے کرتے تھے۔ علم المناظر اور جرّ ثقیل میں اُنھوں نے ایسی ایجادیں کی ہیں جن کی یکجن سکے زمانہ سے بعد کے لوگ پوری قدر نہیں کر سکتے۔ کیمیاگری کے بے سود انہماک سے انھوں نے اصلی علمِ کیمیا کی بنیاد رکھی۔ جعفر نے شورے کا تیزاب اور ماء الملوک دریافت کیا۔ اسی شخص نے سب سے پہلے یہ بات عالم آشکار کی کہ دھات مکلس ہو کر بھاری ہو جاتی ہے۔ گندھک کا تیزاب اور الکحل اوّل اوّل رازی نے بنایا اور ایک بعد کے موجد نے فاسفورس جیسی ضروری شئے پہلے پہل تیار کی۔ لنگر کی حرکت سے وقت کا اندازہ کرنا بھی ایک عربی ایجاد ہے۔ اور وہ شخص جس نے مساوات درجۂ دوم کے حل کا معمولی طریقہ دریافت کیا ایک عرب ریاضی دان ہی تھا ہئیت اور طبعیات میں ریاضی کے استعمال کے محرک اول بھی عرب ہیں۔ ارضیات، نباتات، حیوانات اور معدنیات کے تو وہ بانی ہی قرار دئیے جا سکتے ہیں۔ عرب جرّاح نہایت مہارت اور صفائی سے عمل جرّاحی کرتے تھے۔ اور آلاتِ جرّاحی بھی رائج تھے۔ سفر و سیاحت کے شوق نے ان کی قرابادین کو بہت وسیع کر دیا۔ اور ادویہ میں بھی معتد بہ اضافہ ہوا جن سے انھوں نے خوب کام لیا۔ ڈریپر لکھتا ہے کہ "طب کے نظری اور عملی مسائل میں

جہاں تک افعال اعضائے انسانی کی تصریح اور معالجۂ امراض کو تعلق ہے ۔ کیمیا کا استعمال طب میں عربوں نے شروع کیا ۔ جراحی میں بھی وہ اپنے طبی علم سے کچھ کم نہ تھے ۔ ابوالقسیس قرطبی خود اپنے فن اور نیز فن دایہ گری کے نہایت نازک عمل جراحی انجام دینے میں ذرا بھی نہ جھجکتا تھا ۔ وہ بلا تامل چاقو استعمال کرتا اور گرم سلائی کے داغ لگاتا تھا ۔

علم المناظر میں ابن ہثیم کے اکتشافات فی الحقیقت ایک بلند پایہ رکھتے ہیں ۔ سب سے پہلے اسی شخص نے بینائی کی صحیح تشریح کی اور یہ بتایا کہ شعاعیں مرئی اشیاء سے منعکس ہو کر آنکھوں کے پردۂ شبکیہ پر پڑتی ہیں اور ان کا اثر بذریعۂ عصبۂ مجوفہ دماغ تک پہنچتا ہے ۔ وہ دو آنکھوں کو ایک ہی چیز کے دکھائی دینے اور فریب ہائے نظر کی نوعیت سے کامل طور پر آگاہ تھا اور ان واقعات کے اسباب وعلل کو بھی بخوبی جانتا تھا ۔ اسی شخص نے اول اول یہ بات معلوم کی کہ کرۂ ہوا کی کثافت ہر جگہ یکساں نہیں ہے اور اس لئے روشنی کی آڑی شعاعیں ہوا میں سے گذرتے ہوئے منحنی اور زمین کی جانب مقعر ہو جاتی ہیں ۔ کرۂ ہوا میں انعطاف نور کے اس عظیم الشان کلیہ سے اس نے شفق ، تاروں کے جھلملانے ، اور

افقی حالت میں عمودی قطر شمس وقمر کے بظاہر کم ہو جانے کی تشریح کی۔ انہیں اکتشافات سے کام لے کر اس نے کرۂ ہوا کی بلندی دریافت کی اور اس کی حد تخمیناً ۵۰ میل مقرر کی۔ جر ثقیل اور سکونیات سیالی میں بھی اُن کے اکتشافات اسی قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ہماری میز پر جر ثقیل، علم المناظر، اور اسی نہج کے چند اور عربی رسائل موجود ہیں۔ خود تو یہ رسالے نہایت مختصر ہیں لیکن ان میں ایسی بڑی بڑی کتابوں کے جابجا حوالے دئے گئے ہیں جو آج کل ہر جگہ، بالخصوص اِن ملکوں میں مطلقاً معدوم ہیں۔ گو یہ رسالے مختصر ہیں لیکن اِن سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ عرب بڑی بڑی قوائے الیہ کو خوب اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، اِن کے استعمال اور اُن تمام حالتوں سے بخوبی واقف تھے جن میں طاقت کم لگانی پڑتی ہے ہم نے "میزان العقل" جو ابن ہثیم کے نام سے منسوب کیجاتی ہے خود تو نہیں دیکھی لیکن اگر ڈریپر اور موسیو خانیکوف کی شہادت معتبر خیال کیجائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ طریسلی کی مشہور ایجاد سے کئی سو سال قبل ابن ہثیم نے کرۂ ہوا کے وزن اور زیادتی کثافت کے باہمی تعلق کو کتاب مذکور میں واضح طور پر بیان کر دیا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ کثیف واسطہ میں اشیاء کا وزن گھٹ جاتا ہے اور مرکز جاذبہ کے اصول

اور تیرنے والے اجسام کی کنہ سے بھی وہ آگاہ تھا۔ لنگر دار گھڑی اور مائع پیما بھی اسے معلوم تھے۔ مؤخر الذکر سے اس نے اجسام کی کثافتِ اضافی دریافت کی۔ علم الحیات میں تدریجی ترقی کے اُصول کا جس سے یورپ کے حکما، اب روشناس ہوئے ہیں وہ موئد تھا۔ ابن سینا نے اپنے زمانہ میں قشرۃ الارض کی ساخت کی تشریح کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس انکشاف کو اب انسٹڈ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

علوم و فنون کے اُن میدانوں کا خاکہ کھینچنے میں جن میں قدیم زمانہ کے عربوں نے قدم رکھا تھا ہم نے بہت سی جگہ صرف کی ہے اور ناظرین کے صبر کا کافی امتحان لیا ہے اور یہ اس غرض سے کہ یورپ اور عرب کے علوم میں جو نمایاں باہمی قربت ہے وہ ثابت ہو جائے۔ ہم یہ بعد میں بتائیں گے کہ اس امر کو ہم اس قدر اہم کیوں سمجھتے ہیں۔

فی الحال ہمارا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ مغربی اصطلاحات کا اُردو، ہندی، یا بنگالی میں بہترین ترجمہ کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ بنگالی یعنی بنگال کی ہندی ہمارے صوبہ کی ہندی کی طرح سنسکرت ہی میں سے پیدا ہوئی ہے۔ اور اس میں اتنی لچک ہے کہ مترجم

نئے الفاظ گھڑنے کے لئے اسے حسب ضرورت استعمال کر سکتا ہے۔ نئی اصطلاحیں ایک دفعہ بنگالی یا ہندی میں داخل ہونے کے بعد ان زبانوں کا جزو بن جاتی اور قدیم زمانہ کے اختیار کردہ الفاظ کی طرح کام دیتی ہیں۔ لیکن زبان اُردو اِس مداخلت کی اس وقت تک متحمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے موجودہ نظام میں ایک اُصولی انقلاب پیدا نہ ہو جائے اور اُردو دان حضرات ہندی کی طرف زیادہ مائل نہ ہوں۔ اِن اُمور سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ تبدیلی ہمارے لئے باعثِ مسرت ہو گی۔ کیونکہ ہمیں پورا یقین ہے کہ اُردو اور ہندی میں جتنا زیادہ اتحاد و تطابق ہو گا، اتنا ہی اُردو کو فائدہ پہنچے گا۔ لیکن ہمیں خوف ہے کہ اِس قابل قدر مقصد کے پُورا ہونے میں بہت عرصہ لگے گا گو اس کی انتہائی کامیابی میں ہمیں مطلق شبہ نہیں۔ جب تک ہندوستان کے مسلمان اپنے اختیار کردہ وطن میں اپنی حیثیت کا غیر منصفانہ خود غرضانہ خیال ترک نہ کر دیں، سامی عنصر ہماری مادری زبان میں غالب رہے گا مسلمان جب یہ سمجھنے لگیں گے کہ وہ ہندی پہلے ہیں اور عرب بعد میں یعنی جب انہیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ ہندوستان کی متحدہ قومیت میں وہ کوئی غیر عنصر نہیں جو اتحاد میں

حاج ہو بلکہ اسی کا ایک جزو ہیں۔ جب وہ عربستان اور عربوں کے بجائے ہندوستان اور ہندؤں کو اپنی برادری کے لئے منتخب کریں گے تو اس وقت مشترکہ زبان اور متحدہ قومیت کا خواب پورا ہوگا۔ لیکن ہمیں موجودہ حالات سے خواہ وہ کیسے ہی ہوں پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کے لئے یکساں اصطلاحات وضع کرنا فی الحال ناممکن ہے۔ اور مؤخرالذکر کو علاوہ سنسکرت کے دیگر ذرایع سے بھی کام لینا چاہئے۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اکثر بڑے بڑے علوم کی ابتدا جو ترجمہ کے قابل ہیں عربی میں ہوئی ہے اور جس قدر اصطلاحیں ان علوم کے مبادیات کے لئے ضروری ہیں تحقیقات سے عربی میں معلوم ہو سکتی ہیں۔ عربی ماخذ سے ہماری علمی لغت میں بہت بڑا اضافہ ہو سکتا ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے موجودہ اہل فرنگ بھی عربوں کے علمی انہماک کا اعتراف کرتے ہوئے منفعل نہیں ہوتے اور الکحل (الکحل) الکمی (کیمیا) الجبرا، زینیھ (سمت) ناڈر (نظیر) الیکسر (اکسیر) سرپ (شربت) جولپ (جلاب) اور اسی قسم کے متعدد الفاظ بکثرت استعمال کرکے اپنی ممنونیت ظاہر کرتے ہیں تو ہم اس ذخیرہ کی تحصیل سے

فائدہ اُٹھانے میں کیوں تامل کریں؟ ان الفاظ کی تعداد کا صحیح اندازہ جو اس طرح مل سکتے ہیں کوئی شخص اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ حاجی خلیفہ کی تصنیف یا "مدینۃ العلوم" کی کتاب ملاحظہ نہ کرے جس میں کتابوں کی تاریخ درج ہے اور جب تک اسے ان مضامین کا علم نہ ہو جن پر عربوں کی توجہ مبذول رہی ہے اس کے ساتھ ہی ان الفاظ کو کوئی شخص اس وقت تک قابل استعمال نہیں بنا سکتا جب تک کہ عربی کی تمام موجودہ علمی کتابوں کا ذخیرہ فراہم کرکے اس کو لائق علماء کی ایک جماعت میں پیش نہ کردے۔

علاوہ ازیں ایک اور ایسا ماخذ ہے جس سے زبانِ اُردو بلا تکلف الفاظ مستعار لے سکتی ہے اور عربی اس کی بیحد ممنون احسان ہے ہمارا اشارہ یونانی زبان کی طرف ہے۔ ڈاکٹر تمیز خاں کے علمی ذوق اور باریک بین نگاہ نے اس نکتہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کا یہ خیال ہے کہ تمام یونانی الاصل الفاظ جو طب اور دوسرے علوم میں مستعمل ہیں اس قدر ترمیم کے ساتھ جو ہماری زبان کی ضروریات کے لحاظ سے لازم ہو اختیار کر لینے چاہئیں۔ کیونکہ قدیم زمانہ کے عربوں نے یہ الفاظ مستعار لے کر ہمارے لئے ایک مثال قایم کردی ہے اور یہ خیال ہے بھی صحیح۔

اِن زبانوں کے علاوہ فارسی ہماری زبردست معاون ہوگی اس سے ہمیں بے شمار الفاظ دستیاب ہوں گے اور چونکہ یہ ہندی اور اُردو دونوں سے نہایت قریبی تعلق رکھتی ہے اس لئے اس حالت میں جب کہ ہمیں دیگر ذرایع سے ثقیل اور مغلق الفاظ ملتے ہوں یا الفاظ مطلق نہ ملتے ہوں یہ بے حد کار آمد ثابت ہوگی مرکبات اور مشتقات بنانے کا بھی اس میں ایک نہایت عمدہ قاعدہ ہے جو اردو کے مروجہ قواعد سے اس قدر مشابہ ہے کہ اِس نیم اجنبی ماخذ کے نئے الفاظ سے بھی ہم بہت جلد مانوس ہو جائیں گے۔

الغرض اپنی ضروریات کے لئے ہم حسب ذیل الفاظ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں:۔

(۱) سنسکرت، عربی، فارسی، اور ان مغربی الاصل الفاظ سے جو ہماری زبان میں مروج ہیں۔

(۲) مصطلحات سے جو عربی کی کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن عام طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔

(۳) عربی کے مرکبات و مشتقات سے جو خاص قواعد کی پابندی سے وضع کئے جائیں۔

(۴) یونانی یا لاطینی اصل کی علمی اصطلاحوں سے جن میں بہ تقلید اہلِ عرب ہماری زبان کی صوتی خصوصیات کے موافق ترمیم ہو جائے۔

(۵) مفرد مشتق یا مرکب الفاظ سے جو فارسی سے مستعار لیئے جائیں

اب ہم اپنے مجوزہ طریقہ کی مفصل توضیح کے لئے ہر قسم کی چند مثالیں پیش کریں گے۔

(۱) پہلی قسم کے الفاظ کی مثالیں ہر شخص کو سوجھ سکتی ہیں مثلاً کیمیا میں فلز یا دھات (Metal) قرع انبیق (Alembic or Retort) اور تیزاب (Acid) وغیرہ الفاظ مستعمل ہیں علم تشریح الابدان اور طب میں قلب یا دل (Heart) ریشش یا پھیپھڑا (Lungs) طحال پتی یا پتہ (Spleen) کبد یا جگر (Liver) دماغ (Brain) رگ یا نس (Vein) بحران (Crisis) اتپ (Fever) مدر (Diuretic) مسہل (Purgative) ملین (Apperient) اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ سے اردو دان حضرات بخوبی واقف ہیں۔ طبعیات اور ہیئت میں زور یا بل (Force) حرکت یا چال (Motion) وزن ثقل یا بوجھ (Weight) حرارت یا گرمی (Heat) سیّارہ (Planet) ثوابت (Fixed Stars) افق (Horizon) وغیرہ الفاظ

موجود ہیں۔
(۲) دوسری قسم کے الفاظ ایسے ہیں جیسے کیمیا میں ملحیات
(Saline bodies) دہنیات (The firedoil) تخلخل (Porosity)
مائع (Liquid) سیال (Fluid) بخار (Vapour) وغیرہ یا جیسے
علم تشریح الابدان اور طب میں شریان (Artery) اعصاب
(Tendons) عضلات (Muscles) جمجمہ (Skull) اجواف
(Cavities) غدود (Glands) مشیمہ (Secondines) مخدرات
(Palliatives) استسقاء (Dropsy) استرخا یا فالج (Paralysis)
نطول (fomentation or Embrocation) وغیرہ۔ یا طبعیات وہیئت میں
بیرم (Lever) بکرۃ (Pulley) مرکز (fulcrum) تعدیل (Equilibrium)
محور (Axis) ارتفاع (Altitude) طول بلد (Longtitude) عرض بلد
(Lotitude) جیب (Sine) وغیرہ۔
(۳) تیسری قسم کی ہم صرف چند ہی مثالیں بیان کریں گے۔
اگر ناظرین زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو انہیں علم تشریح الابدان
پر ڈاکٹر ٹائٹلر کی قابلِ قدر عربی تالیف یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ
اور مولوی کمال الدین لکھنوی کے تراجم ملاحظہ کرنے چاہئیں۔
لیکن ہم ان الفاظ کے مسترد کرنیکا حق محفوظ رکھتے ہیں جو ذوقِ سلیم

یا قواعدِ صرف کے خلاف وضع کئے گئے ہوں - اس قسم کی مثالیں
ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

مقیاس الحرارت (Thermometer)

حاصل القوا (Resultant of forces)

ثنائی الترکیب (Diatomic Substances)

ثلاثی الترکیب (Triatomic)

تکاثف (Density)

معیار (Test)

علم السکون (Statics)

علم الحرکت (Dynamics)

حرکت عمودی (Vertical motion)

افقی (Horizontal)

وضعِ افقی (Horizontal Position)

وضع اصطلاحات میں اس سے بہتر اختراعات بھی کی جا سکتی ہیں
لیکن ہمارے مقصد کے لئے یہی کافی ہیں -
(۴) چوتھی قسم کے الفاظ ان نمونوں کے مطابق اختیار
کئے جا سکتے ہیں جو پہلے ہی سے موجود ہیں - مثلاً عرب (Cornea)

کے لئے قرنیہ (Diabetes) کے لئے ذیابیطس یا زیابیطس (Storax)
کے لئے اصطرک (Astrolabe) کے لئے اصطرلاب - اور (Is a gogue)
کے لئے ایساغوجی استعمال کرتے ہیں - اور اسماء معرفہ میں (Euclid)
کو اقلیدس (Pythagoros) کو فیثاغورث اور (Socrates) کو سقراط کہتے ہیں
ہم بھی اسی طرح سے اِن کی تقلید کرتے ہوئے (Morphio) کے لئے
مرفیہ (Cryolite) کے لئے قرولطیس (Crystal) کے لئے کرسٹل یا کرسطلس
جو یونانی زبان کے مروجہ لفظ اسطوخودوس کی طرح بنا سکتے ہیں۔
(Hyperstene) کے لئے ہیفرسطینو اور (Mogilus) کے لئے مجیلس
استعمال کرسکتے ہیں - ہم (Dioptase) کو ذیاپطیس (Spar) کو اسپار یا اسپا
(Cormine) کو کرمین اور (Iodine) کو آیوڈین کہہ سکتے ہیں وعلیٰ ہٰذا القیاس - ہمارا یہ
مطلب ہرگز نہیں کہ جن الفاظ کا صحیح تلفظ ہم نے بدل دیا ہے
وہ بعینہٖ اسی صورت میں اختیار یا قبول کرلیا جائے اور نہ ہم قدرت
رکھتے ہیں کہ مغربی الفاظ کا املا دیسی زبان میں صحیح طور سے
لکھ سکیں ہم نے محض اس اصول کی تشریح کے لئے روا روی میں
چند مثالیں پیش کردی ہیں کہ مغربی الفاظ جو مستعار لئے جائیں ہماری
صوتی ضروریات کے موافق بدل دئے جائیں تاکہ دیسی زبانوں کے
علماء کے ہاتھوں ان کی زیادہ گت نہ بنے اور جہاں تک صحت لفظی کی

تعلق ہے ان کی بے شمار جداگانہ شکلیں پیدا نہ ہوں ٹیکس، کورٹ
اپیلانٹ، رسپانڈنٹ، وغیرہ الفاظ کی عوام کی زبان پر آکر جو ئیت
کذائی ہوگئی ہے اس سے ہم واقف ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی
علم ہے کہ اِن الفاظ نے کس قدر بوقلموں بھونڈی شکلیں اختیار
کر لی ہیں۔ اِس سے ہمیں متنبہ ہو جانا چاہیئے کہ غیر زبان کے تمام
الفاظ بجنسہ اپنی زبان میں لے لینا کتنا نقصان دہ ہے۔ ہمیں
نئی اصطلاحات کے صرف انتخاب ہی میں نہیں بلکہ ان میں اپنی
زبان کا ٹکسالی روپ پیدا کرنے میں بھی یہ دانشمندانہ احتیاط
ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ اِن الفاظ کی اصلی خوبو ہمیشہ باقی رہے
اور لوگوں میں ان کی بگاڑی ہوئی صورتیں رائج نہ ہونے پائیں۔

(۵) پانچویں قسم کی صدہا مثالیں دی جاسکتی ہیں (Air-pump)
کے لئے بادکش (Water-pump) کے لئے آبکش (Anthropomorphus)
کے لئے آدمی پیکر (Genus tubuloina) کے لئے نے نما (Pachydermata)
کے لئے سخت جلد وغیرہ الفاظ گھڑ سکتے ہیں۔ (Caly) کا ترجمہ ہم
برگ بیرونی کرسکتے ہیں اور (Corolla) کا برگ اندرونی۔ ہم ناظرین
کو یہاں پھر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان اصطلاحات کو ہم الفاظ
مذکور کا موزوں ترین ترجمہ ہرگز تصور نہیں کرتے۔ ہم نے تو چند

توضیحی مثالیں پیش کی ہیں اور بس - اگر انتخاب کا مسئلہ واقعی درپیش ہو تو شاید ہم بہ لحاظ اختصار و وضاحت عربی یا ہندی الفاظ کو ترجیح دیں -

ہم یہ جانتے ہیں کہ مجوزہ طریقہ پر عمل کرنے سے سب سے بڑی مشکل کا سامنا ان اصطلاحات کے تصفیہ میں ہو گا جن کا ترجمہ سوائے ادق لغات یا طویل مرکبات استعمال کرنے کے ہو ہی نہیں سکتا - اور جنھیں یاد رکھنے کے لئے حافظہ پر بہت بار پڑتا ہے - ہم پر یہ امر بھی بخوبی روشن ہے کہ ان تراجم کا ایسے نکتہ چین حضرات بے حد مضحکہ اڑائیں گے جو اِس طریقہ پر خود کبھی طبع آزمائی نہ کرنے کی وجہ سے اِس کی عظیم مشکلات کا صحیح اندازہ کرنے کے ہرگز اہل نہیں - لیکن ہم وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ جن قواعد کے مرتب کرنے کی ہم نے جرأت کی ہے ان پر پابندی تمام عمل پیرا ہونے سے یہ مشکل اول تو بالکل جاتی رہے گی ورنہ کسی حد تک کم تو ضرور ہو جائے گی - اگر مفرد الفاظ مِل سکیں تو ہمیں طویل مرکبات کو مسترد کر دینا چاہیئے اور اِس طرح وضاحت یا لفظی مفہوم کو اگر خفیف سا صدمہ بھی پہنچ جائے تو اس کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے - لیکن ہمیں کوئی قابل اعتراض لفظ اختیار کرنا ہی پڑے تو اُسے بدرجہ

مجبوری قبول کرنا چاہئیے اور تا حد امکان اسے کار آمد بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمارا خیال ہے کہ عربی کے بھونڈے مرکب الفاظ بھی بعض اوقات تھوڑی سی قوتِ تمیزی صرف کرنے سے کسیقدر موزوں بن سکتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ٹاٹلر نے (StYtloglossus) کے لئے لفظ مشلیّۃ لسانیّۃ استعمال کیا ہے۔ اگر یہی لفظ رکھنا منظور ہو تو ہم اسے بدل کر لسانیۃ مشتمل بنا سکتے ہیں (Sublingual glands) کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اتنا بڑا لفظ تجویز کیا ہے کہ اس کا تلفظ ادا کرنے میں جتنا وقت لگتا ہے اِس سے کم وقت میں علم طب کا ایک متوسط طالب علم جو فوجی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اپنے آلۂ جراحی سے کام لیکر ان غدودوں کا وجود ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن صرف کے سخت قواعد سے کسی قدر انحراف کے بعد اگر ان غدودوں کو تحتانیہ غدین اللسانی یا غد تحت اللسانی کہا جائے تو اِس لفظ میں کافی اختصار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اکثر حالتوں میں جب ایسے چھوٹے چھوٹے کلمے مطلوب ہوں جو آسانی سے یاد رہیں اور بلا وقت بولے جا سکیں تو عربی میں مرکبات مزجی یا امتزاجی اور بنائی کی قسم کے اسماء معرفہ وضع کرنے کے قاعدہ کے مطابق بہت سے الفاظ ایک کلمۂ واحد کی شکل میں ضم کئے جا سکتے ہیں۔ اس پر عربی کے

علماء اور دیگر ثقات کو بھی چیں بہ جبیں ہونے کا موقع نہ ملے گا
کیونکہ اس تجویز سے ان کی چہیتی قدیم زبان کے تقدس پر
حملہ کرنا مقصود نہیں، اور اگر ہم کسی خلاف محاورہ غلطی کے مرتکب
ہوں تو انہیں پورا اختیار ہے کہ اسے ہماری زبان اردو کے
کھاتے میں ڈال دیں۔ جس کا شمار کلاسیکل زبانوں میں نہیں ہے
ہم یہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ بوقت ضرورت ہم فارسی جیسی
لطیف زبان سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ اِس لئے اس قسم
کی حقیقی مشکلات شاذ و نادر ہی پیش آئیں گی۔ ہر حالت میں
خوش مذاقی اور موزونیت کا اصول مدنظر رکھنے سے مترجمین کو
بہترین الفاظ کے انتخاب میں مدد ملے گی۔ اصلی الفاظ کا قائم رکھنا
مترجمین کا آخری چارہ کار ہونا چاہئے اور وہ بھی انتہائی مجبوری
کی حالت میں۔

لہٰذا مولوی تمیز خاں بہادر کی قابلیت اور پختہ تجربہ کا پورا
احترام کرتے ہوئے ہم ان سے اختلاف ظاہر کرنے پر مجبور ہیں
جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:۔

"میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ محض سنسکرت، عربی یا فارسی کے لفظ
جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اس تصور سے کچھ بہتر تصور نہیں ہوتا

جو اس کا انگریزی، لاطینی، یا یونانی نام سننے اور طالب علم کو
یہ بتا دینے سے ہوتا ہے کہ فلاں لفظ فلاں شئے کے لئے استعمال
کیا جاتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا۔ ہمارے
کالج کے مختلف شعبوں کی تعلیم میں اور نیز دوسرے کالجوں میں
بعینہ یہی بات نہایت کامیابی سے عمل میں آتی ہے لیکن اگر ہم
کسی طالب علم سے یہ کہدیں کہ ایک خاص پٹھے کا نام بائی سیپس ہے
یا ایک خاص عمل کو اسٹائلائیڈ کہتے ہیں یا وہ جسم ملفیٹک گلینڈ کے
نام سے موسوم ہے اور اس کو ان الفاظ کا اشتقاق سمجھنے کی
زحمت دئیے بغیر یہ بتلا دیں کہ فلاں نام صرف فلاں شئے کے لئے
استعمال ہوتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا تو ہم
دیکھیں گے کہ وہ طالب علم اس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرتا
اور یاد رکھتا ہے اور کسی دوسری چیز کے نام سے خلط ملط نہیں کرتا۔

ہمیں نفسیات کا کوئی ایسا قانون معلوم نہیں جس سے ثابت
ہو کہ جامد اسماء اور بے معنی مصطلحات معنی خیز اصطلاحوں یا ان
الفاظ کے مقابلہ میں آسانی سے یاد رکھے جا سکتے ہیں جن کے مفہوم
سے متعلم آگاہ ہو اور جنھیں وہ سلسلۂ خیالات کی کسی زنجیر میں منسلک
کرکے اپنے حافظہ کے اندر محفوظ رکھتا ہو۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ

کس مسلمہ اصول کی بنا پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ ایک مشرقی متعلم کے لئے جو بواسطۂ زبان اُردو طبعیات اور طب کا اکتساب کر رہا ہو ہندوستانی الفاظ ذات الراسین یا دوسرا اور بادکش کی نسبت بائی سپس اور ایرپپ کا یاد رکھنا زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ اگر بہ کثرت اختیار کئے جائیں تو اُن پر حافظہ کو اتنی ہی محنت کرنی پڑے گی جتنی اُس زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر معمولی طور پر کام کرنے کے باعث یہ قوت ضرورت سے زیادہ نشو و نما پائے گی جس سے دوسری ذہنی قوتوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کسی علم کی تحصیل میں اس کی اصطلاحات کا سمجھ کر مطالعہ کرنے سے جو دماغی تربیت ہوتی ہے اسے ہم ہرگز حقیر نہیں قرار دے سکتے۔ حیوانیات نباتیات اور کیمیا میں اصطلاحات کا سمجھ کر مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اگر کوئی متعلم اصطلاحات کے اس طویل سلسلہ کو جو ان علوم میں آتا ہے مختلف اشیا کے نام تصور کرنے کے سوا اور کچھ نہ سمجھے اور ان کے اشتقاقی مفہوم و مطالب سے آگاہ نہ ہو تو ہمیں خوف ہے کہ ان بے شمار الفاظ کو رٹ لینے کے بعد بھی وہ ویسا ہی کورا رہے گا

جیساکہ پہلے تھا۔ اگر کسی ہندوستانی کو نباتات اور حیوانات کی قسمیں یا کیمیائی مرکبات کے نام ترجمہ کرنے کے بغیر بجنسہ بتادئے جائیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اِن پر پورا عبور کیوں کر حاصل کرسکتا ہے ۔ ہماری ناقص رائے میں تو یہ بدرجہا بہتر ہے کہ وہ غیر زبان کے مسخ شدہ بھونڈے الفاظ کی تاریک بھول بھلیّوں میں ٹامک ٹوئی مارنے اور مزید "روشنی" کے لئے تک و دو کرنیکے بجائے مغربی علوم پڑھنے سے پہلے تھوڑی سی ابتدائی انگریزی بطور تمہید سیکھ لے ۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ عملی پہلو سے یہ طریقہ ایک حد تک کامیاب ہو سکتا ہے تو پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ لوگ جو اس طریقہ سے علم حاصل کریں گے اُسے دوسروں تک نہیں پہنچا سکیں گے اور اس لحاظ سے اِن کی حالت بیچارے گرایجو ایٹوں سے کچھ بہتر نہیں ہوگی جن کی نسبت یہ بات ایک ضرب المثل ہوگئی ہے کہ وہ غیر ملکوں کے علوم اپنے ہم وطنوں کو سکھانے کی قابلیت نہیں رکھتے ۔

تاہم اُس مشکل کو رفع کرنے کے لئے جس کا صاحب موصوف نے اپنی رائے میں ذکر کیا ہے اور جس کی تنقید کی ہم نے جرأت کی ہے ہم اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ علمی کتب کے ترجموں میں

ہر اصطلاح کا مغربی مترادف ہمیشہ انگریزی اور دیسی زبان کے
حروف میں حاشیہ پر درج ہونا چاہئے۔ اور اگر کوئی طالب علم
دونوں قسم کی اصطلاحیں یاد کر سکے تو ہمیں اس پر کچھ اعتراض
نہ ہوگا۔ خود ڈاکٹر منیر خاں بھی اس تجویز کے پر جوش حامی ہیں۔
صرف فرق اتنا ہے کہ وہ دونوں قسم کی اصطلاحات کی جگہ بدلکر جدید وضع
کردہ الفاظ کو متن کے ساتھ بطور حواشی درج کرنا چاہتے ہیں۔
اب ہم دوسرے لوگوں کے کام پر جو اسوقت تک ہو چکا ہے
ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں یہ بات فراموش
نہیں کرنی چاہئے کہ ترجمہ میں افضلیت کے پہلے حقدار عربی کے
عالم متبحر ڈاکٹر تاشلر ہیں جنھوں نے ڈاکٹر ہوپر کی کتاب "اناٹومسٹس
وڈیمی میکم" کا عربی ترجمہ کرکے اپنے علم و فضل اور حیرت انگیز استقلال
کی ایک یادگار قایم کردی ہے۔ اس کتاب نے صحت عبارت
اور عربی کے قدیم ادب سے پوری مطابقت رکھنے کے باعث جو
اس کا امتیاز خصوصی ہے مسلمانوں میں خاص طور پر مقبولیت
حاصل کی ہے۔ اور اس سے ہمارے طبیبوں کو اتنا حقیقی فائدہ
پہنچا ہے کہ کسی اور ترجمہ سے نہ پہنچا ہوگا۔ اب تو یہ قریب قریب
ایک درسی کتاب بن گئی ہے اور کمال شوق سے پڑھی جاتی ہے

ڈاکٹر ٹاسٹلر کی "جاں کاہی و عرق ریزی" کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تمیز خاں نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ :-

"اس عالم متبحر نے مشرقی طلبہ کو عربی زبان کے ذریعہ سے مغربی طب کی تعلیم دینے کے لئے نہ صرف ہوپر کی پوری کتاب "اناٹومکس وٹیڈی میکم" کا "انیس المشرحین" کے کسی قدر شاعرانہ نام سے پاکیزہ عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ بلکہ اس زمانہ کے طبّی ادب کا محنت اور اور استقلال سے مطالعہ کرنے کے بعد جس کا ہم بے حد احترام کرتے ہیں علمی اصطلاحات کی ایک لغت بھی اس کے ساتھ ضم کی ہے۔ اس لغت کا حجم ڈیڑھ سو صفحہ ہے۔ اور ہر صفحہ پر اکیس اصطلاحیں درج ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ٹاسٹلر نے تشریح الابدان عضویات علم تشخیص طب جراحی وغیرہ کی بائیس سو سے زیادہ اصطلاحات جمع کی ہیں اور ان کے ساتھ ان کے عربی مترادف دیئے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ان اصطلاحوں کا بیشتر حصہ ڈاکٹر ٹاسٹلر نے بظاہر اپنی ذاتی کوشش سے وضع کیا ہے۔" آگے چلکر ڈاکٹر تمیز خاں لکھتے ہیں کہ :-

"اگر میں اصطلاحات کے اس ترجمہ کو موزوں اور عمدگی سے انتخاب کیا ہوا نہ کہوں تو امید ہے کہ مجھ پر حد سے زیادہ نکتہ چینی کا الزام نہ لگایا جائے گا۔"

ہم مدح سرائی سے بھی متفق ہیں اور نکتہ چینی سے بھی۔ ڈاکٹر ٹائلر کی محنت کا استخفاف ناممکن ہے اور نہ السنہ مشرقیہ کے متعلق ان کی خدمات کو سوائے قابل احترام و امتنان کے کسی اور نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہیں گے کہ ان کے تمام وضع کردہ الفاظ پر صاد کرنا مشکل ہے۔ بعض بعض حالتوں میں ان کا انتخاب اچھا نہیں رہا۔ مثلاً ہیڈروجن کے لئے ایک طویل عربی کلمہ مقرر کیا ہے۔ جس کے معنی "پانی پیدا کرنے والی ہوا" ہیں۔ نیٹروجن کے لئے انھوں نے "شورہ پیدا کرنے والی ہوا" اور آکسیجن کے لئے "تیزاب پیدا کرنے والی" کے مترادف الفاظ وضع کئے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے عناصر کے نام یا تو حتی الامکان مختصر یا مفرد ہونے چاہئیں اور یا انہیں ویسا ہی رکھنا چاہئے۔ ان الفاظ کا تو ذکر ہی کیا جو علم کیمیا کے متعلق ہمارے جدید ترقی یافتہ معلومات کی رو سے غلط ثابت ہوئے ہیں، اسی طرح ڈاکٹر ٹائلر کی کئی منتخبہ اصطلاحات ہیں جو تشریح الابدان اور عضویات سے تعلق رکھتی ہیں کافی اصلاح کی گنجائش ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ڈاکٹر ٹائلر کی محنت آئندہ مترجمین کے لئے بے حد مفید ہوگی اور انہیں اس سے بہت مدد ملے گی۔ ڈاکٹر ٹائلر کی

تصنیف اِن کے لئے لفظی ذخائر کا ایک وسیع خزانہ ہوگی۔ جسے
ہوشیاری سے استعمال کرکے عمدہ نتائج پیدا کرسکیں گے۔
پٹنہ کے ترجموں کے نمونے اس سے بالکل متضاد ہیں۔
ڈاکٹر ٹائٹلر نے تو یہ غلطی کی ہے کہ بڑے بڑے اور مغلق الفاظ
استعمال کئے ہیں جن کا تلفظ نہایت مشکل اور یاد رکھنا اور بھی مشکل ہے
لیکن رائے سوہن لال نے اپنے لغو اور سوقیانہ الفاظ سے ہمیں
متحیر کر دیا ہے۔ اور اگر اپنا اہم مقصد ظاہر کرنے کے لئے وہ
ان کے ساتھ ایک تمہید کا اضافہ نہ کرتے تو ہم یہی سمجھتے کہ ان
تمسخر آمیز الفاظ سے اہل ہندوستان کو مادری زبان میں سائنس
کی تعلیم دینے کے خیال کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ ہم رائے سوہن لال
کی علمی واقفیت اور قابلیت کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتے
ہیں اور ہمیں ان کی متانت پر پورا بھروسہ ہے۔ ہمارے خیال
میں اُردو کے ادیب کی حیثیت سے انھوں نے اپنے لئے ایک
ایسی ڈگر قائم کرلی ہے جس کے یقیناً بہت سے پیرو ہوں گے
ان کی تحریر کے چند نمونوں سے جو ہماری نظر سے گزرے ہیں یہ
ظاہر ہے کہ اردو نثر لکھنے میں وہ پورے قادر الکلام ہیں۔ باایں ہمہ
یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کی ادبی ندرت نوازیاں ہرگز روا انہیں

رکھی جا سکتیں۔ اور ان کے اوچھے طریقہ کے بھی بہت کم حمایتی نکلیں گے۔ ہم خود اس بات کے بہت بڑے موئد ہیں کہ اردو عبارت میں ہندی عنصر غالب رہنا چاہئے کیونکہ طرز تحریر میں وضاحت، زور، لچک پیدا کرنے کا یہ ایک یقینی ذریعہ ہے۔ اور لکھنوی انشا پردازوں کی ایجاد کردہ ثقیل اردو کو جس میں عربیت اور فارسیت زیادہ ہونا پسند کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ رائے صاحب کی دہقانیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ اور ایسی زبان کے رواج کی مخالفت کریں جو دیہات کے گنواروں ہی کو زیب دیتی ہے۔ اور جسے ہند و مسلمان دونوں مہذب گفتگو میں کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ڈاکٹر فاسٹلر کی پوری لغت میں اتنی خامیاں نہ ہوں گی جتنی غلطیاں اور لغویتیں رائے صاحب کی مختصر سی فہرست اصطلاحات میں ہیں تاہم ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ بعض الفاظ کا انھوں نے نہایت مناسب و موزوں ترجمہ کیا ہے لیکن اس بات پر حیرت بھی ہے کہ حسب ذیل الفاظ کا اس قدر غلط، ناموزوں، سوقیانہ، عامیانہ اور علمی ضرورت کے لحاظ سے محض بیکار ترجمہ کرنے کی انھوں نے کیوں کر جسارت کی؟

Besultant	پھل
System of forces in equilibrium.	ملے تلے ہوئے زور
Plane	کھیت
Exact Soience.	جانے ہوئے بدیا
Experimental Science.	جنچے ہوئے بدیا
Elementary body.	نرالی چیز
Definition.	پہچان
Axiom.	جانی ہوئی بات
Circumfernce.	گھیر چکر
Rightangle.	کھڑا کونا
Relation.	لاگ لگاؤ
Acute angle.	سکڑا کونا
Equilateral.	برابر بازو تخط

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اصطلاحیں ہیں جو اپنی لغویت پر خود شاہد ہیں۔ ہمیں تو مطلق امید نہیں کہ ان الفاظ کو رائے سوہن لال جی کے ذاتی حلقۂ اثر سے باہر بھی کوئی شخص سمجھ سکے گا۔ رائے صاحب نے جو اصطلاحات بطور نمونہ منتخب کی ہیں انھوں نے ان کے سنسکرت

وعربی مترادفات بھی دو خانوں میں درج کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اور ہمیں وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کے الفاظ اُن اصطلاحوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ سنسکرت کی اصطلاحات کے متعلق تو ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے گو ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ عام طور پر صحیح ہیں لیکن عربی الفاظ کے ترجمہ میں رائے صاحب چنداں کامیاب نہیں ہوئے۔ ان میں سے بعض الفاظ کی عربی ناقص ہے اور ان کے بجائے عربی یا فارسی کی زیادہ موزوں اصطلاحیں بہ آسانی مقرر کی جا سکتی ہیں۔

رائے سوہن لال کی عربی سے ہمیں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ مثلث کا ترجمہ "تین بنا ہوا" اور فن مثلثات کی اصطلاح "جیب" کا ترجمہ جیب کر کے ان الفاظ کا مضحکہ اڑانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے کچھ تعرض نہیں۔ لیکن علمی اصطلاحوں کے اس دوغلے ترجمہ پر جو انھوں نے کیا ہے ہم خاموش نہیں رہ سکتے ان کے الفاظ "دوڑتا بجلی بل" (Voltaic Electricity) اور "رگڑ بجلی بل" (Friction Electricity) کے قائم مقام کبھی نہیں ہو سکتے۔ سائنس کو عام فہم کر دینا اور بات ہے اور اس کے ادب کو بالکل عامیانہ اور لغو بنا دینا بالکل دوسری چیز ہے۔ ہمارے خیال میں اردو ہندی ڈا

لوگ سنسکرت و عربی کے ان الفاظ کو جو رائے صاحب نے
رد کر دیئے ہیں ان کے بھونڈے ترجمہ کی بہ نسبت زیادہ آسانی
سے سمجھ سکیں گے۔ اور صحت کا مقصد بھی الفاظ سے بہ احسن الوجوہ
پورا ہوگا۔ تاہم بہ تقاضائے انصاف یہ ماننا پڑے گا کہ رائے
سوہن لال اصطلاحات وضع کرنے میں بعض دفعہ نہایت جدت
ظاہر کرتے ہیں اور ان کے علمی مضامین لکھنے کا طرز گو تصنع سے
خالی نہیں اور بہت کچھ اصلاح کا بھی محتاج ہے لیکن اس نہج پر
آج تک اردو زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ان کی تحریر
اوسطاً بڑھی ہوئی ہے۔

ایک اور مترجم جن کا نام عزت اور توقیر کے ساتھ لیا جا سکتا ہے
لکھنؤ کی رصدگاہ کے معمر کارکن مولوی کمال الدین ہیں۔ انھوں نے
رصدگاہ کے منتظم کرنل ولکاک کی نگرانی میں تقریباً پندرہ کتابوں کا
ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے بارہ کے نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) قوائے آبیہ۔ یہ کتاب ایک رسالہ سے ماخوذ ہے۔ جو گنجینۂ
معارفِ مفیدہ نے شائع کیا تھا۔

(۲) ہیئت۔

(۳) علمِ تحریکات آبی۔

(۴) علم الہوا۔

(۵) علم المناظر۔

(۶) حرارت

(۷) علوم طبعیات سے اشعہ و سمام کی بحث۔

(۸) آلات ریاضی کا رسالہ۔

(۹) قوت مقناطیسی کا رسالہ۔

(۱۰) کیمیا کا رسالہ۔

(۱۱) ہیئت مولفہ برنکلے۔

(۱۲) رسالۂ قوت فارالمرکز۔

ان کے باقی تراجم سائنس سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر ہم غلطی پر نہیں تو یہ سب کتابیں حیدرآبادی متحدہ کی مقامی حکومت کے حوالے کردی گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ ایک سابق ناظم سررشتۂ تعلیمات کے پاس بغرض اظہار رائے بھیجی گئیں۔ چوں کہ یہ ترجمے تیس سال قبل کئے گئے تھے اس لئے سائنس کے مسائل جو ان میں درج ہیں موجودہ زمانہ کے لحاظ سے بہت پیچھے ہیں اگر ہم غلطی پر نہیں ہیں تو ناظم سررشتۂ تعلیمات نے اس وجہ سے اور نیز اس خیال سے کہ ان کتابوں میں علمی مسائل نہایت اختصار

لکھے گئے ہیں جو دوسری کتب کی عدم موجودگی میں طلبہ کے لئے
مشکل اور بے لطف ثابت ہوں گے ان کی دوبارہ اشاعت
کی سفارش نہیں کی تھی - اس کے ساتھ ہی ناظمِ مذکور نے یہ
رائے دی تھی کہ ان تراجم سے سائنس کی موجودہ حالت کے
مطابق جدید کتابیں تیار کرنے میں بہت مدد ملے گی - ہم ان کی
قدر و قیمت کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتے کیونکہ ان میں سے
اہم ترین رسائل ہماری نظر سے نہیں گزرے لیکن برنکلے کی ہیئت
کا ترجمہ جو مولوی صاحب نے کیا ہے ہم نے دیکھا ہے - ہماری
رائے میں یہ کتاب کسی قدر ترمیم کے بعد مشرقی متعلمین کے لئے
بہت کارآمد بن سکتی ہے اور آئندہ اس سے مترجین کو ہیئت
کی انگریزی اصطلاحات کے عربی مترادفات تلاش کرنے میں
بے حد مدد مل سکتی ہے اس کے طرزِ تحریر میں وہ سب خامیاں
پائی جاتی ہیں جو اچھے ترجمہ میں ہرگز نہ ہونی چاہئیں - یہاں
اس بات کا بیان کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ سن رسیدہ مولوی
صاحب کو ان کی ادبی محنت اور شاہان اودھ کے ماتحت
طویل خدمات سرانجام دینے کے صلے میں گورنمنٹ نے
ایک معقول وظیفہ عطا کیا ہے -

ریاضی کے ان رسائل پر بھی جو پروفیسر رامچندر نے لکھے ہیں یہی قول صادق آتا ہے ۔ انھوں نے بوشر لاٹ کی کتاب "اصول حساب الجزئیات والکلیات" کا ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۴۵ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا ۔ اب یہ کتاب نایاب ہے اور چونکہ اس قسم کی تالیفات میں دیسی متعلمین بہت کم دلچسپی لیتے ہیں اس لئے اُمید نہیں کہ اس کے دوبارہ چھپنے کی جلد نوبت آئے ۔

اب ہم ترجمہ کے متعلق چند باتیں بیان کرکے یہ تحریر ختم کرتے ہیں ۔ اب تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے (یا کیا جاتا تھا) کہ غیر زبان کا ترجمہ کرنے میں اس زبان کے الفاظ کے بجائے اپنی زبان کے الفاظ کا لکھدینا اور اُسے عوام میں پیش کردینا ہی کافی ہے ۔ جیسے کہ انگریزی عبارت کی انگریزی میں لفظ بہ لفظ تشریح کی جاتی ہے ۔ جس میں انٹرنس کے نصاب کی شرحیں لکھنے والے اور فرہنگ فروش ید طولیٰ رکھتے ہیں ۔ اس بات کی مطلق پروا نہیں کی جاتی تھی کہ الفاظ سے مطلب واضح ہوتا ہے یا خبط ۔ اُردو زبان میں ایک کتاب شائع کردینے کے بعد مترجم یہ سمجھ لیتا تھا کہ اس کا مقصد پورا ہوگیا اور اس سے

بڑھ کر وہ اور کچھ نہیں کرسکتا۔ اس بات کا اسے کبھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اپنی کتاب کا مطلب سمجھانے کے لئے اسے خود اس کے ہر نسخہ کے ساتھ ساتھ اِن تمام ناظرین کے پاس جانا چاہئے جو اِس کی زبان سے ناآشنا ہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچتا تھا کہ اِس کی کتاب دیوتاؤں اور دیبیوں کی ان تصویروں کے مانند ہے جو ہرزہ گرد برہمن گلی کوچوں میں مذہبی خیال کے تماشا بینوں کو دکھاتے پھرتے ہیں اور ورق اُلٹتے ہوئے ان دیوتاؤں اور دیبیوں کے کارناموں کے گن گاتے ہیں۔ رائے سوہن لال کے ترجموں کے متعلق پٹنہ کے ڈاکٹر فالن اپنی تنقید کے ابتدائی حصّہ میں کیا خوب لکھتے ہیں:-

سائنس کی کتابیں ابھی دیسی زبانوں میں بالکل مفقود ہیں اِس کی کل کائنات فی الحال ابتدائی ہندسہ جبر و مقابلہ اور کسی قدر فلسفۂ طبعی ہے۔ طبعیات علم المدن اور خالص ومخلوط ریاضی کے اعلیٰ شعبوں میں تو میدان بالکل خالی پڑا ہے وہ چند تالیفات جو اس وقت تک ہو چکی ہیں اِن کا بھی یہ حال ہے کہ اِن میں ایسی دس کتابوں کے نام بھی مشکل سے گنائے جاسکتے ہیں جو واقعی قابل قدر ہوں۔ مغربی علوم کا ترجمہ

دیسیوں کے سامنے زیادہ ترجس زبان میں پیش کیا گیا ہے وہ ناتکمل، بے لطف، ترتیب و وضاحت کے لحاظ سے ناقص، اور اکثر اوقات خلاف محاورہ و بعید الفہم ہے۔ یہ کتابیں بالعموم کم علم اصحاب اور ناتربیت یافتہ دماغ والوں نے لکھی ہیں۔ جو اپنے مضمون کے محض سطحی علم کی وجہ سے اور زبان پر پوری قدرت نہ رکھنے کے باعث اسی بات میں سہولت دیکھتے ہیں کہ اصلی عبارت کا مبہم اور لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیں۔

تاہم یہ ایک فال نیک ہے کہ لوگ اب ترجمہ کے صحیح مقصد سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں وہ اچھے ترجمہ کی زیادہ قدر کرنے لگے ہیں۔ اور اس کی خوبیوں سے بھی بہ نسبت سابق زیادہ واقف ہوتے جاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر فالن مترجم کا کام کچھ آسان نہیں ہے۔ سائنس کی ایک ابتدائی کتاب لکھنے کے لئے بھی اس مضمون پر پورے عبور کی ضرورت ہے تاکہ ابتدائی مسائل کو انتہائی مسائل کے مطابق واضح کیا جا سکے۔ اس عبور کے ساتھ قوت متخیلہ، اور دوسرے لوگوں کے سامنے حقایق معلومہ کو وضاحت و ربط کے ساتھ بیان کرنے کی قابلیت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ یہ امر کس قدر تکلیف دہ ہے کہ مدرسین و طلبہ اپنی

زندگی کا بیشتر حصہ محض الفاظ پر ضائع کرتے ہیں۔ جب تک
دیسی زبانوں میں مفید کتابیں اور ملک میں ایسے معلمین
نہ ہوں گے جو اس کمی کو پورا کرنے کی قابلیت و آرزو رکھتے ہوں،
مظاہر فطرت دیسی طلبہ کے لئے بے معنی و بے لطف رہیں گے۔
قوتِ ذہنی اور جذبات کے اس طرح رائگاں جانے پر اُن
ہمدرد اصحاب کو بہت متفکر ہونا چاہیے جنھیں ذہنی تربیت
کی قدر و قیمت اور لذّت کا تجربہ ہے ؛

اصولِ وضعِ مصطلحاتِ علمیّہ

(۱) اگرچہ لامشاحۃ فی الاصطلاح ہر قوم و ہر زبان میں مسلم ہے مگر مُسلّمِ اُصولِ وضعِ مصطلحات کا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حافظہ پر بار کم ڈالا جائے اس لئے ایسے مصطلحات وضع کرنا جن میں لفظاً موضوع لہٗ سے کوئی مناسبت نہیں ہے بالکل نامناسب ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اُس سے احتراز کرنا چاہئے۔

(۲) زبان عربی میں جتنے مصطلحات قدیم زمانہ سے موجود ہیں اُن کو ہرگز ترک نہ کیا جائے اُن کے عوض جدید مصطلحات وضع کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً ہیئت، ہندسہ اور اُس کے فروع حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، مخروطات وغیرہ یا طب، تشریح، منطق وغیرہ میں ہمارے اساتذۂ فنون نے جو مصطلحات قدیم زمانہ میں وضع یا دوسری کسی زبان سے اخذ کئے ہیں وہ بجالہا قایم رہیں ان کے عوض جدید مصطلحات تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجائے۔ ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائے گا کہ بعض

فنون کے متعدد عربی مصطلحات آج یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں پھر ہم کیوں اپنے مصطلحات کو ترک کر دیں؟

(۳) جو لغات غیر زبانوں سے لیکر قدیم زمانہ میں معرب کر لئے گئے ہیں یا جو دخیل ہیں وہ اپنے حال پر قایم رہیں اصل کی طرف رجوع کرنا ضرور نہیں۔

(۴) جدید مصطلحات اُردو زبان کے لئے وضع کرنے میں جہاں تک ممکن ہو اُمور ذیل ملحوظ رہیں۔ حتی الامکان ہندی فارسی، عربی، انگریزی کے انہیں لغات سے مدد لی جائے جو ہماری زبان اُردو میں مروج ہیں۔ غیر مانوس جدید لغات سے احتراز کیا جائے۔

(۵) ثقل تلفظ، رکاکت، ترکیب مغلق و غیر مانوس، توالی اضافات وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ شلاً ہٹا کٹا، چھپر کھٹ، کندھک، کھٹائی، کھونٹی۔ ثقیل اور رکیک الفاظ ہیں۔ اِن کے مترادف الفاظ تندرست و توانا، پلنگ چارپائی، کبریت، گوگرد، ترشی، حوضہ، میخ ہماری زبان میں موجود ہیں۔

(۶) امالہ ترخیم، فک اضافۃ، اور دوسرے تصرفات سے بوقت ضرورت بے تامل کام لیا جائے۔

(۷) اسم سے فعل بنا لینا ایک قسم کا تصرف ہے جسکی بڑی ضرورت ہی اسکو جائز رکھنا چاہئے
(۸) عربی اور ٹھیٹھ ہندی لفظوں کی ترکیب سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہئے
(۹) جہاں دو یا تین یا زیادہ الفاظ کو ملا کر ایک مرکب لفظ بنانا منظور ہو

جس طرح فن کیمیا میں اکثر ضرورت پڑے گی تو اس قدر تصرف جائز رکھا جائے کہ ہر لفظ مفرد میں سے دو ایک حرف حذف کر کے مرکب اصطلاح میں اختصار پیدا کر دیا جائے ۔

(۱۰) فن کیمیا میں سکڑوں نام بسیط اور مرکب مادوں کے مستعمل ہونگے جن کیواسطے علامات کا مقرر ہونا ضرور ہے ۔ یوروپین زبانوں کی کتابت میں حروف علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں ۔ اس لئے یوروپین لوگوں کو اس میں کوئی دقت نہیں پیش آتی ۔ اب سوال یہ ہے کہ اردو میں مرکب مادوں کے ناموں میں حروف الگ الگ لکھے جائیں یا ملا کر مثلاً کبکج اور ک ب ک ج پر غور کیجئے ۔ حروف کے الگ الگ لکھنے میں آسانی یہ ہے کہ ان کی مقدار کے اظہار کیلئے ہندسے لگا دیئے جا سکتے ہیں ملا کر لکھے جائیں تو ہندسے لگانا مشکل ہو جائے گا ۔ گو حروف کے علیحدہ علیحدہ لکھے جانے میں طوالت بیشک ہے ؛

۲۰×۲۶ تقطیع کے سفید اور دبیز چکنے کاغذ پر سوا چار سو صفحے کی کتاب مع تصویر مصنف ممدوح۔ جو علامۂ ممدوح کے قابل قدر، نایاب، اور عالمانہ مضامین کا مجموعہ ہے صرف پانچ سو کی تعداد میں شائع ہوئی ہے۔ اہل علم حضرات جلد توجہ فرمائیں ورنہ طبع دوم کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت فی جلد (للعہ) کلدار مع محصول۔

ملنے کا پتہ

الیاس قریشی۔ وکیل ہائیکورٹ۔ فضل گنج۔ حیدرآباد دکن